

پشتونوں کی تاریخ



ترجمہ
پروفیسر انور رومان

پشتونوں کی تاریخ

Pathan Borderland
by
James W. Spain

ترجمہ:
پروفیسر انور رومان

گوشہ ادب

جناح روڈ۔ کوئٹہ (پاکستان)

فون: 92-081-843229 فیکس: 92-081-837672

E-mail- goshaeadab@yahoo.com

goshaeadab@hotmail.com

اس کتاب سے کسی بھی مواد کی اشاعت کیلئے
پبلشر کی اجازت ضروری ہے۔

یہ کتاب گوشہ ادب سے شائع کی گئی۔

قیمت. 495 روپے

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحات
۱	انتساب	۱۱
۲	دیباچہ مصنف	۱۳
۳	پیش لفظ (مترجم)	۱۹
۴	تعارف	۳۳
۵	باب اول - سرزمین	۴۱
	جغرافیہ :- ہزارہ ، سندھ پارکے اضلاع ، سرحدی پہاڑیاں ، حمل و نقل اور رسل و رسائل ، خیبر ، کرم ، گول ، ٹوچی ، سرحد بحیثیت ایک رکاوٹ خلاصہ تاریخ :- یونانی ، محمود غزنوی ، محمد غوری تیمور ، بابر ، شیر شاہ سُوری ، مغل ، عظیم بغاوت ، اورنگزیب کی قبائلی پالیسی ، نادر شاہ ، احمد شاہ ، محمد زنی سروج ، سکھ	۵۳

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
۷	باب دوم - لوگ، تعارف، پٹھانوں کا ماحذ، قبائلی تنظیم، یوسف زئی، باجوڑی، ہمند، آفریدی، شنواری، اورکزئی، زمیشت، تورئی، بنگش، وزیر، محسود، بھٹانی، دور، زیر انتظام قبائل، بنوچی، خٹک، پوندے، سادات اور میاں، پشاور، دیگر لوگ۔	۷
۱۳۶	باب سوم - سماجی تنظیم، تعارف، پختون ولی، بدل، میلمستیا، نواتی، پختون ولی کی قدر و قیمت، جرگہ، رواج اور شرعیات، افراد اور معاشرہ، ملک، ملا، لشکر، حجرہ، ماتحت طبقے، عورت کا مقام اور کردار، زمینی ملکیت، ویش	۷
۱۷۱	باب چہارم - ثقافت اور تصور حیات، مذہب، روشنی، سید احمد بریلوی، زبان و ادب، خوش حال خان، خٹک،	۸

نمبر شمار	عنوان	صفحات
	بعد کے خٹک، رحمان بابا، عبد الحمید، مرزا خان انصاری، خواجہ محمد ننگش، احمد شاہ ابدالی، پشتو لوک ادب، قومیت۔	
۹	باب پنجم۔ انگریزوں کی آمد، تعارف، سرحد پار قبائل سے تعلقات، سپاہیوں کی بغاوت، بندوبست اراضی، ارتقا پذیر نظم و نسق، کلوز بارڈر سسٹم، فارورڈ پالیسی، فارورڈ پالیسی عشرہ آخری میں، نیا نظام،	۲۰۴
۱۰	باب ششم۔ ”عظیم مقابلہ“ تعارف، ہرات کے لئے کشمکش، پہلی جنگ افغان، جنگ کی اہمیت، دوسری جنگ افغان، پنجاب، سرحد پامیر۔	۲۴۹
۱۱	باب ہفتم۔ بیسویں صدی میں برطانوی نظم و نسق، کرزن کا نیا نظام، نیا صوبہ فرنٹیر کرائمز ریگولیشنز، آبادی اور مالیات، قبائلی پالیسی، تیسری جنگ افغان،	۲۸۸

نمبر شمار	عنوان	صفحات
	نئی تحفظاتی افواج، رزمک پالیسی، سوات کا استحکام، ابلیس کیس، چوتھے عشرے کی قبائلی پالیسی، امدادی وظائف کا نظام، برطانوی دور کے آخری ایام۔	
۱۲	باب ہشتم۔ سرحد ہندوستان کے ایک حصہ کی حیثیت سے، تعارف، ہندوستان کا سیاسی اثر، عبدالغفار خان اور خدائی خدمت گار، ۳۱ - ۱۹۳۰ء کی ایچی ٹیشن۔ اصلاحات۔	۳۲۶
۱۳	باب نہم۔ قبائلی بغاوت، تعارف، برطانوی دور کے ابتدائی سالوں میں بغاوت، فارورڈ پالیسی کے خلاف بغاوت، ۱۸۹۷ء کی بغاوت، ۱۸۹۷ء کی بغاوت کے محرکات، زکاجیل، وزیرستان ۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۰ء، وزیرستان ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۸ء، امن وامان کا مسئلہ، بغاوت کی بنیاد،	۳۵۰

نمبر شمار	عنوان	صفحات
۱۴	باب دہم - بٹوارہ ، تعارف ، فیصلے کے ایام ، آزادی اور بٹوارہ ، قبائلی علاقہ ، ریاستیں ، جہاد کشمیر -	۳۹۱
۱۵	باب یازدہم - پاکستان - مسائل اور ترقی ، تعارف ، ۱۹۵۱ء کے انتخابات ، قیوم اور مثالی صوبہ ، اقتصادی ترقی ، زراعت ، آبپاشی ، صنعت ، تعلیم ، میڈیسن اور صحت عامہ ، قبائلی علاقہ پاکستان کے تحت ، امن و امان ، علاقائی انضمام ، سوات - ایک بے نظیر ریاست ، سرحد پاکستان کے ایک حصہ کی حیثیت سے ، مستقبل	۴۴۷
۱۶	باب دوازدہم - سرحد میں افغان دلچسپی ، افغانستان بے انفکاک ، طاقت کے مراکز ، امان اللہ کا اخراج ، پنجتوستان	۴۶۱
۱۷	باب سیزدہم - ”عظیم مقابلہ“ جاری ہے -	۴۹۵

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
۵۵۵	تعارف، ٹرانس کاکیشیا میں داخلہ، کاشغری میں برطانوی سرگرمی، سوویت سرگرمی، تاشقند سکول، سوویت افغان تعاون، جمال اور انور، ہندوستان میں ردِ عمل، سفارتی لڑائی، دوسری جنگ عالمگیر اور مابعد، پاکستان میں تغیرات، افغانستان میں تغیرات، ہندوستان کا کردار، روس کا کردار، امریکہ کا کردار، سرحد پر اثرات،	۱۸
	کتب بانی نوٹ	

انتساب

مصنف نے اپنی کتاب کا انتساب اپنے والدین کے نام کیا تھا۔

میں اس کاوش کو پیرسید علی حیدر شاہ مدظلہ العالی، میاں ڈھیری (صوابی) کے نام منسوب کرتا ہوں۔ پیر صاحب اسلامی زہد و اتقا، ایثار، انسان دوستی اور خدمتِ خلق کے ایک بہترین نمونہ تھے۔ میں جب بھی ان کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا مالا مال اور تروتازہ ہو کر آیا۔ وہ سارا دن مسجد اور گھر کا چکر لگاتے رہتے مسجد میں مردوں کے ہجوم اور گھر میں بچوں اور عورتوں کے انبوہ! قریب قریب اور دُور دُور کے دیہات کے مرد، عورتیں اور بچے۔ سیدھے سادھے اور پیوند پوش، دکھی، بیمار، لڑکھڑاتے ہوئے بالبوس، ڈگمگاتے ہوئے! پیر صاحب اپنے حوصلہ آفریں لفظوں، شفا آور لہجوں، مجرب دواؤں، اپنی محبت بھری لمس اور اپنی دلی دعاؤں سے ان سینکڑوں انسانوں کو ہر روز ایمان کی روشنی اور امید کی تابانی سے ایسے اُجال دیتے کہ وہ جہدِ لبثقا کے لئے نئے سرے سے مسلح ہو جاتے! ایک گرتے ہوئے انسان کو تھام

لینا، ایک ڈوبتے ہوئے انسان کو بچا لینا، ایک بجھتے ہوئے انسان
میں جوت جگا دینا، ایک رُوکھے ہوئے انسان کو منالینا، ایک
کھوئے انسان کو تلاش کر لینا، یہی وہ مقام ہے جو عالمگیر مذہب
جمیل و جلیل فن اور غیر فانی روحانیت کی ابدی و آفاقی اقدار کا
سنگم ہے اور پیر صاحب موصوف سہی مقام پر فائز تھے! سہ
میں شب کے مسافروں کی خاطر
مشعل نہ ملے تو گھر جلاؤں

انور رومان

دیباچہ مصنف

یہ مطالعہ بنیادی طور پر شمال مغربی سرحد اور اس میں رہنے والے پٹھانوں کے فارمین کی دلچسپی کے لئے معرض تحریر میں لایا گیا ہے خواہ وہ ہنگامی فارمین ہوں یا مستقل۔ لیکن یہ اس شخص کے لئے ناممکن ہے جو پٹھانوں اور ان کی سرزمین میں دلچسپی بھی رکھتا ہو اور بایں ہمہ وہ اس کردار سے لاتعلقی رہے جیسا کہ خود پٹھان ہیں۔ جو سرحدی سرزمین عالمی معاملات کے وسیع تر منظر پر ادا کرتی ہے۔ کلنگ کے دنوں کا "عظیم مقابلہ" ہنوز ختم نہیں ہوا۔ اس میں اب بھی کئی کھلاڑیوں اور بے حد متنوع احاطوں کی گنجائش موجود ہے۔ جو کچھ بھی سرحد سے متعلق ہے اسے چھوڑنے اور چھپانے کے دوران میں نے مسلسل مقامی واقعات و تغیرات کو عالمی سیاق و سباق میں بیان کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ بین الاقوامی معاملات کے محض اُن پہلوؤں کے نقش و نگار اُبھارے ہیں جن کا سرحد اور اسی کے لوگوں پر کوئی نمایاں اثر ہوا ہے یا ہو رہا ہے۔

پھر بھی زیادہ تر مواد کو خلاصہ پیش کرنا پڑا اور بشریات،

عمرانیات اور نفسیات جیسے میدانوں میں بھی گامزن ہونا پڑا جن کا مجھے ذوق نصیب نہ تھا اور جس میں میری مہارت شاید محدود تھی۔ یہ بھی گذارش ہے کہ یہ کتاب پانچ سال سے زیادہ کے عرصہ میں حصّوں اور بحروں میں لکھی گئی اور پھر چار سال مزید اس کی تکمیل اور اشاعت کے درمیانی وقفہ پر صرف ہو گئے۔

شاید اس کتاب کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ یہ ایک امریکی نے لکھی ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے یہ سرحد کے متعلق واحد جامع کتاب ہے جو کسی امریکی کے قلم سے ضبطِ تحریر میں آئی ہے۔ مجھے اس خود ستائی کو یہ کہہ کر اعتدال پر لانے دیجئے کہ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ یہ ایک تیسرے فریق نے لکھی ہے جس کا اس مختلف النوع کشاکش سے کوئی مفاد وابستہ نہ تھا جو تاریخ سرحد کے خاصے بڑے حصّہ پر محیط ہے خواہ یہ روسی بمقابلہ انگریز کی ہو یا انگریز بمقابلہ پھان یا پاکستانی بمقابلہ افغان!

بے لاگ پن (پتہ نہیں یہ اس میں موجود ہے یا نہیں) سرحد کے متعلق ادب میں کیا ہے۔ ہر دم رواں انگریزوں نے اس ادب میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔ ان میں سے بہت سوں نے ہندوستان اور دنیا میں تہذیب و ترقی کے محافظین کی حیثیت سے کشش انگیز لیکن بربریت بدوش پھانوں اور ہمہ وقت بدشگون رویوں کے خلاف قلم اٹھایا ہے۔ لچھ انگریز وحشیانہ کشش سے مغلوب ہو

گئے ہیں اور انہوں نے کلکتہ، نئی دہلی اور لندن کی کوتاہ ذہن اور سردہر حکومت کے خلاف ”اپنے“ پٹھانوں کا دفاع کیا ہے لیکن یہ خود بھی سرحد کی مار دھاڑ میں ذاتی طور پر ملوث رہے ہیں۔ معدودے چند پٹھان جو دنیا کے سامنے اپنے لوگوں کا نفسِ ناطق بنے ہیں عموماً پرانی لڑائیوں میں نمبر بڑھاتے رہے ہیں یا نئی لڑائیاں بھڑکاتے رہے ہیں۔ ان میں سے کسی نے انگریزوں کے لئے کوئی اچھا لفظ استعمال نہیں کیا۔

میں نے ان صفحات میں جو کچھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے وہ سرحد میں ایک گہری دلچسپی کا نتیجہ ہے جو ایک عشرہ پہلے کراچی میں امریکی سفارتخانے میں تعیناتی کے دوران پیدا ہوئی اور جو اس وقت سے بعد کے دوروں کے ذریعے قائم رہی ہے۔ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۵ء کے دوران فورڈ فاؤنڈیشن کی ایک فیاضانہ گرانٹ نے لندن کی انڈیا آفس لائبریری نیرسپلک ریکارڈ آفس، برٹش میوزیم اور آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں میں میرے لئے تحقیق کو سہل بنا دیا۔ فورڈ گرانٹ نے ہی یہ موقع فراہم کیا کہ میں سرحدی علاقے میں کئی ماہ کا اضافی مطالعہ کر سکوں۔ ان میں سے بعض مہینے پٹھان گاؤں کے باشندے کے طور پر (لاہور اور پشاور میں سرکاری ریکارڈ کی ورق گردانی کر سکوں اور قبائلیوں اور پاکستانی سرکاری افسروں کے ساتھ وسیع تبادلہ خیال کر سکوں۔ چند ہفتے کا کابل کا دورہ بھی

کیا جاسکا۔ میدان تحقیق میں جمع کردہ مواد میں لائبریری آف کانگریس، نیویارک پبلک لائبریری اور کولمبیا یونیورسٹی لائبریری میں مزید مطالعات سے بیشی بہا اضافہ ہوا۔

اس کتاب کے لئے بیشتر کام فورڈ فاؤنڈیشن گرانٹ کی بدولت ہی ممکن ہوا لیکن فاؤنڈیشن مواد کی صحت کی ہرگز ذمہ دار نہیں اور نہ ہی میرے طریقہ پیشکش کی اور نہ ہی ان ارا کی جو میں نے قائم کی ہیں یا ان فیصلوں کی جو میں نے صادر کئے ہیں۔

میں سرحد کے ان متعدد ماہرین و اہل علم کا بھی شکر گزار ہوں جو میرے ساتھ بے حد متعاون و مہربان رہے۔ ان میں پاکستان و افغانستان کے بہت سے سیاسی رہنما، سرکاری افسر اور قبائلی شامل تھے جنہوں نے نہایت فراخ دلی سے مجھے اپنا وقت بھی دیا اور مخصوص علم بھی! ان میں سعد اللہ خان، عطاء اللہ خان خان مرحوم سی ایس پی اور پشاور کے ایڈووکیٹ جنرل، چودھری محمد علی جو سب کے سب مدتوں سرحد میں ملازمت کر چکے ہیں اور پاکستان کے دفتر خارجہ کے محمد اسلم خان خٹک خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ میں تخت بھائی کے عبدالستار خان اور جمشید خان کے لئے سراپا سپاس ہوں جن کا گھر میرے متعدد دوروں میں میرا ”دوسرا گھر“ بنا رہا۔ ان اصحاب نے ان سالوں میں سرحد میں میری دلچسپی کو تازیا نہ لگایا میری غلطیوں کو درست کیا اور تحقیق کے نئے گوشوں کی بھی نشاندہی

کی۔ اس وجہ سے اس کتاب کی تخلیق میں ان کا بڑا حصہ ہے لیکن
میرے آخری، اخذ کردہ نتائج کی ذمہ داری کے سلسلے میں وہ بھی لازماً
اتنے ہی معصوم سمجھے جائیں جتنی فورڈ فاؤنڈیشن !

علمیت کے وسیع نرمیدان میں پروفیسر شوئیلر۔ سی۔ والس
اور جے۔ سی۔ ہورلور کا، جو کولمبیا یونیورسٹی کے سکول آف
نیشنل افیئرز سے منسلک ہیں، بے حد ممنون ہوں جن کی حوصلہ افزائی
اور رہنمائی اس کتاب کی تخلیق میں ایک اہم عامل بنی نیز اشتیاق حسین
قریشی کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں جو مسلم ہندوستان پر گہرے عبور و
شعور (جس سے میں بے لطفانہ فیض یاب ہوتا رہا) کی وجہ سے پچھانوں
کی داستان کو تناظر میں رکھنے کے لئے بے حد عمدہ و معاون ثابت ہوئے۔
آخر میں مجھے اپنی رفیقہ حیات کا ذکر کرنا ہے جس نے نہ صرف
گرد آلود کتاب دان غور و خوض سے دیکھے اور دھندلے مسودات
مدون کئے بلکہ نہایت ذوق و شوق اور جی داری سے پشاور کی
تنگ و تاریک گلیوں میں اور خمیر کی پہاڑیوں کی خطرناک تریں ڈھلانوں
پر میرے ساتھ ساتھ رہی اور اپنی انیازی اور صحیح بین
نسوانی آنکھ سے اہم ”چھوٹی چھوٹی اشیا“ کی طرف
توجہ دلاتی رہی جن کے پاس سے میں بسا اوقات بے خیالی
میں گزر جاتا تھا۔ صرف وہی جو اتنی بے دھڑک اور
دل بستہ رہی ہے۔ اس کتاب کے صورتی و معنوی وجود

کے لئے اپنے حق کو ساقط نہیں کر سکتی !

واشنگٹن، ڈی سی جے۔ ڈبلیو۔ سپین
ستمبر ۱۹۶۱ء

پیش لفظ (مترجم)

یہ شاید کہنا ضروری ہے کہ اس کتاب کا مصنف جیمز ڈبلیو سپین امریکی بننے سے پہلے بھی زیادہ تر یورپی بلکہ مغربی تھا اور امریکی بننے کے بعد بھی زیادہ تر یورپی بلکہ مغربی ہے۔ اس کا ”امریکی پن“ اس سے ظاہر ہے کہ سرحد، برطانوی ہند اور انگریزوں کے متعلق لکھنے کے باوجود جن سے زیادہ تر امریکی ماخوذ ہیں، اس نے انگریز حکمرانوں، سیاست کاروں اور اربابِ نظم و نسق کے لئے معذرت خواہانہ انداز اختیار نہیں کیا جیسا کہ بہت سے انگریز فلم کاروں نے کیا۔ سپین نے ان کی کسی پالیسی کا جواز پیش کرنے کی کوشش نہیں کی البتہ اس کا تجزیہ، موازنہ اور محاکمہ کرنے کی سعی ضرور کی ہے اور حتیٰ الوسع اس کے روشن اور تاریک پہلو اور اس پالیسی کے خلاف جہاد و اجتہاد کرنے والوں کا موقف بھی لازماً بیان کیا ہے۔ اس لحاظ سے سرحد کی یہ تاریخ نہایت غیر جانبدارانہ، معروضی اور متوازن ہے۔

وہ یورپی بلکہ مغربی اس لئے ہے کہ اس کے آباؤ اجداد بھی

بیشتر امریکیوں کی طرح یورپی بلکہ مغربی تھے اور اپنے آپ کے اپنا اختلاف امریکی بننے کے بعد بھی اہل یورپ یا اہل مغرب سے نسلًا، وراثتًا، ثقافتًا، مذہبًا اور مزاجًا قریب ہے۔ امریکہ یوریشیا کی اقوام کی ایک بہت بڑی بھٹی تھی۔ جس میں مختلف النسل، مختلف القومیت اور مختلف الفکر لوگ جدوجہد آزادی، دورانہدیش قیادت، محکم دستور اساسی، یکساں نظام تعلیم، جیمز مانتو (امریکہ کے پانچویں صدر ۱۸۱۷ء تا ۱۸۲۵ء) کے اصول، ابراہام لنکن (امریکہ کے سولہویں صدر ۱۸۶۱ء تا ۱۸۶۵ء) کی داخلی اتحاد و استحکام کے لئے تظہیری مہم، یورپ کے سیاسی خازنار سے دُوری اور مغربی نصف کرہ میں کسی مساوی یا حریف قوت کے فقدان جیسے عوامل کی وجہ سے گھل کر ایک نئی قوم، ایک منفرد قوم یعنی امریکی قوم بن گئے اور گو آج بھی وہاں بعض سنگین اندرونی تضادات موجود اور برسر کار ہیں تاہم ان میں یک جہتی، منزل آشنائی اور وصل خواہی کے خیالات و احساسات اتنے راسخ ہو چکے ہیں کہ یہ تضادات ان کی "امریکیت" کے لئے خطرہ نہیں بلکہ وہ کسی وقت "امریکیت" کی زد میں آ سکتے ہیں لیکن امریکیت تو مشکل دو سو سال پرانی ہے لہذا تاریخی اور ذہنی طور پر اہل امریکہ اب بھی اہل یورپ ہیں اور یورپ میں بھی وہ مغربی یورپ سے ہر لحاظ سے قریب ہیں۔ لہذا وہ اپنے آپ کو اہل مغرب ہی سمجھتے ہیں!

ان کو مغرب سے بہت سی چیزیں ورثے میں ملی ہیں۔ آریہ
نسلیت اور اس کی فوقیت کا طنطنہ، حضرت عیسیٰؑ کی بجائے
ان کے حواریوں کا ترتیب دادہ مذہب، صلیبی سوراخوں کا تعصب
سفید فام اقوام کے بارہنہذیب کا نظریہ اور اسلام سے بغض بلکہ
اور اس سے حیرت انگیز بلکہ مضحکہ خیز حد تک ناواقفیت وغیرہ ان
میں شامل ہیں۔

سپین بھی ان سے کمالاً مستثنیٰ نہیں ہے۔ وہ ولایت کی
بنیاد آل سعود سے منسوب کرتا ہے۔ وہ جہاد کو ولایت کا شوشہ
گردانتا ہے۔ وہ اسلام کو ایک خشک، افسردگی آفریں اور تفریح کش
مذہب سمجھتا ہے۔ وہ تہذیب انسانی پر اسلام کے اثرات و احسانات
کا شعور نہیں رکھتا۔ وہ پشتو زبان و ادب کے ارتقا کو قبول اسلام
کے بعد کا واقعہ تو قرار دیتا ہے لیکن پٹھانوں پر اسلام کے مجموعی
اور مسلسل اثرات کی خبر نہیں رکھتا۔ پٹھانوں کا نسلی و جغرافیائی
وجود پہلے سے موجود تھا لیکن ان کا تاریخی وجود و شہود و صعود
سراسر اسلام کا مرہونِ منت ہے۔ ان کی ثقافت پر اس کے گہرے
اثرات مرتسم ہیں۔ پختون ولی جوان کا دستور و قانونِ حیات ہے
بعض باتوں میں مسخ ہونے کے باوجود کھٹیت اسلامی ہے لیکن
شاید سپین یا کسی بھی یورپی دامن کی قلمکار کو ہم بے خبر یا مورد الزام
کھہرا کر اپنی بریت کا ثبوت پیش نہیں کر سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر ماضی حال کے لئے ایک مینارۂ نور ہے تو حال بھی ماضی کا تصدیق یا تکذیب کنندہ ہے۔ اس وقت کم و بیش چھیالیس آزاد اسلامی ممالک کرۂ ارض پر موجود ہیں لیکن ان کے معاشرے میں اسلام بہت کم نظر آتا ہے۔ ان کے علاوہ مسلمان دنیا کے ہر ملک میں چند ہزار سے لے کر چند کروڑ تک پائے جاتے ہیں اور دنیا میں ہر پانچواں آدمی مسلمان ہے لیکن اس کے باوجود وہ دنیا کے پسماندہ ترین، جاہل ترین، غلیظ ترین اور مریض ترین لوگوں میں شمار ہوتے ہیں اور صدیوں سے زبان حال اپنے ماضی کی نفی کرتے ہیں اور اسلام کی تردید کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض افراد اس کے حامل و عامل ضرور ہیں لیکن معاشرتی اور مجموعی لحاظ سے اسلام زیادہ تر مسجد و مکتب کی زیریت ہے اور گھروں، دکانوں، دفاتروں، کھیتوں، منڈیوں، کارگاہوں، ایوانوں اور تعلیمی اداروں میں یہ شاذ و نادر اور خال خال ہی نظر آتا ہے۔ ذمہ دار، مقتدر اور مفاد پیوستہ طبقے صدیوں سے اس گنج گرانمایہ پر ناگ بن کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اسلام تو اول تا آخر، الف تا بے، ہمد تا لحد، فرد تا اجتماع، زراعت تا سیاست، محنت تا حکومت، عورت تا مرد ہے ہی ترا اطلاق! اسے محروم اطلاق کر دینا اس کی نفی کے مترادف ہے۔

لہذا پسین یا کسی بھی دوسرے قلم کار کو زیر تنقید لانے سے کہیں زیادہ ضروری یہ ہے کہ مسلمان خود اپنے معاشرے، اپنے

سیاسی و تعلیمی ادارے اور اپنے سماجی و اقتصادی نظام اسلام کے مطابق ڈھالیں تاکہ اسلام کا مقصد پورا ہو، اس کا کردار اجاگر ہو اور یہ علم الیقین اور حق الیقین کے علاوہ عین الیقین کا بھی مظہر ہو۔ جیسا کہ قرون اولیٰ میں تھا۔

بہر حال سپین نے اپنی اس مختصر لیکن جامع تاریخ میں بہت سے اہم مسائل چھیڑے ہیں اور ان کی چھان بین کرنے کی کوشش کی ہے مثلاً

- ۱۔ پٹھان جو اتنے جرات آزما، خطر پسند اور مہم جو رہے ہیں پاکستان کی سرحدی سرزمین کس انتہائی شمالی حصے میں کیوں نہ پھیل سکے؟ (باب سوم)
- ۲۔ پٹھانوں میں نسلی تفاخر کے باوجود احساس قومیت کیوں نہ جڑ پکڑ سکا؟ (باب چہارم)
- ۳۔ پہلی جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) میں پٹھانوں کا تعلق کیوں رہے؟ (باب پنجم)
- ۴۔ انگریزوں نے اپنی آمد کے بعد بندوبست اراضی کیا تو موجودہ صوبہ سرحد غذائی لحاظ سے ایک فاصلہ صوبہ بن گیا لیکن یہ کیفیت صرف چند سال تک قائم رہ سکی اور اندیہ، صدی کے اواخر سے پہلے پہلے یہ خسارے کا صوبہ کیوں کر بن گیا؟ (باب پنجم)

- ۵ بلوچستان میں سندھ میں سسٹم کیوں کامیاب رہا؟
(باب پنجم)
- ۶ جہاد پسند اسلام کا سخت قائل اور اس پر
سنجھتی سے عامل صوبہ مغلوب الہندو کانگریس کے ساتھ کیسے
ملا رہا؟ (باب ہشتم)
- ۷ عبدالقیوم خان نے صوبہ سرحد کو پاکستان کا ایک
مثالی صوبہ اور جہاں زیب نے سوات کو صوبہ سرحد کا ایک
مثالی علاقہ کیسے بنایا؟ (باب یازدہم)
- ۸ ڈاکٹر خان صاحب نے ون یونٹ کا وزیر اعلیٰ
بننا کیوں منظور کیا۔ (باب یازدہم)
- ۹ پختونستان کیا ہے؟ اور اس کے محرکات اور نتائج
عواقب کیا ہیں؟ (باب دوازدہم)
- یہ اور اسی قبیل کے دیگر سوالات جو اس کتاب میں اٹھائے
گئے ہیں۔ سپین نے ان کی توجیہ کرنے کی اپنی سی کوشش کی ہے۔
یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے جو اسباب و محرکات دریافت کئے
ہیں اور ان کے جو تجزیے پیش کئے ہیں اور جو نتائج و عواقب اخذ کئے
ہیں وہ سب کے سب حرفِ آخر ہیں یا ان کے علاوہ عوامل خارج
از امکان ہیں جیسا کہ مسئلہ نمبر ایک مذکورہ بالا پر آگے آنے والے
مختصر سے تبصرہ سے ظاہر ہوگا لیکن یہ ضرور ہے کہ سپین نے پوری

کوشش کی ہے کہ وہ ہر قسم کی مطبوعات و مسودات تک رسائی حاصل کرے اور اس کے علاوہ اپنے زیر مطالعہ لوگوں سے براہ راست ملے ان کے ساتھ رہے اور ان کے یل و نہار دیکھئے تاکہ جو کچھ پہلے لکھا جا چکا ہے اس کی تردید یا تائید ہو سکے اور جو کچھ سنوڑ دیکھا نہیں گیا وہ معرض وجود میں آ سکے۔ اس کی رسائی بہت دور تک ہے۔ پاکستان سے براستہ برطانیہ امریکہ تک۔ البتہ اسے اس کا افسوس ہے کہ وہ روسی قلمکاروں کی تحریرات سے استفادہ نہیں کر سکا کیونکہ وہ روسی زبان سے ناواقف ہے۔ اگر وہ واقف ہوتا تو ممکن ہے کہ اس کی ترتیب دادہ تصویر میں کئی تبدیلیاں ہو جاتیں۔

تاہم یہ کافی حد تک تیقن کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ انگریزی زبان کے قریباً تمام اصلی اور ثانوی ذرائع و وسائل اس کی گرفت میں رہے ہیں۔ روسی ذرائع سے وہ متمتع نہیں ہو سکا لیکن یہ افغانستان سے زیادہ اور سرحد اور پٹھانوں سے من حیث المجموعی کم متعلق ہیں اور پھر ثانوی ذرائع میں روسی مصنفین بھی شامل ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سپین کے ذہن و قلم پر اکثر انگریز قلمکاروں کی طرح کوئی قدغن نہیں ہے اور اس کے مطالعات و مشاہدات کسی چیز کو ثابت کرنے یا کسی چیز کا دفاع کرنے یا جواز ڈھونڈنے کے پابند نہیں ہیں بلکہ اس نے اپنے موضوع کا از خود، براہ راست مطالعہ کر کے ہی محرکات و عیاقب تلاش کئے ہیں۔ تاہم یہ ایک ناقابل انکار

حقیقت ہے کہ دوسری جنگ عالمگیر کے بعد ایشیا میں سلطنتِ برطانیہ کی کم و بیش دو سو سالہ بساطِ لپیٹی گئی تو اس کی بین الاقوامی ذمہ داریاں امریکہ نے سنبھال لیں لہذا یہ سمجھنا کہ کم از کم ان ذمہ داریوں کے احاطے میں امریکی انگریزوں سے بالکل مختلف ہیں یا امریکی انگریزوں کی وضع کردہ اور متروکہ پالیسی کے سلسلے میں قطعاً بے لوث ہیں اور سپین اس عرصے میں بھی اتنا ہی لا تعلق ہے جتنا دوسری جنگ عالمگیر سے پہلے تھا شاید ایک خوش فہمی ہی ہوگی۔

جہاں تک مذکورہ بالا مسئلہ نمبر ایک کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں گزارش ہے کہ اس وقت پٹھانوں کی مجموعی آبادی قریباً بارہ ملین ہے جن میں سے قریباً چھ ملین پاکستان کے قبائلی علاقہ، صوبہ سرحد اور بلوچستان میں ہیں اور باقی چھ ملین افغانستان میں ہیں لیکن پاکستان میں پٹھانوں کی آبادی یقیناً اس سے زیادہ ہے۔ اس لئے کہ اس میں پنجاب اور سندھ کی پٹھان آبادی شامل نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پٹھان اور پشتو کو لازم و ملزوم قرار دیا جاتا ہے حالانکہ زبان ایک سماجی عمل ہے جو ایک مخصوص ماحول کی پیداوار ہوتا ہے اصلی یا مادری زبان ایک مختلف ماحول میں زیادہ سے زیادہ تبسری نسل کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ اسی لئے ماہرین زبان کو نسلی شناخت کا حتمی ذریعہ نہیں مانتے اور اس کی بجائے جسمانی خصائص بشریاتی پیمائش اور ثقافت و روایات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

بہر حال سکندر لودھی (۱۲۸۹ء تا ۱۵۱۷ء) کے دور میں ہندوستان میں پٹھانوں کی کل تعداد قریباً ۹ لاکھ تھی۔ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق سرحد و بلوچستان کے سوا ہندوستان میں پٹھان مردوں کی آبادی ۶۸۰,۰۳۰ اور ۱۱ لاکھ تھی گویا مجموعی آبادی قریباً دو ملین ہوگی اس مردانہ آبادی کی صوبہ وار تقسیم یوں تھی۔

پنجاب - ۳۲۶,۷۱۷

بنگلہ - ۳۸۷,۱۷۲

پنجاب - ۵۲,۷۷۲

راجپوتانہ - ۹۲۱,۷۷۲

مدراں، کوچین، - ۸۶۷,۵۱۷

ٹراونکور

سنٹرل انڈیا - ۷۷,۷۷۷

میسور - ۷۳۱,۷۷۷

کشمیر - ۷۳۱,۷۷۷

برار اور حیدر آباد - ۷۷۸,۷۷۷

برما - ۷۳۰,۷۷۷

آسام - ۷۳۲,۷۷۷

ممبئی - ۷۷۷,۷۷۷

بڑودہ

۱۹۴۷ء تک یہ آبادی کم و بیش چار پانچ بلین ہوگی جو اکثر و بیشتر مہاجرین کی صورت میں پاکستان میں آگئی لیکن یہ پٹھان اُردو اور پنجابی بولنے والے ہیں اور انہی میں شمار ہوتے ہیں۔ بنگالی اور دیگر زبانیں بولنے والے اپنی علاقوں میں رہ گئے۔

ان پٹھانوں کا ہندوستان کی تاریخ پر بالعموم اور ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ پر بالخصوص بہت گہرا اثر ہے۔ وہ زیادہ تر عسکری تھے۔ منصب دار، جاگیردار اور زمیندار۔ وہ اہل سیف بھی تھے اور اہل قلم بھی اور علم و فضل میں ترکوں اور ایرانیوں کا لگا کھاتے تھے۔ ان پٹھانوں نے متعدد ریاستیں بھی قائم کیں جو ۱۹۴۷ء تک بلکہ بعد تک موجود رہیں جیسے بھوپال، رامپور، ٹانک، مالیر کوٹلہ، جونا گڑھ وغیرہ ان میں سے بہت سے اولیاء اللہ بھی ہوئے۔ روسیل کھنڈ ہو یا دلی کا افغان پورہ اور پل بگلش، ملتان کے پٹھان نواب ہوں یا قصور اور ممدوٹ کے وہ مسلمان تمدن ہند کے محترم و محترم خالق و حامل تھے اسلام کی تبلیغ و اشاعت ہو یا فارسی زبان کی ترویج و نشہیر یا اُردو زبان کی تخلیق و ترمیم، پٹھانوں کے کارنامے اور نقوش لازوال ہیں صوبہ بمبئی کی بندرگاہ بومبے آج بھی بڑی پٹھانوں کی یاد دلاتی ہے جو ان کے کاروباری مزاج و مہارت کی آئینہ دار ہے۔ ان کی بہ کارکردگی صرف لودھی اور سُوری ادوار تک ہی محدود نہ تھی بلکہ ان سے پہلے کم از کم سلطان محمود غزنوی کے دور سے اور ان کے

بعد بھی وہ ہر لحاظ سے ہندی مسلمانوں کے صفِ اول کے افراد تھے اور ہندوستان میں مسلمانوں کی ثقافت کے بہترین نمونے، نمائندے اور زعمیم تھے۔ وہ جہاں کہیں بھی تھے اپنے قد و قامت، رنگ رُوپ اور وضع قطع میں دیگر مسلمانوں سے منفرد ہونے کے باوجود ان کے ہم زبان، ہم سوز اور ہم منزل تھے۔ محض زبان کی بنا پر انہیں پٹھان ماننے سے انکار کرنا ایسے ہی ہے جیسے تاریخی واقعات و حالات کو دو آنکھوں کی بجائے صرف ایک آنکھ سے دیکھنا۔ وہ نسلاً آج بھی پٹھان ہیں۔

سپین نے پٹھانوں کے پھیلاؤ کو دیکھا تو اسے اس پر حیرت ہوئی کہ یہ لوگ سترِ پاپا ہرچہ بادا باد، ماکشتی در آب انداختیم کا مجسمہ ہونے کے باوجود صفِ انتہائی شمال میں کیوں نہ نفوذ کر سکے؟ اس نے سکندے نیویا کے ماہر بشریات، مسٹر فریڈرک یارنہ کا سہارا لیا جو ۱۹۵۴ء میں سوات میں مصروف تحقیق رہا تھا۔ اس کے مطابق پٹھانوں کی توسیع اس حد پر جا کر رک گئی جہاں دو فصلی علاقہ کی حد ختم ہوئی اور ایک فصلی علاقہ کی حد شروع ہو گئی۔ اس استدلال میں بہت وزن ہے اور اس میں پٹھان توسیع کو ایک نئے زادیے سے دیکھا گیا ہے لیکن نہ فریڈرک یارنہ اور نہ ہی سپین اس اطلِ حقیقت کو سمجھ سکے کہ پٹھانوں کے قدرتی نکاس کے لئے ہندوستان کا وسیع اور کشش انگیز میدان تھا جو صدیوں سے شمال مغربی دروں

کے نو واردوں کا ہدف بنارہا تھا۔ لہذا وہ شمال کے منجمد علاقوں اور جنوب کے نسبتاً خشک علاقوں کی بجائے ایسے علاقوں کا رخ کیوں نہ کرتے جس میں اتنی گنجائش اور امکانیت تھی کہ وہ انہیں قبول کرنے کے لئے تیار تھا۔

افسوس ہے کہ پیش لفظ ہر مسئلہ پر ایسی بحث کا مستعمل نہیں ہو سکتا لہذا میں باقی نکات بلکہ پوری کتاب قارئین پر ہی چھوڑتا ہوں سپین نے بہت کچھ لکھا اور سوچا ہے اور اس کی سوچ اکثر و بیشتر تاریخ سے ہم آہنگ بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔ تاریخ کی ورق گردانی کی جائے تو وہ محض ایک دلچسپ مطالعہ ہے لیکن اگر تدبر و تفکر سے کام لیا جائے تو تاریخ ماضی کا آئینہ، حال کا معیار اور مستقبل کی بھی نقش گربن جاتی ہے اور سہ

ہزار بادہ ناخوردہ درمگ تاک است

کے مصداق ابھی مزید سوچنے کی گنجائش بھی ہے اور ضرورت بھی۔ امید ہے کہ قارئین کرام اس کتاب کو پوری توجہ اور اہتمام سے پڑھیں گے۔ میراثاتی خیال ہے کہ اگر پاکستان و افغانستان کے حکمران طبقے، اہل سیاست اور اہل الرائے اس کتاب کو غور سے پڑھیں تو نہ صرف ہماری سرحدی سرزمین کے بہت سے اہم تاریخی، اقتصادی اور سماجی پہلو سامنے آئیں گے بلکہ وہ ہمسائیگی کی اہمیت بھی سمجھ سکیں گے اور ہمسایہ داری کے بہت سے تقاضے بھی پورے کر

سکیں گے جو ہنوز ان کی آنکھوں سے اوجھل ہیں۔ یہ تقاضے پورے ہو جائیں تو پھر بنیادی لگانگتیں اور مثالیتیں جن میں اسلام اور اسلامی ثقافت اہم ترین ہیں یقیناً اس ہمسایہ داری کو محکم سے محکم تر کرتی رہیں گی۔

تاریخ کا ایک ناگزیر سبق یہ ہے کہ انسانوں کے مختلف رنگوں، نسلوں، زبانوں، ثقافتوں اور مذہبوں کے باوجود ان کے درمیان ایک ناقابل انکار وحدت ہر وقت موجود ہے اور اگر قیادت چاہے تو وہ اس مواد سے فائدہ اٹھا کر انسانوں کو رشتہ وحدت میں پروا دے سکتی ہے۔ قیادت جب بھی چاہے ایسا ہو سکتا ہے اور جب رشتہ ہائے اتحاد و اشتراک زیادہ سے زیادہ ہوں اور نکات اختلاف کم سے کم ہوں جیسا کہ پاکستان و افغانستان میں تو ایسی صورت میں اس مضمون وحدت کو ایک روشن حقیقت اور قوت سیال بنا دینا تو اور بھی آسان ہے بشرطیکہ قیادت ذاتیات و ہنگامیات سے اوپر اٹھے اور اپنی باگ ڈور منشاء وقت اور تقاضائے تاریخ کے ہاتھ میں دے کر اس کو ہر نایاب کو پالے !!

آخر میں جناب عابد بخاری کا تہ دل سے ممنون ہوں کہ انہوں نے اس خاکسار کو ایک اچھی اور اہم کتاب ترجمہ کے لئے دی۔ ترجمہ اصل کا بدل تو نہیں ہو سکتا لیکن وہ اتنا بے وقعت بھی نہیں ہوتا جتنا ہمارے جیسے سیما پائلوں میں بسا اوقات

سمجھ لیا جاتا ہے۔ یونانی و لاطینی تراجم اسلامی تہذیب کے ارتقاء
کے لئے اتنے ہی اہم تھے جتنے عربی و فارسی تراجم جدید تہذیب
کے ارتقاء کے لئے !

کوئٹہ

انور رومان

۷، ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ

۱۸، نومبر ۱۹۸۸ء

تعارف

پٹھانوں یا پختونوں یا افغانوں (جیسا کہ وہ عموماً اپنے کو کہتے ہیں) پر گہری نظر ڈالنے سے پہلے یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ وہ کوئی گمنام اولین باشندے نہیں ہیں جو حال ہی میں اندرون افریقہ یا آسٹریلیا کے کسی دُور افتادہ کونے میں دریافت ہوئے ہیں۔ ان کا قبائلی معاشرہ غالباً سب سے بڑا اور اہم ترین ہے جو موجودہ دنیا میں اب بھی زندہ ہے۔ قریباً گیارہ ملین پٹھان ہیں جن میں سے قریباً نصف پاکستان اور نصف افغانستان میں ہیں (مقابلہ کر دان کے قریباً نصف ہیں) نصف سے کافی زیادہ غالباً سات یا آٹھ ملین ابھی تک ایک سخت قبائلی سماجی نظام کے تحت رہتے ہیں۔ باقی ماندہ تین چار ملین کم و بیش بیرونی سماجی و سیاسی تنظیم کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں تاہم وہ بھی ایک مشترکہ ثقافت اور زبان میں شریک ہیں اور اکثر و بیشتر اپنے قبائلی حسب و نسب کو یاد رکھے ہوئے ہیں جس سے ایک مشترکہ تشخص کا شعور قائم و دائم ہے۔ پورا گزہ بہت حد تک ہم خیال ہے اور اعلیٰ ترین تعلیم یافتہ پٹھان کا رویہ اور رویہ عمل بھی قریباً وہی

ہوتا ہے جو کم سے کم ہند کا۔

پٹھانوں کی اپنی تاریخ ہے جو قریباً ایک ہزار سال پرانی ہے
ان کا اپنا ادب ہے، شاعر اور علما و فضلاء ہیں اور ان کے اپنے مشاہیر
ہیں جو تاریخ ایشیا میں اتنے ممتاز و محترم ہوئے۔ آج بھی ان کے ہم نسل
لوگ صوبہ سرحد کی حدود کے پار اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہیں۔ افغان
شاہی خاندان محمد زئی درانی ہے۔ صدر پاکستان اور افواج پاکستان
کے چوٹی کے اکثر افسران پٹھان ہیں۔ اس وقت بھی سرحد کے دیہات
میں ایسے لوگ اپنی پرسکون زندگی گزار رہے ہیں جو پہلی جنگ عالمگیر
میں جرمینوں اور ترکوں سے لڑے ہیں۔ اس جنگ کے بعد روسی باشندوں
سے نبرد آزما ہوئے ہیں اور پھر دوسری جنگ عالمگیر میں اطالیوں اور
جاپانیوں سے برسرِ پیکار رہے ہیں۔ ان میں ایسے بھی ہیں جنہیں ملکہ
و کٹورہ نے تمغے پہنائے ہیں اور لینن نے اعزاز بخشے ہیں۔ انہوں
نے آزمودہ کار برطانوی افسروں کو مارا ہے اور کابن میں ایک بادشاہ
کو تخت پر بٹھانے میں مدد دی ہے۔

جو آدمی راقم الحروف کی طرح پبلنگ کی کمیوں اور قصصوں کے
رومان اور تشبیہات ناور سے سیراب ہو کر سرحد میں پہلے دفعہ آتا ہے
اس کے لئے حیرت و استعجاب کا دفتر کھل جاتا ہے۔ یہ سب کچھ سچ
ہے۔ طویل القامت، باریش قبائلی پشتاور کی تنگ گلیوں میں سے
کوئی بے باکانہ سندرہ گاتے ہوئے گزرتے ہیں۔ کندھوں پر رائفلیں

اٹھائے ہوئے اور کالر کی پٹیوں میں خنجر لگائے ہوئے، شہر کی گرتی ہوئی دیواروں کے ساتھ ساتھ قدیم سرائیں کھڑی ہیں جہاں بنجارا، سمرقند اور کاشغر کے بڑے بڑے کاروان کبھی اپنا سامان اتارتے تھے، بازار غیر ملکی ساز و سامان سے بھرے پڑے ہیں۔ سُرخ اور سنہری سلیپر، پتیل اور تانبے کے ظروف، مرصع خنجر، سنہری دستار اور مشرق کے رنگارنگ مصالحہ جات، مسجد نہایت خان کے بناؤں کی خیرہ کن مرمریت، صرافوں کی گرد آلود گلی کے جھمکوں اور چوڑیوں میں منعکس ہوتی ہے۔ اگر تیمور لنگ بھی یہاں سے گزرے تو وہ بھی پانچ صدیوں کا فرق محسوس نہ کر سکے گا۔

خیبر سے گزرتے ہوئے قلعہ جمروہ پر سیاح کی اچھی طرح جاہم تلاش ہوتی ہے جہاں عظیم سکھ جرنیل ہری سنگھ بیٹھانوں کے ماتحتوں مارا گیا تھا اور پھر اگر اس کے پاس مطلوبہ اختیار نامہ ہے تو اسے آگے تنگ گھاٹی میں جانے دیا جاتا ہے جس میں اب بھی قدم قدم پر قلعے اور بندوق خانے موجود ہیں۔ افغان سرحد پر خوشبودار سبز چائے کی پیالی پیتے ہوئے اسے مسکراتے ہوئے روٹیوں کا ایک گروہ مل جاتا ہے جو وسط ایشیا کی اونچی اونچی سموردار ٹوپیاں پہنے ہوئے کسی نامعلوم کام کاج کے لئے افغانستان سے پاکستان جا رہا ہے۔

وزیرستان میں جب مسافر مضبوط، قلعہ بند چھاؤنیوں سے

باہر پولیٹیکل ایجنٹ کے ساتھ سیر مینی کے لئے لکھتا ہے تو مرنے مارنے پر تیار، رائل بدوش سکاؤٹوں کا ایک محافظ درماعت کے آگے پیچھے اور پہلوؤں پر چلتا ہے۔ گروہ کی نقل و حرکت مقررہ اوقات کے مطابق ہوتی ہے تاکہ تاریکی سے پہلے پہلے اسے کسی قلعہ کی چار دیواری میں لایا جاسکے اور دیہات اور چھاؤنیوں کے دروازے بند نہ ہو جائیں۔

پورے سفر کے دوران خطرہ اور جوش و خروش کی فضا قائم رہتی ہے لیکن آج کل حفاظتی تدابیر اتنی وافر ہیں کہ بزدل ترین سیاح کے سوا آدمی نامناسب خطرہ جان کے بغیر اپنے تجربات سے محفوظ ہو سکتا ہے۔ رومان اور ہم جوئی سے لطف اندوز ہونے کا اس سے بہتر طریقہ اور کون سا ہو سکتا ہے۔

ایک دوسرا مرحلہ بھی ہے جو آج کل کی سماجی و اقتصادی شعور یافتہ دنیا کے اکثر سیاحوں کو تھوڑی دیر کے بعد پیش آتا ہے رطب اللسان غیر ملکی کوشدت سے تصویر کے دوسرے رخ کا احساس ہوتا ہے اور اسے اکثر لوگوں میں فلاکت و جہالت نظر آتی ہے جو دور دوز تک پھیلی ہوئی تپ دق، گلو کو ما (آنکھ کی ایک بیماری) اور اموات نوزائیدگان، سخت پردے کی وجہ سے عورت پر عائد کردہ جان لیوا اور غیر معقول پابندیوں اور اکثر مردوں کی لالچ اور برائیوں ان کی شیخیوں اور مبالغہ آمیز قول و قرار اور دھمکیوں اور وحشتانہ

اور بے سود خونیں جھگڑوں میں ظاہر ہوتی ہیں۔

اس مرحلے میں پٹھانوں کا مبصر اپنے آپ کو مبارکباد دیتا ہے۔ کہ اس نے اپنی گلابی عینکین انار لی ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ پٹھان کسی قدر گندم نما اور جو فروش ہیں۔ وہ اپنی انگلی ناگزیر طور پر اقتصادی مسئلے پر رکھتا ہے جو اس علاقے کا واقعی اہم عامل ہے۔ وہ ان لوگوں کی مدد کرنے کا سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے جو اپنے بے آب رومانوی رنگ و روغن کے روپ میں دنیا کے بد قسمت ترین لوگوں میں شامل ہیں۔ اگلا قدم منصوبہ سازی ہے تاکہ بہتر شبانی طریقے جاری کئے جائیں۔ گھریلو دستکار یوں کو ترقی دی جائے۔ قبائل کو غیر مسلح کیا جائے اور انہیں میدانوں کی نو سیراب زمینوں پر آباد کیا جائے۔ پٹھانوں کا غیر دلکش پہلو بھی ہے جس پر نگاہ ڈالنا کافی حد تک قابل تعریف بھی ہے اور دیرینہ ضرورت بھی۔ پٹھانوں کی مدد کرنے کا خیال برطانوی حکومت کے دور عروج میں قریباً مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا۔ بہت سے برطانوی افسر اور منتظمین سطح سے نیچے کبھی نہ دیکھ سکے اور سرحد میں اپنی پوری ملازمت کے دوران پٹھانوں سے صرف تلوار بازی اور تدبیر آزمائی ہی کرتے رہے اور پٹھانوں کو شکست و موت کا سامنا کرنے پر مجبور کرتے رہے اور خود بھی قریباً اتنی ہی خوشی سے شکست و موت کا سامنا کرتے رہے۔ بعد کے برطانوی جیسے بارٹن اور فریئر ٹپلر پٹھانوں کی قابل رحم اقتصادی حالت سے بخوبی آگاہ تھے اور

وہ حکومت ہند کو اکثر اس کا مدد کرنے پر ابھرتے رہے۔ بہت سے پاکستانی افسر بھی اسی نظریے کے ہیں کہ قبائلی مسئلہ کی کلید اقتصادی ہے اور پچھلے چند سالوں کے بیرونی امدادی پروگراموں کے بل پر انہوں نے پٹھانوں کی تقدیر بدلنے میں کافی پیش رفت کی ہے بالخصوص صحت اور تعلیم کے میدانوں میں۔

پٹھانوں کے اکثر مبصرین انہی دو مراحل پر رک جاتے ہیں اور مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ان کی اخذ کردہ تصویر متوازن ہے۔ قدیم دھوم دھڑکا کی ایک باریک سی سطحی تہہ جو ایک انارٹی مبصر کو تو بہلا بھسلا سکتی ہے لیکن جس کے نیچے فلاکت و جہالت کا ایک بڑا اور مہیب دھارا بہہ رہا ہے جسے جدید طریقوں سے ہی زیر کیا جاسکتا ہے۔

پہلے اور دوسرے مرحلے پر غور کرتے ہوئے راقم الحروف کو ایک تیسرے مرحلے کا احساس ہوا جو هنوز قائم ہے۔ آخری مرحلہ پہلے مرحلے سے بہت مشابہ ہے۔ پٹھان بالآخر ایک حقیقت ہے اور اس کی روایتی تشبیہ کچھ زیادہ غلط نہیں ہے۔ طویل و عمیق معائنہ کے تحت بھی پٹھان غیر معمولی حد تک اپنے ذاتی وقار کا ایک شدید احساس اور آزادی سے بے پناہ محبت رکھتا ہے۔ یہ خوبیاں جدید معیار کے مطابق بھی احسن تر ہیں اور انتقام اور مہمان نوازی جیسے تصورات کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ بیرونی دنیا انہیں کتنا بھی ازکار رفتہ

اور رومانوی سمجھے یہ سرحد میں ایک قائم و دائم قبائلی معاشرے کا قدرتی اظہار ہیں جو کم از کم اپنی موجودہ سیٹیت میں ان سے زیادہ تقویت حاصل کرتا ہے بجائے اس صورت کے جو دنیا کے دوسروں جھتوں میں زیادہ مرغوب ہے۔ یہ کہنا تو مبالغہ ہو گا کہ پھٹان کی خوبیاں اس کی فلاکت کی وجہ سے ہیں لیکن یہ ضرور قابلِ تحسین ہے کہ وہ اسے دور کرنے کے لئے انسانی وفار و حریت کے آدرشوں کا ہرگز سودا نہیں کرتا۔ پختون ولی کی صحت کے لئے شاید آج کل بھی قولِ فیصل یہی ہے کہ اس کے اکثر پیروکار حیرت انگیز طور پر وقت کے رُخ کے ساتھ بدل سکتے ہیں۔ ایشیائی جس کا مغرب سے بہت گہرا ربط ہوا ہو اور وہ اپنی ثقافت سے ہم آہنگ نہ ہو سکا۔ بلکہ یتیم العالمین بن کر رہ گیا۔ ایک بہت عام منظر ہے۔ لیکن پھٹان ایسا کوئی شاید ہی ملے گا۔ وہ دونوں دنیاؤں سے متمتع ہونے کا جو ہر رکھتے ہیں۔ نوجوان پھٹان جو ڈگری یافتہ ہے اور آکسفورڈ یا کیمبرج میں سماجی امتیاز حاصل کر چکا ہے اپنے گاؤں میں واپس آئے گا تو اپنے خاندان کا خونیں جھگڑا چکائے گا۔ اگر اس عمل کے دوران اسے نفسیاتی دھچکے لگیں تو وہ شاید وناوار ہی منظر عام پر آئیں گے۔ یہ غالباً حادثی نہیں تھا کہ کپلنگ نے اپنی ”مشرق و مغرب کی داستان“ میں اپنے اصول ” توام ہرگز آپس میں نہ ملیں گے“ سے پھٹانوں کو مستثنیٰ

قرار دیا۔

” لیکن وہاں نہ مشرق ہے نہ مغرب
نہ سرحد نہ تربیت، نہ پیدائش
جب دو مضبوط انسان دُور و کھڑے ہوتے ہیں
خواہ وہ کدہ ارض کے سروں سے نعلیق رکھتے ہوں!“

باب اول

سرزمین

الف - جغرافیہ

پٹھانوں کی پرمنظر سرزمین نے ان کی تاریخ اور طرزِ حیات پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ ان کا علاقہ ہمالیہ کے مغربی سرے سے شروع ہوتا ہے جہاں یہ سلسلہ عظیم پڑی پڑی چوٹیوں اور گڑھوں میں بکھر جاتا ہے یعنی قراقرم، پامیر اور ہندوکش۔ ہندوکش کا بڑا سلسلہ رفعت اور آب و تاب میں کم ہوئے بغیر جنوب اور مغرب میں جاری رہتا ہے اور افغانستان کو دو حصوں میں بانٹ دیتا ہے اس کی ایک اور شاخ سیدھی جنوب کی طرف چلتی ہوئی کوہِ سفید بن جاتی ہے جو کوہِ سلیمان سے مل جاتی ہے۔ مزید جنوب میں چاغی کی پہاڑیاں مغرب کی طرف چلتی رہتی ہیں حتیٰ کہ صحرائے ہلمند کے ریگزاروں میں گم ہو جاتی ہیں۔ پہاڑی رکاوٹ وسط ایشیا کے مرکز اور بحیرہ عرب کے ساحلی ریگزاروں کے درمیان ایک ہزار میل سے زیادہ فاصلے پر محیط ہے۔ ۱۸۹۳ء میں سر مارٹین ڈیوڈ نے برطانوی حکومت کے ایما پر اس چٹانی سلسلہ کے ساتھ ساتھ ایک خط فاصل

کھینچنا کہ ہندوستان کو افغانستان سے میسر کیا جاسکے۔ ڈیورنڈ لائن اب بھی افغانستان اور پاکستان کے درمیان خط فاصلہ ہے۔

پاکستان کا شمال مغربی سرحدی علاقہ زیادہ تر مغرب میں ڈیورنڈ لائن اور مشرق میں دریائے سندھ کے درمیان واقع ہے۔ یہ اندازاً ۳۱۔

سے ۵۲۔ ۳۶ شمالی عرض بلد اور ۱۶۔ ۶۹ سے ۷۰۔ ۷۷ مشرق طول بلد میں واقع ہے۔ اس کی زیادہ سے زیادہ لمبائی ۲۰۰ میل سے ذرا زیادہ اور زیادہ سے زیادہ چوڑائی تقریباً ۲۸۰ میل ہے۔ گو عین مرکزی حصے میں پہاڑ اور سندھ بمشکل ۱۰۰ میل کے فاصلے پر ہیں اس کا کل رقبہ تقریباً ۲۵۹،۳۹۰ مربع میل ہے۔

شمالی سرحد ہمالیہ کا گنگا ن سلسلہ ہے جہاں افغانستان کی واخان کی پٹی چھ میل سے بھی کم فاصلے سے ہندوکش کو پامیر سے اور پاکستان کو روس سے جدا کرتی ہے۔ جنوب میں یہ علاقہ صحرائے بلوچستان میں کھلتا اور ختم ہو جاتا ہے جس پر تخت سلیمان کی اونچی اور آخری چوٹی ایستادہ ہے۔ مشرق کی طرف کشمیر اور پاکستانی پنجاب سے اور مغرب میں افغانستان واقع ہے۔

سیاسی طور پر یہ علاقہ دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ۱۔ قبائلی علاقہ جس میں مالاکند، ہمند، کرم، شمالی وزیرستان اور جنوبی وزیرستان کی ایجنسیاں شامل ہیں۔ ۲۔ چھ وزیر قانون اضلاع یعنی ہزارہ، مردان، پشاور، کوہاٹ، بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خان۔ قبائلی علاقہ جو

ڈیونڈ لائن کے ساتھ ساتھ واقع ہے۔ ۲۵,۱۴۰ مربع میل پر محیط ہے اور اضلاع جو سندھ سے متصل ہیں ۱۴,۱۱۹ مربع میل پر۔
جغرافیائی لحاظ سے یہ علاقہ تین قدرے مختلف حصوں میں تقسیم ہے۔

۱۔ ضلع ہزارہ واحد حصہ جو دریائے سندھ کے مشرق میں واقع ہے۔

۲۔ دریائے سندھ اور پہاڑیوں کے درمیان کی نسبتاً تنگ پٹی جو اضلاع مردان، پشاور، کوہاٹ، بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خان پر مشتمل ہے۔

۳۔ ڈیونڈ لائن کے ساتھ ساتھ شمال اور مغرب کے پہاڑی علاقے جو قبائلی ایجنسیوں پر محیط ہیں۔

ہزارہ

ضلع ہزارہ کے مغرب میں دریائے سندھ اور مشرق میں پنجاب کا ضلع اٹک ہے۔ یہ ایک اچھے خاصے چوڑے قاعدے

۱۔ دیر، سوات اور چترال کی ریاستیں مالاکنڈ ایجنسی کا حصہ ہیں قبائلی علاقہ میں وہ چھ پٹیاں بھی شامل ہیں جو انتظامی ضروریات کے تحت زیر قانون اضلاع سے منسلک ہیں۔

سے ایک پانہ کی صورت میں شمال کی طرف اٹھتا ہے اور کوہ ہمالیہ کے کافی اندر تک چلا جاتا ہے۔ یہ پانہ وادی کاغان کے سرے تک جاتا ہے جہاں ۱۳ ہزار فٹ اونچا درہ بالو سرگلگت میں کھلتا ہے۔ ضلع کے شمالی حصہ میں وادی کاغان چٹانی پہاڑی دیواروں کے درمیان بس ایک گھاٹی ہی بن جاتی ہے۔ مزید جنوب میں پہاڑ جدا ہو کر لپٹ اور جنگلات سے بھرپور شاخوں میں بٹ جاتے ہیں اور علاقے کو چھوٹے چھوٹے الگ تھلگ قطعات میں کاٹ دیتے ہیں۔ پانہ کے عین قاعدے پر پہاڑیاں کھل جاتی ہیں اور پنجاب کے میدان شروع ہو جاتے ہیں۔ ہزارہ کی پنجاب کی دیرینہ زرخیزی سے قربت اور اس کے شرق سندھ محل وقوع نے اس ضلع کو سرحد کے دیگر حصوں سے نمیز کر دیا ہے۔ لیکن یہ علیحدہ تشخص جغرافیائی سے زیادہ سیاسی و نسلیاتی ہے۔

سندھ پار کے اضلاع

سندھ کے مغرب کی طرف کے پانچ اضلاع مغربی سرحدی پہاڑیوں سے متصل ہیں لیکن ان کے جغرافیائی خصائص کافی مختلف ہیں۔ شمال کے پشاور اور مردان ایک کشادہ وادی میں واقع ہیں۔ وادی پشاور پہاڑیوں میں محصور ہے جن سے مغرب میں درہ خیبر اور دریائے کابل اور شمال میں درہ مالاکند اور دریائے سوات

گذرتے ہیں۔

ایک ہلکی سی، مسامدار سطح کی مٹی قدرے ریت اور نمگیر چکینی مٹی کے ساتھ دس تا پچیس انچ سالانہ بارش اور نسبتاً باافراط آبپاشی کی سہولت نے مل کر وادی پشاور کو پورے علاقے کے لئے خوردنی پیداوار کا اہم ترین ذریعہ بنا دیا ہے۔ ایک لمبا، گرم آگائی کا موسم اور کبھی کبھار کی ہلکی سی گہر بھی پھلوں، گندم، جوار، مکئی، دالوں، گنا اور تمباکو کی اچھی فصلوں کے لئے مدد و معاون ہیں۔

جنوب کا ضلع کوہاٹ کوہ جواکی کی وجہ سے پشاور سے جدا ہوتا ہے۔ جس میں سے چھوٹا سا لیکن نظر افروز درہ کوہاٹ گزرتا ہے۔ ضلع ایک سنگلاخ سطح مرتفع ہے جو پہاڑیوں کے پست سلسلوں میں بٹی ہوئی ہے اور ان میں سے بعض میں نسبتاً زرخیز وادیاں ہیں جہاں پیداوار گارے کے ذخائر ہیں لیکن اکثر پہاڑی زمین بنجر ہے اور زراعت زیادہ تر قریباً پندرہ انچ سالانہ بارش پر ہی منحصر ہے۔ کوہ نمک ضلع کے جنوبی اور مشرقی حصوں میں دریا ہے جس سے اندرونی ریل و رسائل مشکل ہو گئے ہیں۔ اس سے پرے ایک ریتلا میدان ہے۔

مزید جنوب میں بنوں کے ارد گرد دریائے کرم کے زیریں حصوں کے ساتھ ساتھ ایک نسبتاً زرخیز اور کشادہ میدان ہے۔ آبپاشی اور باری باری کی فصل کاری کی بدولت زرعی پیداوار خوب

ہوتی ہے۔ گوارد گرد کا علاقہ خشک ہے جسے میدان مسوات کہا جاتا ہے۔ اگر بارش کافی ہو جائے تو اس میدان کے کچھ حصے میں بھی گندم با افراط ہو جاتی ہے۔

سرحد کا جنوبی ترین ضلع ڈیرہ اسماعیل خان زیادہ تر ایک خشک اور پتھریلے میدان پر مشتمل ہے جو دریائے سندھ اور مغربی کوہ سلیمان کے درمیان محدود ہے۔ یہاں پانچ تا آٹھ انچ سالانہ بارش ہوتی ہے۔ سندھ کے ساتھ ساتھ گاؤں کی ایک زرخیز بیٹی ہے اور زیریں ڈھلوانوں کے ساتھ ساتھ چکنی مٹی کا ایک ذخیرہ ہے جسے دامن کہتے ہیں۔ پورا میدان جو پنجاب تک پھیلا ہوا ہے ڈیرہ جات کہلاتا ہے۔

سرحدی پہاڑیاں

شمالی اور مغربی پہاڑی خطوں کی نوعیت جس میں قبائلی ایجنسیاں واقع ہیں۔ اضلاع کی نسبت زیادہ متنوع ہے۔ مالاکنڈ ایجنسی میں ریاست ہائے دیر، سوات اور چترال واقع ہیں اور یہ ضلع ہزارہ سے بھی زیادہ ہمالیہ کے اندر چلی جاتی ہے جو سندھ کے دوسری طرف واقع ہے۔ مالاکنڈ کی چوٹی کے قریب بارہ ہزار فٹ اونچا درہ بروگل ہے۔ جو واخان پٹی سے گزرتا ہوا چین اور روس تک چلا جاتا ہے۔ شمالی ترین ریاست، چترال گہری وادیوں

اور اونچی چوٹیوں کی سرزمین ہے۔ اسے دس ہزار فٹ سے زیادہ اونچا درّہ لواری باقی ایجنسی سے جدا کرتا ہے۔ درّے میں جیپ کا راستہ ہے لیکن یہ سال کا بیشتر حصہ برف آلود ہوتا ہے۔ چترال کے جنوبی حصے میں گھنے جنگلات سے بھرپور پہاڑیاں شروع ہوتی ہیں جو دیر، سوات اور باجوڑ تک چلی جاتی ہیں جہاں سوات اور پنجگورہ دریاؤں نے خوب کشادہ اور زرخیز وادیاں پیدا کر دی ہیں۔ دیر الھی تک الگ تھلگ اور پسماندہ ہے لیکن سوات میں ایک ترقی پسند حکومت سے بہت سے فوائد حاصل ہوئے ہیں مشمولہ بہ ۳۶۰ میل لمبی موٹر کے لائق سڑک۔

دیر سے نیچے مہمند علاقہ ہے جو قریباً سب کا سب چھوٹی چھوٹی، ٹوٹی پھوٹی اور چٹیل پہاڑیوں پر مشتمل ہے جو افغانستان کے اندر تک چلی جاتی ہیں اور کاشت کاری یا ریل و رسائل کا کوئی موقع نہیں دیتیں۔ یہ پست پہاڑ جو اس مقام پر خیبر کی پہاڑیاں کہلاتے ہیں جنوب کی طرف چلتے رہتے ہیں اور صرف مشہور درّہ ہی انہیں کاٹتا ہے جو کابل دریا کی تنگ گھاٹی کے جنوب میں چند میل تک ان میں بل کھاتا ہے۔ اس سلسلے کی سب سے اونچی چوٹی طرّہ ہے جو قریباً ۶۸۰۰ فٹ بلند ہے۔

درّہ خیبر کے جنوب اور مغرب میں تیراہ کی چھوٹی چھوٹی زرخیز وادیاں کوہ سفید کی ڈھلانوں کے ساتھ ساتھ پہاڑیوں اور

گھاٹیوں کے ایک دشوار گزار جال میں پھیلی ہوئی ہیں اور کوہ سفید
افغان سرحد کے عین مغرب کی طرف واقع ہے۔ سرے پر ۱۵۶۰
فٹ اونچا کوہ سفید نیچے درہ سپوار کوتل کا نگہبان ہے جو افغان سطوح
مرتفع سے زرخیز وادی کرم میں داخلے کا راستہ ہے۔ کرم ایجنسی دریا
کے ساتھ ساتھ جنوب مشرق کی طرف چلتی ہے اور اسے پہاڑیوں
کی ایک شاخ بالائی اور زیریں وادی میں تقسیم کر دیتی ہے حتیٰ کہ دریا
بنوں کے میدان میں داخل ہو جاتا ہے۔ کرم قبائلی علاقے میں زرخیز
تیس ہے اور پھل اور طبی فوائد کے پودے، آرمیسیا کی بھرپور فصلوں
کا گھر ہے۔

کرم سے نیچے وزیرستان کی پہاڑیاں ہیں۔ ان میں سے صرف
چند چوٹیاں ہی ۸ ہزار فٹ سے زیادہ بلند ہیں لیکن وزیر پہاڑیاں اتنی
سخت اور ٹوٹی پھوٹی ہیں کہ علاقے کے بہت سے حصے صرف پیدل
ہی طے کئے جاسکتے ہیں۔ دریائے ٹوچی افغان سرحد سے شمالی
وزیرستان میں واقع بنوں شہر کے درمیان ایک خاصی سیدھی رو
کی صورت میں بہتا ہے۔ دریا کے ساتھ ساتھ دور آباد ہیں اور تنگ
وادی انہی کے نام سے موسوم ہے۔ کرم کی طرح یہ وادی بھی پہاڑیوں
کی ایک شاخ کی بدولت بالائی اور زیریں حصوں میں تقسیم ہے جو
دریا کے پاٹ تک آ جاتی ہے۔

مزید جنوب میں ڈھلوان گھاٹیوں کا ایک سلسلہ کنی گورم سے

جوانجھی ہوئی پہاڑیوں کے وسط میں واقع ہے، وانا کے میدان تک جاتا ہے۔ جس کے ارد گرد جنوبی وزیرستان ایکبسی مرکز ہے دریائے گول بھی وقف وقفے سے جنوبی علاقے کی پہاڑیوں کو کاٹتا ہے۔ اور یوں افغانستان سے ڈیرہ اسماعیل خان، بلوچستان اور زیریں پنجاب کو جانے والا ناہموار لیکن کثیر السفر راستہ بنیا کرتا ہے بعض اونچی اونچی پہاڑیوں پر جنگلات ہیں اور کئی گورم کے ارد گرد کا نیم سطح مرتفع کا علاقہ کاشت کاری کے لئے کچھ جگہ دے دیتا ہے لیکن وزیر پہاڑیاں وادی کرم کے جنوبی پہلو میں اپنی ابتدا سے لے کر مشہور تخت سلیمان کے قریب کوہ سلیمان کے ساتھ انضمام تک زیادہ تر بنجر اور چٹیل ہیں اور صرف تخت سلیمان ہی ڈیرہ جات میں ایک نظر افروز مقام ہے۔ وزیر پہاڑیوں میں بارش برائے نام ہوتی ہے اور درجات حرارت ۱۳ سے لے کر ۱۲۲ تک ہوتے ہیں۔

حمل و نقل اور رسل و رسائل

ایک اچھی پختہ شاہراہ مالاکنڈ سے جنوب کی طرف سب ضلعوں سے گزرتی ہوئی دریائے سندھ پر واقع ڈیرہ اسماعیل خان تک جاتی ہے لیکن یہ شمالاً جنوباً سڑک اس لئے نہیں بنائی گئی تھی کہ زمین کے قدرتی رسل و رسائل اور حمل و نقل کے راستوں سے

فائدہ اٹھا سکے جو شرقاً و غرباً چلتے ہیں بلکہ انہیں کاٹنا اور قابو کرنا مقصود تھا۔ اس طرح یہ سڑک برطانوی ہند کے سامراجی دفاع کے تقاضے پوری کرتی تھی جو مستقل ٹرانزٹ رکھتا تھا مبادا کوئی خطرناک یا ناخوشگوار عنصر سرحد سے داخل ہو کر کسی قدرتی راستے سے گزرتا ہو (جو سرزمین کی ڈھلان کے مطابق ہیں) سندھ اور ہندوستان تک پہنچ جائے۔ چونکہ یہ درے اور دریائی وادیاں تاریخی ہیں اتنا اہم کردار ادا کرتی رہی ہیں اور وحشیانہ پہاڑی رکاوٹ (جن سے یہ گزرتے ہیں) میں زندگی کی بقا کے لئے اتنے ضروری ہیں لہذا وہ اب بھی اپنی اہمیت کے مالک ہیں۔

خیبر

ان میں سے تاریخی تریں بدھ شام دنیا بھر کے تمام دروں میں تاریخی تریں خیبر ہے جو پہاڑیوں کو بتیس میل تک کاٹتے ہوئے پشاور اور کابل کے درمیان قریباً ایک خط مستقیم کی طرح گذرتا ہے اب ایک جدید دوسری سڑک اس کی پوری لمبائی سے گزرتی ہے لیکن پھر بھی خیبر پر جوش تریں، رومان پسند کے لئے بہت صبر آزما اور قلعہ بند ہے۔ لیکن اس کے اعداد و شمار غیر موثر ہیں۔ یہ اپنی چوٹی پر ۳۳۷۳ فٹ اونچا، مشرقی دروازے پر ۱۶۰۰ فٹ اور مغربی دروازے پر ۱۴۰۲ فٹ اونچا ہے۔ آسان رسائی کی وجہ سے خیبر

ہمیشہ وسط ایشیا سے ہندوستان کی شاہراہ رہا ہے۔ آج کل بھی ہر قسم کی تجارت و مواصلات مابین پاکستان و افغانستان کے لئے یہ بیحد اہم ہے۔

اس علاقے کی پہاڑیوں میں ایک اور متبادل لیکن قلیل السفر رازنہ ملا گوری روڈ بھی ہے جو خیبر سے قریب دس میل شمال میں پہاڑیوں کی ڈھلانون کے ساتھ ساتھ جاتی ہے۔

دریائے کابل خیبر سے چند میل شمال میں پہاڑیوں سے نکلتا ہوا میدان پشاور کو جاتا ہے لیکن یہ رسل و رسائل کا ذریعہ اس لئے نہیں بن سکتا کہ اس کی رو بہت تیز اور گھاٹی بہت تنگ ہے لیکن دریائے کابل کو جلال آباد (افغانستان) میں چھوڑ کر شمال اور مشرق میں دریائے گنر کے راستے دیر اور مہمند علاقے کے مقابل پہنچا جاسکتا ہے جہاں سے متعدد تراسیدہ راستوں کے ذریعے سرحدی پہاڑیوں میں سے گزرا جاسکتا ہے۔ سکندر نے ہندوستان میں آمد کے لئے یہی راستہ اختیار کیا۔ اسے اب بھی بعض پوندے استعمال کرتے ہیں جو ہر سال سرحد سے پاکستان میں ٹڈی دل کی طرح آتے ہیں۔

کرم

مزید جنوب میں وادی کرم کی چوٹی پر واقع پیوار کوتل ایک اور متبادل راستہ ہے۔ اسی راستے سے افغانستان کا نادر خان ۱۹۱۹ء

میں اپنے لشکروں کے ساتھ تیسری جنگ افغان میں تھل پر قبضہ کے لئے آیا تھا۔ گو یہ قبضہ بہت مختصر ثابت ہوا۔ کرم نسبتاً آسان راستہ ہے لیکن یہ وسط ایشیا سے برصغیر کی شاہراہ سے دور ہے لہذا صرف مقامی ٹریفک کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

ٹوچی

دریائے ٹوچی (جسے گمبیل بھی کہتے ہیں) شمالی وزیرستان میں واقع ددر وادی میں سے بہتا ہے۔ وادی کے نچلے حصے میں بنوں اور میرانشاہ کے درمیان موٹر کی سڑک ہے اور پوتہ وں کا یہ مقبول ترین راستہ ہے۔ ایک اور پختہ سڑک میرانشاہ سے جنوب کی طرف رزمک کو جاتی ہے جو وزیرستان کے وسط میں واقع ہے اور یہاں سے جنوبی وزیرستان ایجنسی میں واقع جندولا کو چلی جاتی ہے۔ یہ سڑک انگریزوں نے چوتھے عشرے میں بہت سے مصائب و نواب اور اخراجات کے بعد بنائی تھی تاکہ وزیرستان کو فوجی کارروائی کے لئے کھولا جاسکے۔ اسے ۱۹۴۷ء کے بعد استعمال نہیں کیا گیا جب پاکستان نے رزمک میں متعینہ فوج کو واپس بلا لیا۔

گومل

دریائے گومل یا کوئی میں شادونادر ہی پانی ہوتا ہے گو اس

کی گزرگاہ افغان سرحد کے پُرے سے شروع ہو کر ڈیرہ اسماعیل خان کے قریب دریائے سندھ تک آتی ہے۔ سرحدی پہاڑیوں میں یہ سب سے الگ تھلگ اور خطرناک راستہ ہے تاہم ہزاروں پوندے اسی سے سندھ اور زیریں پنجاب میں آتے ہیں۔

سرحد بحیثیت ایک رکاوٹ

سرحدی پہاڑیوں کے متعلق غالباً اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ رکاوٹ ہونے کے باوجود یہ بہت سی صفات کی حامل ہیں۔ اولاً یہ آباد ہیں اور ڈھائی ملین لوگ صرف قبائلی علاقے میں ہی بستے ہیں ثانیاً ان میں سے بہت سے قدرتی راستے ہیں جن میں سے ایک خیبر بھی ہے۔ ثالثاً کوئی طاقت مشمولہ برطانوی حکومت اپنے عروج پر بھی ان پہاڑیوں کے دروں اور لوگوں پر کبھی اپنا مکمل تسلط نہیں جما سکی۔ بیسویں صدی کے اوائل کے ہندوستانی وائسرائے، لارڈ کرزن نے ان حقائق کو تسلیم کیا اور باقاعدہ طور پر قبائلی علاقے کو باقی ہندوستان سے کاٹ دیا تاکہ یہ سرحدی علاقہ ہی رہے جو پوری تاریخ میں اس کا کردار رہا ہے۔

ب۔ خلاصہ تاریخ

گندھارا یا بونستان پہلی دفعہ تاریخ میں چھٹی صدی ق م میں

نمودار ہوتا ہے۔ جب یہ داریوش، مس سٹس کی ایرانی سلطنت کے صوبہ اراکوشیا کا ایک حصہ تھا۔ اس میں پشاور اور مردان کے موجودہ اضلاع، کوہاٹ کا حصہ، ہمند علاقہ، سوات، باجوڑ اور یمنیر شامل تھے۔ اس کا دارالحکومت مختلف اوقات میں پرنس پورہ یا پشاور اور پشکالاوتی رہا جو پشاور کے شمال میں چند میل کے فاصلہ پر تھا۔ گندھارا کے لشکر زرمیر کے حملہ یونان میں شامل تھے اور ہیروڈوٹس، ٹالمی (بطلیموس) اور سٹریبو اس کے لوگوں کو گندھارائی یا گندھاری پکارتے ہیں۔

یونانی

سکندر اعظم نے ہندوکش کے بڑے سلسلے کو ۳۲۷ ق م کے موسم بہار میں عبور کیا اور اپنی فوجوں کو تقسیم کر کے سرحدی پہاڑیوں میں داخل ہوا۔ وہ خود ایک دستے کے ساتھ دریائے کنر سے اُپر گیا اور ہمند علاقہ اور دیر سے گزرنے والے کسی درے سے سوات میں داخل ہوا۔ دیگر دستے خیبر سے گزرے اور مزید کچھ اور دریائے کابل کی گھاٹی سے دوسری طرف سکندر نے پانچ چھ سخت معرکے لڑے اور علاقے کو

۱۔ خلاصہ تاریخ مختلف ذرائع پر مبنی ہے لیکن زیادہ تر استفادہ کیمبرج

ہسٹری آف انڈیا، چھ جلد سے کیا گیا ہے (کیمبرج یونیورسٹی پریس ۱۹۳۷ء)

اور بیان ہذا عموماً اسی کے عین مطابق ہے۔

فنج کر کے اس نے میکا ٹور (نکا ٹور) کو بطور خستراپون پھوڑا اور اٹک کے قریب سندھ کو عبور کر کے ہندوستان کی طرف بڑھنے لگا۔

دس سال کے اندر اندر گندھارا سکندر کے نابین سے آزاد ہو گیا گو بالائی وادی کابل سیوکس کے قائم کردہ یونانی خاندان کے ماتحت رہی۔ ہندوستان کے پہلے عظیم مقامی حکمران چندر گپت موریانے گندھارا کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور اس کے پوتے اشوک نے بدھ مت کو لوگوں کا اکثریتی مذہب بنا دیا۔

اشوک کی موت کے بعد یونانی ایک دفعہ پھر باختر موجودہ افغان شہر بلخ) سے یہاں وارد ہوئے اور پہلے ڈیمیٹروس اور پھر یوکرٹائیڈ نے گندھارا پر حکومت کی۔ دوسری صدی ق م کے وسط کے قریب باختریوں کی حکومت ملوک الطوائف میں بٹ گئی جن کے یونانی نقوش اور نام اب بھی وادی پشاور میں بکثرت پائے جانے والے بے شمار ہر وضع کے سکوں پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

ان باختریوں پر جلد ہی وسط ایشیا سے آنے والے پارٹھیوں اور ساکوں نے حملہ کر دیا۔ باختری بالآخر سن عیسوی کے اوائل کے قریب کشانوں سے مغلوب ہو گئے جو وسط ایشیائی خانہ بدوشوں کی ایک سخت جان نسل یوچی کا طاقتور ترین طائفہ تھے اور جن کے مشہور ترین بادشاہ کنشک نے شمال مغربی ہندوستان میں ایک سلطنت قائم کی جو وادی پشاور میں مرکوز تھی۔ یوچی کے مختلف طائفے اس

وادی پر بالادست رہے حتیٰ کہ غالباً چھٹی صدی عیسوی میں ایچتھے
لائٹ یا سفید ہٹوں نے ایران کے ساسانیوں کے ساتھ جنگ کے
دوران یہاں بھی یوچی کا صفایا کر دیا۔

سفید ہٹوں نے یونانی و بدھ ثقافت کو تہ و بالا کر دیا جو سکندر
موریلوں، باختریوں اور کشانوں کی آویزش و آمیزش سے ظہور پذیر ہوئی
تھی۔ اس ثقافت کو عموماً گندھارا کے نام سے پہچانا جاتا ہے اور
اس کے تعمیر کردہ و ہار و انحصار سینکڑوں سال تک اس علاقے میں
پھلتے پھوٹتے رہے۔ چینی بدھ یا تری، فاہین، ۶۴ء میں گندھارا
آیا تو وہ یہاں کے و ہاروں (خانقاہوں) کی دولت و ثروت اور
ترقی و ترقی دیکھ کر ششدر رہ گیا لیکن جب ایک اور چینی سیاح
ہیون سانگ آٹھویں صدی کے وسط میں گندھارا سے گزرا تو
اسے صرف ویران کھنڈرات ہی نظر آئے۔

اگلے تین سو سال کے دوران جب اسلام کی بنیاد ڈالی گئی
اور بہ مشرق کی طرف پھیلنے لگا تو سرحد چھوٹے چھوٹے ہندو راجوں
اور وسط ایشیائی خانہ بدوشوں کے سرداروں کے درمیان میدانِ
جنگ بنا رہا۔

آٹھویں صدی کے آخر تک اسلام نے بحیرہ عرب کے ساحل
سے سندھ پر اپنا اثر و رسوخ قائم کر لیا تھا لیکن دسویں صدی
میں مسلمانوں کے ایک ترک خاندان نے جس نے شاہانِ سامانی کی خدمت

کی تھی۔ غزنی (افغانستان) میں اپنا اڈہ جما لیا جو سرحدی پہاڑیوں سے دیکھا جاسکتا ہے۔

محمود غزنوی

اسی خاندان کا ایک چشم و چراغ محمود ۹۹۸ء میں سلطان غزنی بنا۔ جس کا باپ اس سلطنت کی توسیع کے لئے ایک سلسلہ فتوحات شروع کر چکا تھا۔ محمود نے بغداد کے خلیفۃ المسلمین سے سند سلطنت حاصل کر لی اور اس کے فوراً ہی بعد اس نے ہندوستان پر یکے بعد دیگرے اپنے حملے شروع کئے جن کی بنا پر وہ ”بُت شکن“ مشہور ہوا۔ محمود کی پہلی بڑی لڑائی ۱۰۰۱ء کے موسم خزاں میں پشاور کے قریب ہی ہوئی۔ جس میں اس نے راجہ جے پال کو شکست دی۔ پانچ سال بعد اس نے اس کے جانشین انند پال کو اسی مقام پر شکست دی اور سرحد کو اپنی سلطنت کا حصہ بنا لیا۔

محمود کے دور میں ہی افغانوں کا نام من حیث القوم پہلی دفعہ منظر تاریخ پر آیا جو غزنی اور کوہ سلیمان کے درمیان کی پہاڑیوں میں آباد تھے۔ اسلام پہلے ہی ان پہاڑیوں میں کسی حد تک نفوذ کر چکا تھا اور گودہ پہلے محمود کے خلاف تھے تاہم قبائل جلد ہی ”بُت شکن“ کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے اور اسلام کے نام پر خوشی خوشی اس کے ہندوستانی حملوں میں شریک ہو گئے۔

محمد غوری

جب دریائے کابل کے شمال میں غزنی سے چند سو میل دور واقع غور کے جنگجو سردار محمد نے ۱۱۷۳ء میں غزنوی سلطنت کے بچے کچھے حصوں پر قبضہ جمایا تو پہاڑی قبائل نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ بعض مصنفین کے مطابق محمد غوری خود بھی ایک افغان تھا لیکن عام طور پر اسے ایک مشرقی ترک سمجھا جاتا ہے۔ محمد نے ۱۱۷۹ء میں پشاور پر تصرف جمایا اور اہل کوہ نے شہر کی لوٹ مار میں بھی یقیناً حصہ لیا اور ہندوستان پر محمد کے دیگر حملوں میں بھی۔

محمد غوری کے وفات کے بعد اس کا بانشین تاج الدین یلدوز وادی کرم سے غوری سلطنت پر حکومت کرتا رہا۔ ۱۲۱۵ء میں خیوا کے ترک سلطان نے تاج الدین کو ہندوستان میں دھکیل دیا۔ لیکن وہ سرحد میں بھی چنگیز خان کے سامنے نہ ٹھہر سکا جس نے ۱۲۲۱ء میں اپنے منگولوں کے ساتھ ہندوستان پر پہلی یورش کی۔ اگلی دو صدیوں میں زور آور افغان قبائل نے اپنے سنگلاخ علاقے سے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے منگول لشکروں کو آتے جاتے خوب تنگ کیا اور سرحد پر قبضہ جانے کے لئے ترک سلاطین دہلی کی کوششوں کو ناکام بنا دیا جو محمد غوری کی سلطنت کے مشرقی حصوں کے وارث بنے تھے۔

تیمور

تیمور لنگ ۱۳۹۸ء میں ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے سمرقند سے نکلا۔ اس نے چترال کوٹہ و بالاکا اور پنجاب میں سے دندناتا ہوا دہلی پہنچا اور اسے لوٹا۔ وہ ۱۳۹۹ء میں بنوں کے راستے واپس ہوا۔ افغان جواب اپنے پہاڑی اڈوں سے نکل کر کوٹہ اور بنوں کے ارد گرد قلعے بنا چکے تھے تیمور کے سفر واپسی میں بری طرح حائل ہوئے۔

تیمور نے شمالی ہندوستان کو انتشار و خلفشار میں چھوڑا۔ بعد کے سالوں میں کئی سرداروں نے علاقے کے مختلف حصوں میں اپنی اپنی حکومتیں قائم کیں۔ انہی میں سے ایک مشہور ترین سردار افغان بہلول لودھی تھا۔ ۱۴۵۱ء میں بہلول نے دلی پر قبضہ کیا۔ اور ایک افغان خاندان کی بنیاد ڈالی جو ۷۵ سال تک حکمران رہا پوری افغان نسل اس کے وقار میں شریک رہی اور زیادہ سے زیادہ افغان افغانستان کی سطوح مرتفع سے سرحدی پہاڑیوں اور پھر یہاں سے ہندوستان میں وارد ہوتے رہے۔ اس نقل مکانی کو اس وجہ سے مزید تقویت ملی کہ تیموری خاندان کا ایک نمائندہ الغ بیگ کابل پر حکمران تھا اور یوں مغرب سے دباؤ بڑھ گیا تھا۔

بابر

تیمور کے اخلاف میں سے ایک اور فرمانہ سے وسط ایشیا میں نمودار ہوا۔ یہ بابر تھا، ہندوستان کی مغلیہ سلطنت کا بانی، جو کابل میں مدفون ہے۔ بابر نے ۱۵۰۴ء میں کابل پر قبضہ کیا اور جنوری ۱۵۰۵ء میں اس نے ہندوستان پر پہلا حملہ کیا۔ وہ درہ خیبر، کوہاٹ اور بنوں سے ڈیرہ جات میں آیا۔ کوہاٹ سے باہر اس نے ایک قبائلی کمین گاہ کو تباہ کیا اور یہاں بھی اور مانگو میں بھی اس نے اپنے لوگوں کی رسم کے مطابق شکست خوردہ دشمنوں کے سروں کے مینار بنائے۔ بنوں میں ایک اور خونیں مینار کھڑا کیا گیا لیکن یہاں بابر نے اپنے بعض دشمنوں کو معاف کر دیا جو اپنے دانتوں میں گھاس لے کر اس کے سامنے حاضر ہوئے گویا وہ اس کی گائیں تھیں۔ روز روشن میں افغانوں کو مارتے ہوئے اور تاریکی شب میں ان سے مار کھاتے ہوئے اس نے عید الفطر گول کے کناروں پر منائی۔ اپنے بابر نامہ میں وہ اپنی فوج پر ان سرکف افغانوں کے انفرادی حملوں کا بہت احترام سے ذکر کرتا ہے۔

✽ ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ، بابر نامہ، مترجمہ اے ایس بیوریج، ۴ جلدیں،

ایک جلد میں مکمل (لندن، لوزاک ۱۹۲۲ء) ص ۲۶۹ تا ۲۸۰

مئی ۱۵۰۵ء تک بابر کابل واپس چلا گیا اور اپنے آباؤ اجداد کی شکستہ و ریختہ سلطنت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے تگ و دو کرنے لگا۔ اکتوبر ۱۵۱۱ء میں اس نے سمرقند میں اپنی بادشاہت کا اعلان کیا اور اس کی حکومت بخارا، تاشقند، قرغانہ اور کابل پر قائم ہو گئی۔

جنوری ۱۵۱۹ء میں بابر سرحدی پہاڑیوں سے گزرتا ہوا باجوڑ پہنچا۔ اپنی بندوقوں کا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے جنہیں افغانوں نے کبھی نہ دیکھا تھا اس نے علاقے کے بڑے قلعے پر حملہ کیا اور اس کے اپنے اندازے کے مطابق اس نے نین ہزار مرد بابتلے موت کے گھاٹ اتار دیئے اور ان کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنالیا۔ بابر نے ایک یوسفزئی سردار کی بیٹی بی بی مبارک سے شادی کی، صوابی میں گینڈوں کا شکار کیا، اٹک کے قریب ایک شیر مارا، سندھ پار کر کے ایک چھوٹا سا حملہ کیا اور اپریل میں واپس کابل چلا گیا۔ اس نے بعد میں کئی حملے کئے جن کے دوران اس نے پنجاب پر نیا تسلط جمایا اور ۲۰ اپریل ۱۵۲۶ء کو دہلی کے قریب پانی پت کے میدان پر لودھی سلطان کے لشکر کو شکست دے کر ہندوستان کی عظیم سلطنت مغلیہ کی بنیاد ڈالی۔

۱۵۳۰ء میں اس کی وفات تک سرحد پر بابر کا قبضہ برائے

نام ہی تھا۔ پھر افغانوں نے فوراً ہی بغاوت کر دی اور یہ علاقہ

کبھی ایک اور کبھی دوسرے افغان سردار کے تحت رہا سوائے ۱۵۵۲ء

تا ۱۵۵۶ء کے مختصر عرصہ کے جب بابر کا بیٹا ہمایوں پشاور پر قابض

رہا۔

شیرشاہ سوری

ان افغان سرداروں میں عظیم ترین، شیرشاہ تھا، سور قبیلے

کا جو بہار کے ایک گنہام ضلع کی جاگیر داری سے اٹھ کر قریباً پورے

شمالی ہند کا شہنشاہ بن گیا۔ ۱۵۴۰ء میں شیرشاہ نے جس کا دادا

پشاور کے قریب سے ہجرت کر کے دہلی کے لودھی سلاطین کے صیغہ

ملازمت میں چلا گیا تھا۔ ہمایوں کو گنگا کے کنارے پر شکست فاش دی

اس کے بعد وہ پانچ مختصر سالوں کے لئے حکمران رہا جسے کہ ایک

بارودی دھماکے میں مارا گیا۔ ان پانچ سالوں میں اس نے اپنی

براہ راست نگرانی میں ایک بے حد کارگزار افسر شاہی قائم کی

جیسی اس کے بعد کبھی نہ دیکھی گئی جسے کہ برطانوی حکومت کے عروج

پر پھر نظر آسکی۔ محصولاتی نظام اس طرح ترتیب دیا گیا کہ تجارت

کو فروغ حاصل ہو۔ زمینی رگان کے نظام کی اصلاح کی گئی۔ پولیس

اور عدالتی نظام از سر نو منظم کئے گئے۔ ٹیکس سختی لیکن انصاف

سے وصول کئے جانے لگے۔ سٹرکوں کا ایک حیرت انگیز جال بچھا دیا گیا
اور ہندوستان پشاور تا بنگال اپنی مشہور جرنیلی سٹرک کیلئے
شیرشاہ کا ہی مرہونِ منت ہے۔

مغل

شیرشاہ کی موت کے بعد اس کی سلطنت کا شیرازہ بہت
جلد ہی بکھر گیا کیونکہ اس کے متعلقین و نائبین مالِ غنیمت پر لڑتے
رہے۔ ۱۵۵۶ء میں عظیم ترین مغل، اکبر اپنے والد سہایوں کا جانشین
ہوا۔ لیکن اکبر بھی ۱۵۸۵ء سے پہلے پشاور پر اپنی شاہی گرفت
قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا جب اس نے اپنے راجپوت
جرنیل کنورمان سنگھ کو دہاں گورنر لگایا۔ اگلے ہی سال
قبائلیوں نے پیر روشن کی تعلیمات سے مشتعل ہو کر جس نے کوئی
چالیس سال پہلے سرحد میں ایک محلانہ فرقت کی بنیاد ڈالی تھی
علم بغاوت بلند کر دیا۔ مہمند جنوب کی طرف بڑھے، خیر کو بند کر دیا
اور مان سنگھ اور اس کے راجپوتوں کو پشاور سے نکال باہر کیا۔
۱۵۸۷ء میں اکبر خود ایک لشکرِ جرار کے ساتھ سرحد آیا تاکہ باغیوں
کی سرکوبی کر سکے۔ اس نے ایک فوج اپنے قابل اور بااعتماد مشیر
بیریل کے تحت سوات اور باجوڑ میں بھیجی جسے یوسفزیوں نے
تباہ کر دیا اور آٹھ ہزار مغل مارے گئے۔ باآ خر ٹوٹ رمل نے جو

اکبر کا ایک عظیم ہندو جرنیل تھا، کسی نہ کسی حد تک امن و امان قائم کیا جس نے ناکہ بندی مؤثر ہتھیار سے قبائلیوں کے خلاف جوابی کارروائی کی لیکن پھر بھی قبائل نظم و نسق کے مضبوط رشتہ میں نہ پروئے جاسکے۔

اس کے بعد قبائلی مغلوں سے تقریباً مسلسل برس پیکار رہے ۱۶۲۰ء میں انہوں نے ایک اور محل لشکر کو تباہ کر دیا جو تیراہ بیر حملہ کی کوشش کر رہا تھا جہاں پر روشن کے مرید جمع ہو گئے تھے۔ ۱۶۲۷ء میں مشہنشاہ جہانگیر کی موت پر ایک عام بغاوت ہو گئی ۱۶۳۳ء میں پشاور کی شاہی فوج کئی مہینے محصور رہی۔ ۱۶۳۲ء اور ۱۶۶۰ء میں محل افواج نے تیراہ پر قبضے کی ناکام کوششیں کیں۔ ۱۶۶۷ء میں یوسفزیوں نے شرق سندھ کے ضلع ہزارہ پر حملہ کیا اور مغلوں کے مرکز رسل و رسائل کو خطرہ پیدا ہو گیا۔

۱۷ویں صدی میں پہاڑیوں میں آبادی بہت تیزی سے بڑھ رہی تھی اور شاید ہی کوئی ایسا سال گزرا کہ مغلوں کو ہندوستان میں اپنی سلطنت کے استحکام سے نظر ہٹا کر سرحدی پہاڑیوں میں کسی نہ کسی بغاوت کا سامنا نہ کرنا پڑا ہو۔ انہوں نے وہ تمام طریقے استعمال کئے جنہیں انگریزوں نے ۲۵ سال بعد اختیار کیا یعنی وظائف ناکہ بندی، متحرک رستے، بڑی بڑی قلعہ بند افواج۔ ان میں

۱۶۵۸ تا ۱۷۰۷ء میں قبائل کے لئے منان وظائف تقریباً ۶ لاکھ روپے سالانہ تھے

کوئی بھی کامیاب نہ ہوا اور جیسا کہ بعض مورخین کا خیال ہے کہ مثل سلطنت اسی وقت سر جھانے لگی جب یہ اپنے مضبوط وسط ایشیائی سرچشموں سے کٹ گئی تو اس صورت میں سرحدی قبائلیوں نے اسے موت کی نیند سلانے میں اہم کردار ادا کیا۔

برسبیل تذکرہ یہ قابل ذکر ہے کہ پٹھانوں نے اپنی سرگرمیاں صرف اپنے ہی علاقے تک محدود نہیں رکھیں۔ محمود غزنوی کے زمانے سے پٹھان افراد اور خاندان ہندوستان کی طرف ہجرت کرتے رہے تھے۔ دہلی کے افغان سلاطین کے تحت مشمولہ بہ

دور شیر شاہ سوری اسے ایک تازیانہ لگا۔ مثل دور میں بھی یہ جاری رہی اور اٹھارھویں صدی میں نادر شاہ اور احمد شاہ کی مختصر لیکن بسیط فتوحات سے پیدا ہونے والے انتشار و خلفشار میں یہ اور بھی بڑھ گئی۔ اپنی سرحدوں سے باہر پٹھانوں کی کامیابی کی نمایاں مثالیں ٹونک اور رھیل کھنڈ کی ریاستیں تھیں جن کے حکمران اپنے پٹھان ماخذ کی روایات کو سختی سے برقرار رکھتے تھے آج بھی بعد کے ہندوستان کے متعدد چھوٹے چھوٹے اشراف و اکابر اپنے پٹھان حب و نسب پر فخر کرتے ہیں۔ لیکن ان تارک وطن پٹھانوں کی سرگرمیاں اس کتاب کے احاطہ سے باہر ہیں۔

عظیم بغاوت

۱۶۷۲ء کے موسم بہار میں کابل کا منغل گورنر روانہ ہوا تاکہ پایہ تخت دہلی کے ساتھ رسل و رسائل کو یقینی بنا سکے، اس نے خیبر سے اپنی فوج گزاری جہاں آفریدی بار بار شاہی حق آمد و رفت کو سلب کر رہے تھے۔ ان قبائلیوں نے اس فوج کو یکیم مئی کو علی مسجد پر محصور کر لیا، فراہمی آب بند کر دی اور پھر پہاڑوں سے اس پر پلوٹ پڑے۔ انہوں نے دس ہزار منغل سپاہی مار دیئے، ۲۰ ہزار آدمی اور عورتیں قید کر لئے جن میں گورنر کی والدہ، بیوی اور بیٹی بھی تھیں اور دو کروڑ روپے کا مال غنیمت لوٹا۔ ان کے ممتاز سردار امیل خان نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور منلوں کے خلاف اعلان جہاد کر دیا۔ انہوں نے قندھار تک پورا علاقہ ان کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ (امیل کے لئے اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی کہ منغل اس وقت قبائلیوں کی نسبت بہتر مسلمان تھے!)

صاحب سیف و قلم، خوشحال خان خٹک، جو عظیم خٹک قبیلہ کا سردار تھا جس کی زمینیں سندھ کے مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ مردان تا بنوں محیط تھیں، امیل سے جا ملا اور منلوں کے خلاف قبائل کو متحد کرنے کے لئے ایٹری جوٹی کا زور لگانے لگا۔

۱۶۷۳ء میں قبائلیوں نے ایک اور منغل لشکر کو گنداب

پیر شکست دی۔ مارچ ۱۶۷۴ء میں انہوں نے دہلی میں ایک اور فوج کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور باقی ماندہ مغلوں کو باجوڑ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔

اس صورت حال میں شہنشاہ اورنگزیب خود سرحد آیا جیسے کہ اس کا پڑدادا اکبر ایک سو سال پہلے آیا تھا۔ اورنگزیب نے حسن ابدال میں اپنا ڈیرہ جایا جو سندھ سے اکتیس میل مشرق میں ہے اور شیواجی کے تحت مرہٹوں کی طرف سے اس کی سلطنت کو متوسط ہند میں درپیش خطرے کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ ڈیرہ سال یہاں ٹھہرانا کہ قبائلیوں کے خلاف کارروائیوں کی ذاتی طور پر نگرانی کر سکے۔

اورنگزیب کے ترک جرنیل، اولیغورخان نے غلزنئیوں، شیرانیوں، یوسفزئیوں اور مہمندوں پر چھاپے مارے، ان کے علاقوں کو لوٹا اور ان کے گاؤں جلا دیئے حتیٰ کہ وہ ایک علامتِ ہشت بن گیا جیسے ۱۵ سال بعد ہری سنگھ کو نیتا تھا۔ تھوڑے عرصے کے لئے قبائل دم بخود رہے۔ اولیغور خیر نہ کھول سکا اور علی مسجد کے قریب ایک لڑائی میں شکست کھا گیا۔ جون ۱۶۷۵ء میں ایک اور محل فوج کو باجوڑ میں شکست ہوئی۔ مغلوں کو جنوب میں درہ جگہ الگ سے بھی پسپا ہونا پڑا جسے اورنگزیب خیر بند ہونے کے بعد کابل سے رابطہ قائم رکھنے کے لئے استعمال کرتا تھا۔

اورنگزیب کی قبائلی پالیسی

پھر بھی ۱۶۷۵ء کے اواخر تک اورنگزیب نے اتنا قابو پایا تھا کہ وہ دہلی واپس جاسکا۔ اس نے یہ زور شمشیر سے زیادہ تحسنِ تدبیر سے حاصل کیا بہت سے قبائل و ظائف کے ذریعے جیت لئے گئے۔ قبائلی سرداری کے مخالف و عویداروں کی سرپرستی کی گئی۔ غیر فحتم بھی الگروہی حسد و بداعتما دی کو خوب ہوا دی گئی۔ شاہی جاسوس جبرگوں میں نفوذ کر گئے۔ بھائی کو بھائی کے خلاف رشوت دی گئی اور بیٹے کو ابھارا گیا کہ وہ باپ کو محروم اقتدار کر دے۔ اورنگزیب کی روانگی تک صرف آفریدیوں اور خشکوں کا اتحاد ہی قائم رہ سکا۔

اورنگزیب کی پالیسی کو کابل کے فطین گورنر، امین خان نے جاری رکھا جو ۱۶۷۷ء تا ۱۶۹۸ء اس منصب پر رہا۔ امین خان قبائلیوں کے اندرونی معاملات میں بھی دخل ہوا اور نہایت پرکاری سے ان کی قوتوں کو بین الاقوامی مناقشات کی راہوں پر ڈالتا رہا اور وظائف بھی پانی کی طرح بہاتا رہا۔ اس نے قبائلی وفاق منظم کرنے کے سلسلہ میں امیل خان کی آخری کوشش کو بھی یوں ناکام بنا دیا کہ قبائلی سردار لڑائی سے پہلے لوٹ مار کی تقسیم کا مقابلہ کرنے پر اڑ گئے۔ وہ آفریدیوں اور خشکوں کے درمیان تفرقہ اندازی

کے لئے انتھک کام کرتا رہا اور جب اہل خانہ مرا تو آفریدیوں نے مغلوں کے خلاف جنگ کو خیر باد کہہ دیا۔ خوشحال خان اکبر نے بیٹوں کی غداری، اٹھادیوں کی علیحدگی اور مغلوں کے مسلسل تلوار قہ کے باوجود کئی سال تک لڑتارہا حتیٰ کہ ۱۶۹۱ء میں وہ قابلِ فخر اور خودارموت کی آغوش میں چلا گیا۔

انگریزوں کی لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی نہ طبعاً

نہی نہ بے مثال لیکن برف مزاج مغل نے اسے اپنے پیشرووں اور جانشینوں کی نسبت حتیٰ کہ انگریزوں کے مقابلے پر بھی زیادہ ثابت قدمی اور سائنسی طریقے سے لاکو کیا۔ اس پالیسی نے سرحد پر تو لا قانونی پھیلا دی لیکن مغل سلطنت کو تحفظ حاصل ہو گیا۔ کابل کے مواصلاتی راستے کھلے رکھے گئے اور قبائلی کبھی اتنے متحد نہ ہو سکے کہ وہ ایک مہیب بغاوت کر سکتے اور ہندوستان کے زرخیز صوبوں کے لئے خطرہ بن جاتے۔ لہذا یہ پالیسی بعد کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ ایک دقیانوسی پس منظر سے اچھڑتے ہوئے قبائلی لوگوں کے درمیان قدرتی داخلی شبہات و اختلافات کو دیدہ و دانستہ ہوا دیکر اس پالیسی نے اس امکان کو بہت حد تک ختم کر دیا جو قبائلیوں میں قومی روح پیدا کرنے کے سلسلے میں موہوم طور پر موجود ہو سکتا تھا۔ ارد گرد کے نسبتاً ترقی یافتہ علاقوں سے سرحد کا الگ تھک پن دائمی بنا کر اور رنگ زریب نے ایک

قسم کے ملک بے ملک کا وجود یقینی بنا دیا جو آج تک قائم ہے۔
ایک ایسی سرزمین جس کے لوگ حرف کسی بھی اور تمام غیر ملکیوں
کے خلاف مشترکہ محاصرت سے ہی متحد ہیں۔

۱۷۰۷ء میں اورنگزیب کی وفات کے بعد مغل حکومت
ہندوستان بھر میں بہت تیزی سے انحطاط پذیر ہو گئی۔ اٹھارہویں
صدی کے پہلے راجہ شہنشاہ شہنشاہ شہنشاہ شہنشاہ شہنشاہ
گئے۔

نادر شاہ

مغرب سے ایک اور فاتح کی آمد کے لئے وقت سازگار
تھا۔ یہ نادر شاہ ترکستان کا ایک افسار ترک تھا۔ ۱۷۰۳ء کے بعد
نادر شاہ نے محمود شاہ غلزی کو تخت ایران سے دھکیل دیا۔ محمود
نے اسے اٹھارہویں صدی کے شروع میں آخری صفوی بادشاہ
سے چھینا تھا۔ ۱۷۲۶ء میں نادر نے شہنشاہ ایران ہونے کا
اعلان کیا اور اگلے سال محمود کی سرزنش کے لئے مشرق کی طرف
روانہ ہوا جو ایک قندھاری افغان قبائلی تھا۔ ایک لمبے محاصرے
کے بعد نادر نے شہر پر قبضہ کیا اور جون ۱۷۳۸ء میں کابل فتح
کر لیا۔ کابل میں پہنچا تو وہ اپنا اصلی مقصد بھول گیا اور فتوحات
کی روایتی شاہی سڑک پر چل پڑا۔ وہ نومبر ۱۷۳۸ء کے آخر

میں خیبر پہنچا اور ۲۶ کو کابل کے پناہ گزین مغل والی کو مغلوب کر لیا، جس نے قلعہ جہرود پر ۲۰ ہزار افغان تنخواہ دار فوج کے ساتھ نادر کا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی۔ نادر نے پشاور پر قبضہ کیا اور سندھ پار کرنے کے لئے اٹک کی طرف چلا۔ شمالی ہندوستان میں غیر منظم مغل اس کے سامنے بتر بتر ہوتے گئے۔ اور اس نے دہلی میں مارچ تا مئی ۱۷۳۹ء ڈیرے جمائے رکھے۔

اس نے مغل دار الحکومت سے ناقابل یقین مال عنیمت لیا جس میں تخت طاؤس بھی شامل تھا اور یہ بھی اعلان کیا کہ وہ غرب سندھ کے مغل صوبہ کا احاطہ کر رہا تھا۔ بے آبرو مغل شہنشاہ کو حکومت کرنے کے ڈھنگ پر ایک ناصحانہ لیکچر پلانے کے بعد اس نے دار السلطنت پر قبضہ کی پیش کش کو ٹھکرا دیا، اور واپس ایران روانہ ہوا۔ واپسی پر آفریدیوں نے خیبر بند کر دیا اور فاتح دہلی کو ایک مفرد اور کڑی نے تیراہ کے چور راستوں سے نکالا۔

احمد شاہ

نادر کی سلطنت ۱۷۴۷ء میں اس کی موت کے فوراً ہی بعد ٹوٹ پھوٹ گئی۔ اس کے ایک احمد نامی نائب نے جو ابدالی قبیلہ کے سدورئی طائفہ کا افغان تھا، ایک چھوٹی سی فوج اکٹھی کی اور اپنے ملک میں واپس چلا گیا۔ احمد نے قندھار پر قبضہ کیا اور

اسے اپنا دارالحکومت بنایا۔ ۱۷۴۸ء میں وہ شاہِ افغانستان بنا اور
دُرّ درانی کا لقب اختیار کیا۔ جس کی بناء پر ابدالی قبیلہ دُرّانی کہلانے
 لگا۔ احمد شاہ نے ہندوستان پر حملوں کی تاریخی ریت قائم رکھی اور جنوری
 ۱۷۶۱ء میں تیسری جنگِ پانی پت میں اس نے مرہٹہ وفاقہ کو تباہ کر
 دیا، جو ہندوستان میں غالب طاقت کی حیثیت سے مغلوں کے
 جانشین بن گئے تھے۔

لیکن احمد شاہ کی اصل دلچسپی غربِ سندھ میں واقع اپنے ہی
 ملک میں تھی۔ اس نے کئی سو سال کے دوران دادئی پشاور کو پہلی
 دفعہ قدرے دیرپا نظم و نسق دیا۔ اس نے دُرّانیوں کو افغانستان کا
 مضبوط حاکم قبیلہ بھی بنا دیا۔ اس کے بیٹے تیمور شاہ کے تحت دُرّانی
 طاقتوں اور سرداروں کے درمیان خانہ جنگی نے ایک دفعہ پھر راجی
 کیفیت پیدا کر دی، ۱۷۹۱ء میں پشاور میں تیمور پر قاتلانہ حملہ کیا
 گیا اور بعد کی انتقامی کارروائیوں میں بہت سے سرحدی سردار
 بالخصوص ہندوستان پر منحرف ہو گئے۔ تیمور دو سال بعد
 فوت ہو گیا، اور اس کے تین بیٹوں نے جنگِ تخت نشینی کی بناء
 پر دُرّانی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

محمد زنی عروج،

سردوزنی کا خاندانی جھگڑا ۱۸۱۸ء میں ختم ہوا جب دُرّانیوں

کے برکزی طائفہ کے محمد زئی خاندان نے بغاوت کر دی۔ اس بغاوت کے سرغنہ تین بھائی تھے، فتح خان، محمد عظیم اور دوست محمد جو محمد خاندان کے مورث پائند خان کے بیٹے تھے جسے چند سال پہلے ایک سدوز حکمران نے تختہ دار پر لٹکا دیا تھا۔ محمد زئیوں نے ساہا سال کی لڑائی کے بعد کشمیر اور پشاور تک اپنی سلطنت کو وسعت دی۔ گو سدوزی ڈیرہ اسماعیل خان میں جمے رہے تاہم دوست محمد ۶ ۱۸۲۶ء میں تخت کابل پر متمکن ہو گیا۔ پائند خان کے چار اور بیٹے سلطان محمد خان، یار محمد خان، سید محمد خان اور سیر محمد خان پشاور کے بالاشترک وائسرائے بنے اور سرحدی دارالحکومت درانی سلطنت کا ایک جزو لاینفک بن گیا۔

سکھ:

دریں اثناء سکھ رنجیت سنگھ کے تحت پنجاب پر قابض ہو چکے تھے اور بہت تیزی سے شمال اور مغرب کی طرف اصلی درانی سلطنت کے دیگر حصوں کو قبضہ کر رہے تھے۔ ۱۸۱۳ء میں سکھوں نے اٹک پر قبضہ کیا اور سندھ پاراضلاع پر چھاپے مارنے لگے۔ ۱۸۱۸ء میں رنجیت ایک فوج کے ساتھ پشاور میں داخل ہوا لیکن قبضہ قائم رکھے بغیر واپس چلا گیا۔ اسی سال ڈیرہ اسماعیل خان پر بھی مختصر سا قبضہ جمایا گیا۔ ۱۸۲۳ء میں سکھوں نے میدان بنوں پر اپنی سالانہ

بورشیں شروع کیں۔

رنجیت خود ۱۸۲۳ء میں سرحد واپس آیا اور نوشہرہ کے قریب ایک لڑائی میں متحدہ افغان و قبائلی فوج کو شکست دے کر پشاور پر باقاعدہ قابض ہوا، لیکن اس نے درانی سرداروں کو ہی اپنے واسطے رہنے دیا۔ سات سال کی بد نظمی کے بعد مقامی قبائل برطانوی ہند کے ایک کٹر مسلمان سید احمد کی تبلیغ سے مشتعل ہو کر ایک دفعہ پھر سکھوں کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ ۱۸۳۰ء میں سید احمد اور ان کے پیروؤں نے قبائل کی پشت پناہی کی بناء پر پشاور پر قبضہ کر لیا جو کئی ماہ تک قائم رہا۔

مئی ۱۸۳۴ء میں سکھوں کا ایک بڑا لشکر پشاور میں داخل ہوا، سرداروں کو نکال باہر کیا اور ہری سنگھ کے تحت ایک مستقل فوج قائم کی گئی۔ اس پر مئی ۱۸۳۵ء میں دوست محمد ایک فوج کے ساتھ کابل سے آیا۔ سکھوں نے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے بہتر ارادہ کیخبر کے مشرقی سرے پر بھیج دیئے۔ مقامی قبائل غیر جانبدار رہے۔ کوئی لڑائی نہ ہوئی جو سیالپور یا پٹنہوینیا کا ایک معزز مہم جو تھا جو رنجیت سنگھ کے ہاں ملازم تھا۔ اس نے ریشہ دوانی اور رشوت بازی کا ایسا جال بچھایا کہ دوست محمد دام میں پھنس گیا اس کی تدبیریں لٹ ہو گئیں اور وہ ترے میں آگیا لہذا وہ فوراً ہی پسپا ہو کر کابل

چلا گیا ✖

۱۸۳۶ء میں سکھوں نے ڈیرہ اسماعیل خان کا باقاعدہ
 الحاق کر لیا اور سردوزئی نوابوں کے ساتھ وہی سلوک
 کیا جو پشاور میں محمد زئیوں کے ساتھ کیا گیا تھا۔ کوہاٹ میں بھی
 فوج تعینات کی گئی لیکن جونہی دوست محمد کی فوج اس کے بڑے
 بیٹے ابر خان کے تحت اپریل ۱۸۳۷ء میں خیبر میں نمودار ہوئی اسے
 فوراً خالی کر دیا گیا۔ اس دفعہ قبائل نے کابلی لشکر کا ساتھ دیا اور
 ہری سنگھ جمرو کے قریب ایک گھمان کی جنگ میں مارا گیا گو قلعہ
 پر قبضہ نہ ہو سکا۔

رنجیت سنگھ جون ۱۸۳۹ء میں مراٹو اس کی سلطنت میں
 قوت اور نظم و نسق باقی نہ رہا۔ لیکن پشاور میں اٹالوی جرنیل
 ایوی ٹیبل کے تحت ایک فوج رہی اور وہ ۱۸۳۸ء تا ۱۸۴۲ء
 یہاں سکھوں کی طرف سے گورنر رہا۔ وہ مقامی طور پر ”ابو طبلہ“

✖ ہولان کے کارنامے اس کی اپنی کتاب ”اے میموائر آف انڈیا اینڈ
 ادغانتان“ قلیڈ بلیکچم جے۔ ڈولین ۱۸۴۲ء ص ۶۲ تا ۱۶۱ اور
 چارلس مین کی ”نیرے ٹو آف ویرٹیس جرنیلان بلوچستان“ انھانتان اینڈ دی
 پنجاب، ۴ جلدیں (لندن ۱۸۴۱ء) جلد سوم ص ۳۳۵ تا ۳۴۵
 میں پڑھے جاسکتے ہیں۔

مشہور تھا اور اس نے ایسے جبر و تشدد سے حکومت کی کہ سرحد میں بھی اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ لوگ ہری سنگھ سے بھی زیادہ اس سے نفرت کرتے تھے اور دہشت کھاتے تھے۔ جاہلانہ اقدامات کے باوجود ایوی ٹیل پہاڑی قبائل کو مسخر نہ کر سکا اور علاقہ جیتنے مقامی سرداروں کو بطور جاگیرات بانٹ دیا گیا یا اپنی ہی قسمت پر چھوڑ دیا گیا اور سکھ فوجیں جب بھی موقع پاتیں محمولات وصول کرتے کے لئے چھاپے مارتیں۔

۴۰ - ۱۸۳۹ء میں سکھوں نے برطانوی حکومت کا ساتھ دیا جو کلکتہ اور بمبئی سے اٹھ کر پہلی جنگ افغان کے لئے آئی اور دوست خان کو تخت کابل سے محروم کر دیا۔ سرحد کا مستقبل جنگ کا ایک اہم مسئلہ تھا، لیکن خود اس علاقے پر لڑائی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ سکھوں کی بے ہنگم حکومت ۱۸۴۷ء تک سرحد پر قائم رہی جب سکھ سلطنت برطانوی حاکمیت کے ماتحت چلی گئی۔ اگلے دو سال تک سکھ انگریزوں کے باجگزاروں کی حیثیت سے حکومت کرتے رہے اور انگریز منتظمین ان کی مدد کرتے رہے۔ بالآخر ۳۰ مارچ ۱۸۴۹ء کے لاہور دربار میں انگریزوں نے براہ راست سرحد کا انتظام سنبھال لیا۔

باب دوم

لوگ

تعارف

پچھلے باب میں یہ کوشش کی گئی تھی کہ ۱۸۴۹ء تک سرحد اور اہل سرحد پر اثر انداز ہونے والے تاریخی واقعات کا خلاصہ تحریر کر دیا جائے لیکن یہ ابھی تک مکمل طور پر واضح نہیں ہو سکا کہ یہ لوگ کون اور کیا ہیں؟ خالص سائنسی لحاظ سے یہ شاید کبھی نہ ہو سکے۔ لیکن ہمارے موجودہ مقصد کے تحت یہ کہہ دینا کافی ہے کہ اہل سرحد واضح طور پر مختلف الماخذ ہیں۔ غالباً ان کے آباؤ اجداد میں اس علاقے کے ابتدائی آریا فاتحین شامل ہیں۔ مور زمان

✧ سرحد کے نسلیاتی مسئلہ پر ایک اچھا مختصر تبصرہ سی۔ کولن۔ ڈریو سی کی کتاب 'ادی پرائم آف دی نارٹھ ویسٹ فرنٹیئر' ۱۸۹۰ء تا ۱۹۰۸ء کمبریج دی یونیورسٹی پریس ۱۹۲۲ء کے صفحات ۲۷ تا ۴۶ پر مل سکتا ہے۔ اسی کتاب کے ضمیمہ سی میں کچھ بشریاتی اعداد و شمار بھی ملتے ہیں۔

کے ساتھ یونانی، ایرانی، ترک اور منگول حملہ آور جو سرحد سے گزرتے رہے اپنے خون کا اضافہ کرتے رہے۔ اہل سرحد پہلی دفعہ بطور "افغان" تاریخ میں محمود کے دور میں ظاہر ہوتے ہیں جو شرقِ غزنی میں کوہ سلیمان میں رہنے والے بیتاؤں فریب لوگ تھے۔ جیسے جیسے ان کی تعداد بڑھی اور وہ زور پکڑنے لگے تو ان کے اہم حصے بھی منظر عام پر آنے لگے۔ مثلاً پہلے باب کے تاریخی خلاصہ سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ لودھی اور درانی شرقاً جو مدہلی اور کابل کے تختوں پر جلوہ گر ہوئے سفید کوہ اور سلسلہ سلیمان کے اہل کوہ سے قدرے مختلف تھے۔

یہ نظریہ کہ سرحدی قبائل بنو اسرائیل کے گمشدہ قبائل تھے اور پشتو ایک سامی زبان ہے بعض برطانوی مصنفین کے ہاں بیسویں صدی تک قائم رہا حالانکہ علماً فضلانے بہت پہلے تصدیق کر دی تھی کہ زبان انڈو ایرانی ہے اور لوگ غیر سامی نسل کے ہیں مثلاً بنارڈ ڈورن کی کتاب "اے کورسٹو مسیحی آف دی پشتو اور افغان بینگوٹج" (سینٹ پیٹرز برگ۔ دی امپیریل اکیڈمی آف سائنسز ۱۸۴۷ء) ص ۱۱ (۲) اولف کیرو اپنی کتاب "دی پٹھانز۔ ۵۵۰ ق م تا ۱۹۵۷ء" لندن، سینٹ مارٹنز پریس، ۱۹۵۸ء میں یہ دلیل دیتا ہے کہ اچھے لاکٹ۔ یا سفید بن پٹھان مغلوں کے میں خصوصی طور پر اہم عنصر ہیں۔ ص ۸۱ تا ۹۰۔

پوری جمعیت کے ناموں میں اختلافات بھی تصویر کو سیدھا کر دیتے ہیں۔ سرحدی قبائلی اب بھی صحیح طور پر افغان کہلاتے ہیں گو یہ لفظ افغانستان کے تمام باشندوں کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جن میں سے اکثر اہل سرحد کے ساتھ کوئی نسلی تعلق نہیں رکھتے مغرب میں مانوس ترین لفظ پٹھان ہے جو ایک ہندی اصطلاح ہے جسے ان برطانیہ نے اختیار کر لیا اور جس سے مراد عموماً ڈیوڑھی لٹائن کے مشرق کی طرف رہنے والے لوگ ہیں۔ سرحد کے دونوں طرف کے اکثر لوگ اپنے کو پختون، پختون، پستون یا پستون کہتے ہیں۔ پہلے دونوں نام شمال کی سخت زبان اور آخری دونوں جنوب کی نرم فندھاری زبان میں استعمال ہوتے ہیں، لیکن بعض جیسے یوسفزئی لفظ افغان کو ترجیح دیتے ہیں۔ آسانی کے لئے اس پوری کتاب میں لفظ پٹھان ہی استعمال کیا گیا ہے سوائے ان مواقع کے جہاں سیاق و سباق کسی دوسرے نام کا متقاضی ہو۔

جساکہ لوگوں کے اپنے پسندیدہ نام سے ظاہر ہوتا ہے۔ تشخص کا عملی ترین معیار زبان ہے۔ تقریباً تمام لوگ پشتو بولتے ہیں (انگریزی میں جنوبی لفظ زیادہ استعمال ہوتا ہے بجائے شمالی پختون کے) یہ ایک مشرقی ایرانی زبان ہے۔ جو حتمی طور پر اس کے مغرب اور مشرق میں مستعمل فارسی اور اردو زبانوں سے مختلف ہے۔ پٹھان خود اپنے ماخذ کے متعلق ایک قطعی نظریہ رکھتے ہیں جو اپنی موجودہ شکل میں

موجود تھا۔ جب پہلا انگریز آرمیبل ماؤنٹ سٹوارٹ ایلفٹن ۱۸۰۹ء میں سرحدیں آیا اور اس نے ان سے ربط و ضبط پیدا کیا۔ یہ ایک قریباً یقینی افسانوی لیکن نمایاں طور پر مسلسل شجرہ نسب پر مشتمل ہے۔ جو پہلے اسرائیلی بادشاہ طالوت تک جاتا ہے۔ ہر صبح پٹھان اپنے گواہ اپنے آباد اجداد کو اسی عظیم شجرہ سے ماخوذ قرار دیتا ہے۔ ایسے آثار موجود ہیں کہ یہ شجرہ نسب کوئی ۴۰۰۰ سال پہلے ترتیب دیا گیا۔ تاہم یہ اس لحاظ سے گراں بہا ہے کہ اس کے ڈھانچے میں اس وقت کے اسی گروہ مردماں کے حقیقی حصے منعکس ہوتے ہیں اور اس وقت سے نسلاً بعد نسل کے حسب و نسب محفوظ ہیں۔ ان وجودات کی بناء پر اور اس لئے بھی کہ پٹھان اپنے شجرہ کے متعلق بہت سنجیدہ ہے۔ قبائل کی روایتی کہانی یہاں خلاصہ پیش کی جا رہی ہے۔

پٹھانوں کا ماخذ:-

نسل کے بانی قیس ہیں جو اسرائیلی طالوت کے سنتیوس جانشین

۱۔ دیکھیے ماؤنٹ سٹوارٹ ایلفٹن "این اکاؤنٹ آف دی کنگڈم آف کابل اینڈ اس ڈی پینڈنسیز ان پریشیا مارٹاری اینڈ انڈیا رنن ٹوگ مین سرٹ پریس اورٹے براؤن اور جے مرے ۱۸۱۵ء) ص ۱۵۸ تا ۱۶۰

۲۔ دیکھیے ہیوگ۔ آر۔ جیمز ریورٹ اوت دی سٹیمٹ آف دی پشاور (باقی اگلے صفحہ)

میں وہ ایک عابد و زاہد اور مجاہد انسان تھے جو ساتویں صدی کے
افغانستان میں غور کے پاس رہتے تھے۔ وہ ایک اولین مبلغ کے
ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہوئے اور بعد میں عرب گئے اور آنحضرتؐ نے
ان کے لئے دُعا فرمائی۔ قیس کے انتقال کے بعد ان کی اولاد قندھار
منتقل ہو گئی۔ قندھار میں اہل غور گندھاریوں سے ملے اور ان سے
رشتے ناطے کے عروج وادی پشاور کے اصلی باشندوں میں سے تھے،
اور پانچویں چھٹی صدی عیسوی میں سفید ہٹنوں سے بھاگ کر یہاں آ
گئے تھے۔ نئے قبیلے نے اپنی زبان پشتو گندھاریوں سے لی اور اپنا
مذہب اسلام غوریوں سے لیا، اگلے چند سو سالوں میں اس کی
روز افزوں آبادی شمال مشرق اور واپس وادی پشاور میں پھیل
گئی۔ یہاں دوسرے مقامی گروہ جو گندھاریوں کے برعکس سفید
ہٹنوں کی آمد پر بھاگے نہیں تھے جذب کئے گئے، یہ کہانی کی بعض
روایتوں کے مطابق آفریدی اور خٹک بن گئے۔
قبائل کے پورے ارتقاء میں مختلف حملہ آور ایک دوسرے

(بقیہ ماشیہ)

ڈسٹرکٹ، سلیکیشنز۔ خرام دی وریکارڈز آف دی گورنمنٹ آف انڈیا،
۱۸۶۵ء، نمبر ۶، کلکتہ، گورنمنٹ آف انڈیا، این۔ ڈی، حصہ

۷ تا ۸۔

قبیلہ کی تشکیل میں سماتے چلے گئے اور یوں ایک گروہ میں متحرک عنصر غالب ہوا تو دوسرے میں ایرانی اثر نمایاں ہو گیا۔
 نسل کی تینوں بڑی شاخیں اپنی اپنی جگہ قیس کے کسی بیٹے سے اپنا ماخذ منسوب کرتی ہیں۔ سطر بنی پٹھان جن میں درانی، غوری خیل، خانگائی خیل، شنواری، یوسفزئی، محمد زئی، اور مہمند شامل ہیں۔
 سطر بن کو اپنا مورث اعلیٰ قرار دیتے ہیں۔ غلزئی پٹھان جن میں سلیمان خیل اور اکا خیل کے بڑے بڑے خانہ بدوش قبائل شامل ہیں۔
 بیطان کی بیٹی اور ایک ایرانی شہزادے کی اولاد ہیں۔ غور غشت پٹھان جیسے آفریدی، خٹک، وزیر، محسور، دور، توری، باجی اور اور بگش غور غشت کے اخلاف ہیں۔

قبائلی تنظیم،

بڑے بڑے قبائل کے بیان سے پہلے چند عمومی باتیں ضروری ہیں۔ ہر پٹھان گروہ کسی نہ کسی طریقے سے ہر دوسرے گروہ سے تعلق رکھتا ہے اور پشتو بولنے والے لوگ ایک بہت حقیقی، ثقافتی اور سماجی وجود کے مالک ہیں۔ لیکن ایک ایسا ڈھانچہ ترتیب دینا قریباً ناممکن ہے۔ جس میں ہر گروہ اپنا مقام پاسکے۔ ہر بڑے قبیلے کے دو یا زیادہ خیل یا طائفے ہیں۔ خیل مختلف درجوں کی وسعت کے مالک تو وسیع شدہ خاندانی نظاموں میں بٹ جاتے ہیں۔ ان

ضمنی حصوں میں سے بعض بھی خیل کہلاتے ہیں، اور بعض کو ریا کہہ دیتے ہیں۔

لیکن عین ممکن ہے کہ ایک خیل اپنے ولایتی قبیلے سے قطعاً لاتعلق ہو چکا ہو اور تعداد میں بعض دوسرے قبائل سے بھی بڑا ہو بلکہ وہ جسامت اور اہمیت میں ایک دوسرے سے بے حد مختلف ہوں ایک ہی نام کے مالک ہو سکتے ہیں۔ مثلاً سپاہ خیل آفریدیوں میں بھی ہے اور شنواروں میں بھی اور عثمان خیل مہمندوں میں بھی ہے، اور محسودوں میں بھی، لہذا جب تک کسی بڑے قبیلہ کا حوالہ نہ دیا جائے ایک مخصوص گروہی نام اپنے سیاق و سباق کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتا۔

ہر چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے گروہ کی بنیاد خونی رشتہ ہے، اصلی ہو یا فرضی۔ یہ کوہ باش قبائل میں تو ناگزیر ہے جہاں مثلاً ایک آدمی سب سے پہلے اپنے متعلق سوچے گا کہ وہ ”آدم خیل آفریدیوں کے گالی ڈویشن کے سب سیکشن شہباز خیل کے ملک شہباز خان کا دوسرا بیٹا ہے، نہ کہ وہ ”خیبر ایجنسی کے گاؤں جمروڈ کا جمشید خان“ ہے مدتوں سے میدانوں میں آباد قبائل میں جغرافیائی کوائف زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اور یہاں ذاتی شناخت اس طرح ہوگی ”تمہال گاؤں کا جہانگیر ولد عیسیٰ خان۔ ایک خلیل جو ضلع پشاور کی تحصیل پشاور میں آباد ہے“ یہ امتیاز اکثر تہی نہیں رہتا۔

کیونکہ بہت سے قبائل کے افراد پہاڑیوں میں بھی ہیں اور زیرِ قانون
اضلاع میں بھی اور کچھ قبائل تو سرحد پار افغانستان میں بھی پھیلے ہوئے
ہیں۔

خونی گروہ بندی سے مستثنیٰ صرف سائل اور گار فرتے ہیں جو
کم و بیش حد تک اکثر قبائل میں موجود ہیں۔ یہ فرتے جن کا دیگر قبائل
گروپ بندیوں سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی ان کی کوئی متحدہ
پالیسی یا مقاصد ہیں، بعض علاقوں میں سپین (سفید) اور تور (سیاہ)
کہلاتے ہیں۔ یہ مبہم طور پر سیاسی پارٹیوں سے مشابہ ہیں اور غالباً ان
کا ابتدائی مقصد یہ ہے کہ ایک آدمی ایسے گروہ میں شامل ہو سکے جو
اس کے ہمسائے کا مخالف ہو جس کے ساتھ وہ خونی رشتے سے
بندھا ہوا ہے۔ ان فرقوں کی ابتداء قدامت میں ردپوش ہے اور
اہل مغرب شاذ و نادر ہی ان کی اصل حقیقت کو سمجھ سکے ہیں۔
شاید مغرب میں اس کی واحد متوازی مثال ”ہیلے“ اور ”سبز“ فرتے
ہیں۔ جیفری نے مشرقی سلطنت روما کو اس کے آخری ایام میں
بہت دق کیا تھا۔

اکثر قبائل جن میں یہ فرقے اہم رہے ہیں تقریباً برابر برابر
ان میں تقسیم تھے۔ مثلاً آفریدیوں میں بکر خیل، آدم خیل اور اکا خیل
گارتھے اور ملک دین خیل، زکا خیل، قمر خیل اور سپاہ شامل تھے۔
فرقے سے عقیدت عموماً موروثی تھی لیکن ایک فرد اپنی وفاداریاں

بدل بھی سکتا تھا گو وہ خیل کو ایسا کرنے پر مجبور یا لازماً اسکا وہ نہ کھرا
سکتا تھا۔ پچھلے چند سالوں سے ان کی اہمیت کم ہو گئی ہے اور قبائلیوں
کی نراڈ لو انکو عملاً فراموش کر چکی ہے۔

اس پیمیدہ ڈرو لیدہ صورتحال میں بہتر یہی ہے کہ ہم ڈیویژنل
لائسن کے ساتھ ساتھ پٹھان کے شمال ترین نقطے سے شروع کریں اور
جنوب اور مشرق کی طرف بڑھتے جائیں اور اہم ترین قبائل کے
خصائص کا ذکر کرتے ہوئے ان قبائل کو نظر انداز کرتے جائیں
جو اپنی معمولی جسامت یا الگ تھلک محل وقوع کی وجہ سے سرحد پر
خاص اثر نہ ڈال سکے۔

یوسفزئی! یوسفزئی سب سے بڑے قدیم ترین اور مہذب ترین
قبائل میں سے ایک ہیں۔ ان کے خیلوں اور شاخوں کی تعداد بھی شاید
سب سے زیادہ ہے اور ارتقا کا متنوع بھی۔ وہ دیر اور سوات کے
سنگلانی پہاڑوں میں بھی آباد ہیں اور مردان کے زرخیز میدانوں میں
بھی۔ ٹولے ٹالے وہ غالباً ایک ملیں کے قریب ہیں۔

ہو۔ ابھی تک قبائل کا کوئی صحیح شمار نہیں کیا جاسکا۔ سرکاری پاکستانی مردم شماری کی
رپورٹیں صرف قبائلی ایجنسیوں کے انداز سے ہی دیتی ہیں۔ لہذا آئندہ صفحات میں ہر قبیلہ
کے دیئے گئے اعداد و شمار صرف قریباً صحیح ہیں اور مختلف ذرائع سے اکٹھے کئے گئے ہیں۔

مجموعی طور پر قبیلہ میدانئی اور پہاڑی میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔
 پہاڑی دیر سوات، بنیر اور باجوڑ کے کچھ حصوں کے علاوہ سندھ پار کے
 کوہ سیاہ کے علاقے میں بھی رہتے ہیں۔ زیادہ صحیح طور پر یہی اصلی
 یوسفزئی ہیں لیکن وہ عام طور پر اپنے مختلف قبائلی ناموں سے ہی
 پہچانے جاتے ہیں جیسے دیر اور سوات کے اکوڑئی اور ملیرئی، بنیر کے
 ایاس زئی یا محض بنیر وال اور کوہ سیاہ کے عیسے زئی۔ وہ سب سترنجی
 پٹھانوں کے خاخانی خیل کی اولاد ہیں جو پندرہویں اور سولہویں صدیوں
 میں دریائے کابل کی وادی کے بالائی حصوں سے مشرق کی طرف آئے
 تھے۔ انہوں نے سواتیوں کو سندھ پار دھکیل دیا اور عرصے سے
 ریاست ہائے دیر و سوات میں توازن اقتدار قائم رکھے ہوئے ہیں۔
 نمان یا نواب دیر پانڈہ خیل ملیرئیوں کے سب سکیشن اخوند خیل کا
 ہی ایک فرد ہے۔

میدانی یوسفزئیوں کو بعض اوقات مردان کہا جاتا ہے لیکن لوگ
 اپنے آپ کو زیادہ باوقار نام یوسفزئی سے پکارنا زیادہ پسند کرتے
 ہیں۔ ان کے تین بڑے گروہ ہیں کمالزئی، ماترئی اور بائیرئی وہ ضلع

۱۔ سوات کا موجودہ والی اخوند صاحب کا پڑپوتا جو نسبتاً کم اہم قبیلہ
 صافی سے تھے اور جنہوں نے پچھلی صدی میں ایک دلی کی حیثیت سے اپنا اقتدار
 قائم کیا والی کا مضبوط اور ترقی پسند نظم و نسق نواب دیر کے پس ماندہ جاگیر دار
 نظام کا تقاضا ہے جسے حکومت پاکستان نے بالآخر ۱۹۶۰ء میں محروم اقتدار کر دیا۔

مردان کے یوسفزئی میدان پر رہتے ہیں جہاں کہیں کہیں خشک آماں خیل
داؤدزئی اور گلگیا نیوں کی بھی آبادیاں ہیں۔

یوسفزئی بالخصوص میدانی دلکش، جنفاکش زراعت کار،
خوش وضع، نسبتاً صاف ستھرے اور اپنے قبیلے پر بے حد مازاں ہیں۔
جسے وہ پٹھانوں کا نجیب ترین اشرافیہ سمجھتے ہیں۔ زمین کار وایتی
نظام جس کے تحت ہر فرد کا ایک دفتر یعنی اس کا اپنا قطعہ زمین بھی
ہوتا ہے، اور قبائلی شاملات میں اس کا حصہ بھی، کافی حد تک
بدستور قائم ہے۔ نتیجتاً چھوٹے چھوٹے زمینداروں کا ایک بڑا طبقہ موجود
ہے لیکن انیسویں صدی میں برطانوی بندوبست اراضی کے تحت
برپا ہونے والے نظام خانی کی وجہ سے بعض انفرادی زمینیں املاک ۲۰
ہزار ایکڑ تک جا پہنچی ہیں۔

کئی سکاٹس یوسفزئی پٹھانوں کا نمائندہ ترین قبیلہ ہیں۔ اس
کا ایک حصہ میدانوں کی قانون پذیر زندگی اور سرکاری نظم و نسق
سے مانوس ہے۔ اس کا دوسرا حصہ سرزمین بے آئین میں رہتا ہے
جہاں زندگی روایتی قبائلی تورہ کے مطابق ہی گزاری جاتی ہے اور
ان دونوں گروہوں کے درمیان رابطہ قریباً قریباً مفقود و معدوم ہے۔

باجوڑی؛

باجوڑ ایک وحشیانہ پہاڑی علاقہ ہے، دیر کے جنوب میں افغان

سرحد کے ساتھ ساتھ اور مہمند علاقے کے متصل۔ اس کے لوگ بھی اتنے ہی متنوع اور خود سر ہیں، جتنا ان کا علاقہ۔ بڑے قبائل سالارزئی، آتمان خیل اور مامند ہیں۔

آتمان خیل سڑنی پٹھان ہیں جو پندرھویں اور سولہویں صدی میں یوسفزیوں کے جلو میں مشرق کی طرف آئے، ان میں سے بعض میدانی یوسفزیوں میں گھل مل گئے ہیں لیکن باجوڑ میں وہ نسبتاً اپنی جداگانہ ہستی قائم رکھے ہوئے ہیں اور پٹھانوں کی بعض قدیم ترین اور غیر واضح رسمیں بھی ان میں محفوظ ہیں۔ آتمان خیل باجوڑ میں سب سے بڑا گروہ ہے یعنی قریباً ۵۰ لاکھ، لیکن باجوڑ کا غالب قبیلہ سالارزئی ہے جن کے پانچ ضمنی حصے ایک دوسرے کے حریف خواہ بین خاڑنواگئی، پشت اور کوٹکئی کے وفادار ہیں۔ ان وفاداریوں کو اُتھل پٹھل کرنے کی کوششوں نے باجوڑ کو فتنہ و فساد کا روایتی گھر بنا دیا ہے۔

مہمند،

مہمند جغرافیائی اور سیاسی لحاظ سے باجوڑ کے قبائل کے ساتھ بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان کی نسبت کثیر التعداد اور ہم آہنگ ہیں۔ مہمند قریباً ۴ لاکھ ہیں جن میں سے نصف کے قریب ڈیوڈ لائن کی دوسری طرف رہتے ہیں۔ قبیلہ سڑنی پٹھانوں کے غوریہ خیل سے مانجھ ہے۔ غوریہ خیل

افغانستان سے خانخانی خیل کے ساتھ ہی، بحرت پذیر ہوا جس سے یوسفزئی نکلے ہیں۔ ڈیویڈنڈ لائن کے مشرق میں رہتے والے مہمند شروع میں ہی دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ، گوز (زیریں) مہمند دریا ئے کابل کے شمال میں زیر قانون اخلاص کے متصل رہتا ہے، کچھ نے کوہستانی زندگی کو خیر باد کہہ دیا اور محنتی اور زمین کے بھوکے کسانوں کی حیثیت سے شہرت حاصل کر لی ہے۔ گوز مہمندوں کی پانچ بڑی شاخیں ہیں، تارکزی، جلیمن زئی، آسمان زئی، داوے زئی اور مندی خیل۔ انہیں قوی قبائل، کہا جاتا ہے کیونکہ ۱۸۹۵ء میں جب انہوں نے برطانوی راج کو قبول کر لیا تو انگریزوں نے انہیں قول دیا کہ انہیں وہ تمام وظائف اور تحفظ ملتا رہے گا جو امیر افغان سے انہیں ملتا تھا۔

بار (پھاڑی) مہمند ایک چٹیل اور ناقابل رسائی خطہ کوہی میں رہتے ہیں جو کوئی بارہ سو مربع میل کے رقبہ پر محیط ہے اور مغرب میں ڈیویڈنڈ لائن سے مل جاتا ہے جنوب میں دریائے کابل سے اور شمال میں باجوڑ سے۔ وہ مسلم، تغیرنا پذیر قبائل میں سے ایک ہیں۔ مہمند علاقے کے نیچے ملا گوری ہیں جو خیبر کے شمال میں طرطہ سلسلہ تک پھیلے ہوئے ہیں اور مقامی طور پر ملا گورابن بایزید "پیر روشن کی اولاد بتائے جاتے ہیں جو روشنی فرقہ کا بانی تھا۔ لہذا وہ باقاعدہ شجرات نسب

میں موجود نہیں ہیں، مہمند علاقے کا بڑا مرکز لاہور ہے جو افغان سرحد کے پار ہے جہاں پہاڑیاں ٹوٹ بیٹھ کر دادئی کا بل بن جاتی ہیں پاکستانی ہندوستان اپنے سرحد پار رشتہ داروں سے مربوط رہے ہیں اور اپنے ملک میں زیر پابندی ہونے کی صورت میں فوراً انکے پاس بھاگ جاتے ہیں۔ لہذا بڑا فائدہ حکومت سے اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے میں وہ کبھی پیچھے نہیں رہے۔ یہ صورتحال اب بھی کسی حد تک باقی ہے اور آزاد پختونستان کی افغان تحریک نے ہمدوں میں اکثر دیگر قبائل کے مقابلے پر زیادہ جوش و خروش پیدا کیا ہے۔

عمومی طور پر ہمدوں کا رسم و رواج یوسفزیوں جیسا ہے، لیکن وہ دو اہم باتوں میں ان سے مختلف ہیں۔ مہمند خوانین و ملوک روایتی طور پر جمہوریت پسند یوسفزیوں کے مقابل زیادہ با اثر ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قبیلے میں داخلی کشمکش بہت شدید ہے اور کبھی کبھار ملوک اور ملاؤں میں سخت جھڑپیں ہوتی ہیں۔ آخر الذکر بھی دیگر قبائل کی نسبت ہمدوں میں زیادہ با اثر ہیں۔

دوسرا فرق گو کوئی سیاسی اہمیت نہیں رکھتا تاہم اکثر پٹھان ہمدوں کو بربریت پسند سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ

۱۔ سر چرڈ واربرٹن "ایئر زان دی خیبر" (لنڈن - جے مرلے ۱۹۰۰ء)

91
یار مہندوں کے ہاں حجرے یا مہان خانے سرے سے معدوم ہیں جس کا مطلب دوسرے قبائل یہ لیتے ہیں کہ مہند مہلستیا یا مہان نوازی کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے جسے ہر پٹھان اپنا روایتی فرض سمجھتا ہے۔

آفریدی ۲

آفریدیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ خالص پٹھان حسب و نسب کے مالک ہیں، کئی مورخین کے نزدیک مشکوک ہے لیکن ستم ظریفانہ طور پر وہی پٹھانوں کے اصل نمونے سمجھے جاتے ہیں۔ وہ متفاد صفات کا ایک مجموعہ ہیں۔ بہادر، محتاط، قابلِ عزت، دغا باز، ظالم، جان باز، توہم پرست، بامروت، شکی مزاج اور خود دار۔

قبیلہ کوئی ۲۰ لاکھ افراد پر مشتمل ہے اور آٹھ واضح طائفوں میں تقسیم ہے۔ آدم خیل، اکا خیل، قمر خیل، قنبر خیل، کوکی خیل، ملک دین خیل، زکاخیل اور سپاہ، یہ پشاور کے جنوب اور مغرب میں کوئی ایک ہزار مربع میل رقبے پر آباد ہے۔ درہ خیبر اسی پہاڑی علاقے سے گزرتا ہے۔ درے کے جنوب میں تیراہ ہے جو

یو۔ مشلا ڈیولس، مذکورہ بالا کتاب میں ص ۶۲ + میجر آر۔ ٹی۔ آئی رجو
"پٹھان" کلکتہ، گورنمنٹ پریس ۱۹۱۸ء، ص ۵۰ مذکورہ بالا کتاب میں ص
۶۲ + سر مارک آرل ٹین جنرل آف وی رائل ایشیاٹک سوسائٹی، جولائی

۱۹۲۵ء، ص ۲۰۲ تا ۲۰۳ -

آفریدیوں کی جنم بھومی ہے۔ تیراہ میں داخلے کا راستہ بخوری میدان اور چورادادی میں سے ہے۔ جنوب مغرب میں کئی چھوٹے چھوٹے درے وادی کرم میں جاتے ہیں۔ شمال کی طرف تیراہ سے کئی تنگ پہاڑی گھاٹیوں کے ذریعے خیبر پہنچا جاسکتا ہے۔

تمام آفریدی طائفے تیراہ میں اپنے اپنے علاقوں کے مالک ہیں جن میں سے اکثر خیبر تک پھیلے ہوئے ہیں جس پر انہوں نے ہمیشہ حق محصول استعمال کیا ہے۔ ملک دین خیل تیراہ کے وسط میں رہتے ہیں اور باغ پر قابض ہیں جو آفریدی جرگوں کی روایتی جائے انعقاد ہے۔ اکانیل جرود کی جنوبی پہاڑیوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ سارا علاقہ خیبر ایجنسی میں شامل ہے۔ آدم خیل پشاور اور کوہاٹ کی درمیانی

۱۔ سوہوین صدی میں آفریدی مغل سلطنت سے ہزار لاکھ روپے سالانہ وصول کرتے تھے اور ہر مسافر سے لیا جانیوالا محصول اس کے علاوہ تھا ۱۸۶۵ء تک ان کی آمدنی امیر افغانستان سے صرف ۲۲۹۰۰ روپے رہ گئی تھی لیکن اس کے علاوہ وہ ہر لدے ہوئے اونٹ پر ۵ روپے (اشبے خوردنی کی صورت میں ۳ روپے) ہر گھوڑ سوار سے ۳ روپے اور ہر آن لدے ہوئے اونٹ یا پاپیادہ سے ۱۲ روپے وصول کرتے تھے۔ برطانوی ہند اور پاکستان کی طرف سے دیئے جانے والے وظائف کے مستند اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں لیکن اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ یہ مغل اعداد و شمار سے کہیں زیادہ ہیں۔

پہاڑیوں میں رہتے ہیں۔ ان کا محافظ خانہ درہ کوہاٹ ہے جس میں ان کی اہم ترین اسلحہ ساز فیکٹریاں واقع ہیں۔ یہ علاقہ ایک علیحدہ بے آئین بٹی کی حیثیت سے ضلع کوہاٹ سے منسلک ہے آدم خیل کے سوا آفریدی طائفہ بھرت پند پر ہیں اور سردی میں بلند تیراہ سے نکل کر پست پہاڑیوں اور خجوری میدان میں چلے جاتے ہیں۔

گوسا رقبیلہ مغلوں اور انگریزوں کے خلاف متحدہ اقدام کا اہل ثابت ہوا تاہم آفریدی باہمی جنگ و جدل کے اس بُری طرح عادی ہیں کہ ہمسایہ قبائل کے ساتھ کسی بڑے معرکے کا انہیں وقت ہی نہیں مل سکا۔ آدم خیل اور اکاخیل کے درمیان اور کوہ خیل اور زکاخیل کے مابین جھگڑے بہت مشہور ہیں۔ برہیل تذکرہ آخر لکڑ طائفہ آفریدیوں کا اصلی نمونہ سمجھے جاتے ہیں۔ یہ اتنا ناقابل اعتبار سمجھا جاتا ہے کہ دوسرے طائفے جرگہ میں کسی زکاخیلی قسم کا روایتاً اعتبار نہیں کرتے جب تک یہ خیال راتھ نہ ہو۔ خاتمہ جنگی اس لئے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ آفریدیوں پر ملاؤں کا بہت اثر ہے اور مختلف طائفے ساحل اور گار قرقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

آفریدی نازک اندام اور خوش نما لوگ ہیں اور قد کاٹھ میں یوسفزیموں سے ذرا کم ہیں۔ عبرانی خود خال اور پوری دار طھیاں

رکھنے کا رواج اکثر سفید ریش لوگوں کے لہراتے ہوئے بلبوسات کی آن بان سے مل کر انہیں تو راتی بیہنجیروں کے ایک مجمع کا اثر دے دیتا ہے۔

آفریدی بالخصوص آدم خیل اور ملک دین خیل اکثر دیگر قبائل کے خلاف برطانوی ہندی فوج میں کثیر تعداد میں بھرتی ہوتے تھے۔ مشہور خیبر رائفلز جن کا صدر مقام ننڈی کوتل (خیبر) ہے زیادہ تر ایک آفریدی تنظیم رہی ہے سوائے ان اوقات کے کہ جب انگریز بغاوت یا سازش کی وجہ سے آفریدیوں کی ملازمت پر پابندی لگا دیتے تھے۔ پچھلے سالوں میں آفریدیوں نے سرحد کے مختلف مقامات کے درمیان اور پشاور اور افغانستان کے مابین نفع بخش ٹرک حمل و نقل کا کاروبار قائم کر لیا ہے۔ ہندوستان میں سکھوں کی مانند آفریدی شمال مغربی پاکستان میں موٹر کمینک بھی ہیں، اور بیکار ترین گاڑیوں کو غیر معینہ مدت تک ایک نئی زندگی دے دے سکتے ہیں۔

سپر جمیٹے کی نمود پر آفریدیوں کی آمادگی جہاد کے باوجود دیگر پٹھان ان کے مذہبی لابیالین پر سخت متفکر رہتے ہیں۔ سترھویں صدی میں پشتو کے عظیم شاعر اور آخر دم تک آفریدیوں کے اتحادی نے افسوس کا یوں اظہار کیا۔

”تیراہ میں مؤذن کی آواز سنائی نہیں دی اور وقت فجر صرف

مرغ ہی اذانیں دیتے ہیں:

سولہویں صدی کے روشنیہ ملحدین دیگر قدامت پسند قبائل کے
ٹھکانے کے بعد تیراہ میں پناہ گزین ہوئے اور مشہور رہے کہ فرقہ
کا بانی، پیر روشن اب بھی وہاں محترم سمجھا جاتا ہے۔

لیکن لاندہیت کے الزامات کا بہترین جواب شاید آفریدیوں
کی اپنی ہی اپنے متعلق ایک کہانی ہے۔ ایک دفعہ بہت عرصہ پہلے
ایک بزرگ پیر قبیلے کے پاس آگیا۔ انہوں نے اس کی تعظیم کی اور
دعا کے لئے درخواست کی اس نے انہیں ان کے فقدان خیر و برکت
پر تارا اور لعن طعن کی کہ ان کے پورے علاقے میں کسی بزرگ
کا ایک بھی مزار نہ تھا جس سے وہ شفاعت کے امیدوار ہو سکتے
تھے۔ اس دلیل سے متاثر ہو کر آفریدیوں نے پیر کو موقع پر ہی قتل
کر دیا اور اس کا ایک شاندار مقبرہ تعمیر کیا جہاں وہ زہد و ریاضت
کرنے لگے۔

اس کہانی کا اکثر حوالہ دیا جاتا ہے لیکن اس کا ماخذ زیادہ تر کسی انگریز
مصنف سے منسوب کیا جاتا ہے، جو ایک پختہ حس مزاج کا مالک تھا لیکن یہ
قابل ذکر ہے کہ جیمز نے ۱۸۶۵ء میں لکھی گئی اپنی بندوبست رپورٹ میں اس
واقعہ کو یوسفزیوں میں مشہور و معروف بنایا جبکہ آفریدی آج بھی اسے
اپنے سے منسوب کرتے ہیں۔

شنواری:

سٹرنی پٹھانوں کا ایک چھوٹا سا گروہ شنواری بھی ہے جو
خیبر کے انتہائی مغربی سرے پر بھی رہتے ہیں اور افغانستان کی وادی
جلال آباد کے زیریں حصہ کی پہاڑیوں میں بھی قبیلے کی نفری کوئی
۵۰ ہزار ہے۔ یہ منڈنی، سگوخیل، سپاہ اور علی شیر خیل شاخوں
میں تقسیم ہے۔ صرف آخر الذکر کے کوئی بارہ ہزار افراد سرحد میں
رہتے ہیں۔ گو یہ قبیلہ ایران افغانستان کے لئے کافی درجہ سربارہا
ہے تاہم ڈیوڈ ٹیلر کے مشرق میں یہ کبھی اہم نہیں رہا۔

اورکزئی:

اورکزئی قریباً ۱۲ سو میل رقبہ پر پھیلے ہوئے ہیں جو سفید
کوہ کی ایک جنوبی گھاٹی یعنی سامانہ چوٹی پر مرکوز ہے۔ وہ تیراہ
کی جنوبی وادیوں اور وادی کرم کی شمالی پست پہاڑیوں میں بھی
آباد ہیں۔ پٹھان شجرہ نسب میں وہ سب غور غشت کی اولاد بتائے
گئے ہیں لیکن ان کے مختلف حصے اصل میں قریباً علیحدہ علیحدہ
قبائل معلوم ہوتے ہیں۔ یہ اسماعیلزئی، مستورزئی، دولت زئی، محمد خیل
ستوری خیل اور لشکرزئی ہیں۔ آخر الذکر سب سے بڑے اور
طاقتور ترین ہیں۔ ان کا ایک طائفہ مامون زئی سا باہا سال تک کرم

اور کوہاٹ میں انگریز منتظمین کے پہلو کا کانسٹا بنا رہا۔ چار ماہ تحت قبیلے، علی خیل، ملا خیل، مشتی اور شیخان بھی اور کزیوں سے منسلک ہیں اور ان میں مزید تنوع کا باعث بنتے ہیں۔ ان کی مجموعی تعداد قریباً ۹۵ ہزار ہے۔ اور کزی علاتے میں جھگڑے عام ہیں۔ گار اور سائل فرقے طائفوں اور ان کے اجزاء کو باہمی طور پر متصادم رکھتے ہیں۔ مذہبی اختلافات رقابت کو برسرِ دیتے ہیں۔ محمد خیل، نصف ستوری خیل اور غلام طائفوں کے مختلف اجزاء شیعہ ہیں جبکہ باقی اور کزی سنی ہیں۔ یہ اندرونی تصادات زیمشت، آفریدیوں، بنگش اور تورلیوں کے ساتھ مزید جھگڑوں کا موجب بنتے ہیں۔

زیمشت ۱۰

زیمشت دادی کرم کے دھاتہ کنے ارد گرد کی پہاڑی ڈھلانوں پر رہتے ہیں اور میدانوں میں بھی چند دیہات کے مالک ہیں۔ بعض فضلا کے مطابق وہ بھی اور کزیوں کا ایک طائفہ ہیں لیکن وہ اپنے کو سڑبئی پٹھان کہتے ہیں اور اور کزیوں سے مختلف معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ۷۰ ہزار کے قریب ہیں اور چنارک کے سرور خان عرف چنئی کی وجہ سے بہت مشہور ہیں جو بدنام لیکن کامیاب

۱۔ مثلاً سزیم باٹن "انڈیا زمارتھ ویسٹ فریڈر" (لنڈن ۱۹۳۹ء)

ڈاکو تھا اور ایک وقت زیریں وادی کرم کا بے تاج بادشاہ تھا۔

توری ہر

توری وادی کرم کا اہم ترین قبیلہ ہیں۔ شجرہ نسب کے مطابق وہ غور غشت پٹھان ہیں لیکن مذہباً شیعہ ہیں۔ ان کے خدو خال قطعی منگول ہیں اور وہ غالباً ابتدائی تاتاری فاتحین کی اولاد ہیں ان کا دعویٰ ہے کہ وہ طوغانی کی سرکردگی میں ایران سے مشرق کی طرف آئے اور ایک تاتاری خاندان تھا جو ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے قیام سے پہلے یہاں وارد ہوا۔ اٹھارہویں صدی کے اوائل میں اس نے بنگش کو وادی کرم سے باہر دھکیل دیا۔

ایک ترقی یافتہ سماجی، مذہبی اور قانونی ڈھانچہ جو دیگر قبائل سے مختلف تھا انیسویں صدی تک موجود تھا ان کا روایتی قانون المعروف بہ توری ہونا، ہیئت پختون ولی سے مشابہ تھا۔ لیکن یہ قبیلہ کے شیعہ مذہب کا ضامن تھا اور اپنے افراد کے اس حق کا بھی کہ وہ علاقے میں آباد پیروں یا مسادات کے چار عظیم خاندانوں

۱۔ چٹھی وزیروں کے ساتھ ایک لڑائی میں ۱۹۰۳ء میں مارا گیا۔ اس کے کارناموں کے لئے دیکھئے 'بارٹن مذکورہ بالا' ص ۱۰۳ نیز 'مقیوڈ و راسٹن' پینل 'ڈمٹنگ دی فیلڈ'

۲۔ 'ایز آف دی افغان فریڈم'، 'لندن'، 'سیلی'، 'سروس'، ۱۹۲۷ء، ص ۲۷ تا ۲۸

میں سے کسی کے بھی عقیدت مند ہو سکتے ہیں۔ یوسفزیوں کی طرح ان میں زمینتی املاک بے حد منظم تھیں اور ہر اصلی توری اب بھی بیوار اور ملانا کے موروثی دیہات کی قبائلی زمینات میں کم از کم رسمی حصہ دار ضرور ہوتا ہے۔

شیعہ ہونے کی وجہ سے توریوں کو اکثر اپنے ہمسایہ سُنی قبائل کے ظلم و ستم کا نشانہ بننا پڑا، قبائلی علاقے کی ترخیز ترین زمین پر قابض ہونے کی بدولت وہ واقعی ایک قابلِ حفاظت اثاثہ کے مالک تھے، لہذا انہوں نے انگریزوں کو خوش آمدید کہا اور شروع میں ہی ان سے اتحاد کر لیا۔ چنانچہ وہ عرصے سے کوماٹ اور بنوں کے زیر انتظام ضلعوں سے بہت گہرا رابطہ رکھتے ہیں اس لئے ان کے حیدرگانہ قبائلی نظریات و رسومات دیگر سرحدی قبائل کی نسبت بہت حد تک بدل گئے ہیں۔ توری حمزہ خیل، مستوخیل، گنڈی خیل، عیلنرئی اور دیرزئی میں تقسیم ہیں۔ چند چھوٹے چھوٹے غلام قبائل کو ملاکر ان کی مجموعی تعداد قریباً ۲۰ ہزار ہے: شامل اور گارفرتے بھی توریوں میں موجود ہیں لیکن سپین اور تور کے ناموں کے تحت عقیدتاً بھی وہ چارسیہ خاندانوں میں بٹے ہوئے ہیں جن میں سے نہیں کے مرید روایتی طور پر سست غنڈی کہلاتے ہیں جبکہ چوتھے خاندان کے سرادت مند مقابلے پر ٹینگ غنڈی مشہور ہیں۔

بنگلش

بنگلش وادی کرم کے سابقہ باشندے تھے اور ان میں سے بہت سے وادی کے نچلے حصوں میں اب بھی آباد ہیں۔ باقی ایک تنگ پٹی پر رہتے ہیں، جو وادی کرم کے دہانے پر دریائے سندھ تک محیط ہے۔ ان کا صدر مقام مانگو ہے۔ قبیلہ کوئی۔ ۱ ہزار افراد پر مشتمل ہے اور یہ میرنئی، بایرنئی اور سالنئی میں تقسیم ہے اور کنزیوں کی طرح ان میں سے کچھ شیعہ ہیں اور کچھ سُنی۔ قریباً سب کے سب گار فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ قبائلی پُرامن، کم آمیز اور جفاکش ہیں۔ بہت سے برطانوی ہندوستانی اور پاکستانی افواج میں ملازم رہ چکے ہیں۔

وزیر

وزیر پہاڑوں کے اس پیچیدہ سلسلہ کا اہم ترین قبیلہ ہیں جو کرم سے ایک سو میل سے زیادہ فاصلے تک جنوب کی طرف چلتا ہے۔ یہ علاقہ شمالی وزیرستان اور جنوبی وزیرستان کی قبائلی ایجنسیوں میں تقسیم ہے جس میں اول الذکر کا صدر مقام میران شاہ ہے اور جنوبی وزیرستان کا صدر مقام مردی میں ٹانک اور گرجی میں وانا ہے۔ وزیر غور غشت کی اولاد ہیں۔ وہ اپنے موجودہ علاقے میں چودھویں صدی کے اوائل میں نمودار ہوئے اور آج ان کی آبادی

قریباً ۲ لاکھ ہے جن میں سے تھوڑے سے افغانستان رہتے ہیں۔
 قبیلے کو اکثر درویش خیل کہا جاتا ہے تاکہ اسے محسوس
 سے جھینر کیا جاسکے جو خود بھی ماخذ کے اعتبار سے وزیر میں اس
 کی دو بڑی شاخیں ہیں اتمانزئی اور احمدزئی جو ڈیوڑنڈ لائن کے
 ساتھ ایک قوس کی صورت میں گول کے دہانے سے وادی کرم
 کے دہانے تک پھیلی ہوئی ہیں۔ سرحد کی پاکستانی طرف اتمانزئی
 شمالی وزیرستان اور احمدزئی عموماً جنوبی وزیرستان میں مرکوز ہیں
 گو ان میں کچھ پورے وزیرستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔

دونوں شاخیں کم از کم چار جداگانہ حصوں میں تقسیم ہیں جن
 کے قریباً تین سو الگ الگ حصے بخرے ہیں۔ اہم ترین گروہ جن
 میں ہر ایک کئی کئی ذیلی گروہوں پر مشتمل ہے مداخل، کابل خیل
 اسپرکا، ناصر الدین، ہاتھی خیل اور توری خیل ہیں۔ پچھلے چند سالوں
 کا مشہور ترین حریف فقیر اپنی توری خیل تھا۔

کسی حد تک وزیر باختر پذیر ہیں۔ وہ موسموں کے مطابق
 اپنے بھیڑوں بکریوں کے ربوڑوں کے ساتھ ساتھ پہاڑیوں کے
 نشیب و فراز میں چرتے رہتے ہیں۔ وزیر اپنے مخصوص لہجے میں پشتو
 بولتے ہیں اور زیادہ تر سیاہ اور ملگجا لباس پہنتے ہیں جبکہ ان
 کے شمالی ہمائے ہلکے رنگوں کے کپڑوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ انگریزوں
 نے انہیں اپنے ولین رابطے پر پراسن اور

دوست نہ پایا۔ لیکن بعد میں انہوں نے کسی بھی دوسرے قبیلہ کی نسبت حکومت ہند کو سب سے زیادہ حق کیا۔ ۲۸ - ۱۹۳۷ء تک بھی کئی برطانوی ہندوستانی ڈومینیشن وزیرستان میں ایک بھر پور جنگ میں الجھے ہوئے تھے۔ نتیجتاً وہ دغا بازی اور بے رحمی کے لئے مشہور ہیں تاہم وہ بہادر اور قوی لوگ ہیں اور اپنی بے آب و گیاہ پہاڑیوں پر عاشق ہیں اور انہوں نے بہت سے پاکستانی پولیٹیکل افسروں کے دل جیت لئے ہیں جن کا ان سے سابقہ پڑا ہے۔ لیکن یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ وہ غیر ملکیوں کے ذاتی توفیر اور انیسیت حاصل نہیں کر سکے جو وہ آفریدیوں بلکہ محسودوں سے بھی روا رکھتے ہیں جو وزیروں کے سخت تر بھائی ہیں۔

عملی اعتبار جو سرحد کے دوسرے علاقوں میں کافی حد تک برسر کار رہا ہے وزیروں کے سلسلے میں ہنوز نامکمل ہے۔ اپنے دورِ بنوہی اور بنگلش ہمسایوں سے زیادہ خوشنوا اور کثیر المقداد ہونے کی وجہ سے وزیروں سے یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ اپنی غیر دلکش پہاڑیوں میں محدود رہنے کی بجائے ان قبائل کی نسبتاً زرخیز زمینوں پر قبضہ جمالیتے۔ اسے کم از کم کسی حد تک انگریزوں کے ساتھ محنت

۱- ایلفنٹن، محولہ بالا، ص ۸۵، ایلفنٹن کی رائے کی تائید اور ڈاز نے

۱۸۶۷ء ٹیلر نے ۱۸۵۲ء ٹیلر نے ۱۸۵۵ء اور میک گریگ نے ۱۸۶۳ء میں کی۔

جھڑپوں نے روکے رکھائے جو زیادہ اطاعت پذیر قبائل کو تحفظ فراہم کرتے تھے۔ برطانوی طاقت کو تباہ کرنے میں ناکام ہو کر وہ اپنی پہاڑیوں میں ہی محدود رہے اور کبھی کبھار میدانوں پر چھاپے مارتے رہے اور پہاڑیوں میں شاہی قوت قائم کرنے کے سلسلے میں برطانیہ کی پے درپے کوششوں کو ناکام بناتے رہے۔

قیام پاکستان سے وزیر اپنی پہاڑیوں سے تدریج نیچے اتر رہے ہیں۔ کچھ فوج اور سکاؤٹوں میں بھرتی ہوئے ہیں تاہم جب تک بڑے بڑے نئے قطعات زمین ترقی آشنا نہ ہوں اور ڈیرہ جات یا بتوں میدان کے موجودہ ناقابل کاشت حصوں میں انہیں دستیاب نہ ہوں اس وقت تک وزیروں کی اکثریت غالباً پہاڑیوں میں ہی رہے گی اور زمان و نفقہ کے لئے بنیادی طور پر سرکاری وظائف پر ہی انحصار کرتی رہے گی۔

وزیروں نے امان اللہ کے اخراج کے بعد ۱۹۲۹ء میں نادر خان کو تخت افغانستان پر بٹھانے کے لئے بہت بڑا کردار ادا کیا اور اب بھی وہ کابل کے ساتھ کافی گہرا رابطہ رکھتے ہیں جو جزواً دوستانہ اور جزواً حریفانہ ہے۔

محسود

محسود تین طرف سے وزیروں اور چوتھی یعنی مشرقی طرف

سے بھائیوں میں محصور ہیں۔ ان کے اپنے دونوں ہمسایوں سے
 دیرینہ جھگڑے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ سکھوں اور انگریزوں کے
 خلاف بنادوتوں کی ایک لمبی تاریخ کے مالک ہیں، اور اپنی وجوہات
 کی بناء پر وہ وحشی ترین پٹھان مشہور ہیں۔ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا
 محسود اصل میں وزیروں کا ایک ڈویشن ہیں لیکن کسی محسود سے
 یہ کہنا ایسے ہی ہے جیسے علمیت کو ایک چانک اور پر تشذوات
 کی دعوت دینا۔ محسود قریباً ایک لاکھ ہیں اور تین شاخوں بھلوئڑی،
 علینڑی اور شمن خیل میں تقسیم ہیں۔ وزیروں کی طرح یہ بڑی شاخیں
 دوسرے اور تیسرے درجے کی مزید شاخوں میں تقسیم در تقسیم ہیں۔ اہم
 ترین ذیلی حصے بشی خیل، منزئی، نانا خیل اور ایل خیل ہیں۔
 محسود علاقہ کئی گونہ اور ماکن پر مرکوز ہے۔ یہ گولی کے
 حصوں، ٹانک، زم اور وانا میدان کے سرے تک پھیلا ہوا ہے۔
 محسود وزیروں سے بھی زیادہ متحرک اور جارحانہ ہیں۔ ان پر ایک
 تیزافروں آبادی کا بھی دباؤ ہے۔ پچھلے سالوں میں ان میں سے
 بہت سے اپنا علاقہ چھوڑ کر نیم فوجی ضرور بٹالینوں میں بھرتی
 ہو گئے ہیں اور سرحد کے دوسرے حصوں میں سڑکیں بنا رہے
 ہیں۔ کئی دوسرے بعض غیر متوقع پیشوں میں بھی نظر آتے ہیں جیسے
 کراچی میں گھریلو ملازم، ساحلی سٹیمر کے عرشے پر ملازم یا کہیں بھی
 ٹرک ڈرائیور۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوؤں کے فرار کے بعد محسودوں نے

ٹانک بازار کی اکثر دکانوں کو سنبھال لیا جو ابھی تک خانہ گزریں ہیں وہ وزیروں کی زمینوں پر قدم بہ قدم دست درازی جاری رکھے ہوئے ہیں اور وانا میدان کے سرے پر زمین کے ایسے تقنازعہ قطعے بھی ہیں جن پر سالانہ آٹنا ہی خون بہایا جاتا ہے جتنا پانی۔

محسود علاقے کے وسط میں زیادہ تر کئی گورم کے اندر اور ارد گرد اُرْمڑ رہتے ہیں۔ اس چھوٹے سے قبیلہ کی اپنی زبان ہے جسے برگتہ کہا جاتا ہے اور اس کی اپنی روایات و روایات ہیں لیکن یہ گروڈیش کی پٹھان ثقافت میں جذب ہو چکے ہیں۔ شجرہ نسب میں اُرْمڑ سٹرنی بیٹھان دکھائے جاتے ہیں لیکن ان کا پٹھان ماخذ مشکوک ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ مکمل طور پر محسودوں پر منحصر ہیں۔ لیکن ان دونوں قبائل کے درمیان ایک قابلِ ذکر حسنِ رفاقت اور مساوات موجود ہے اور اُرْمڑ وزیروں کے ساتھ جنگ میں اپنے زیادہ طاقتور ہمسایوں کی پُر جوش مدد کرتے ہیں۔ سارا قبیلہ صرف چند ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔

بھٹانی،

بھٹانی ایک خاصے بڑے علاقے پر پھیلے ہوئے ہیں جو وزیرستان کے مشرق میں میدانِ مروت سے جنوب میں گول ٹک محیط ہے۔ کچھ قبائلی علاقے میں مرکوز ہیں جبکہ دوسرے ضلع ڈیرہ اسماعیل خان

میں رہتے ہیں۔ ان کی آبادی قریباً ۴۳ ہزار ہے اور وہ تین شاخوں
ٹاٹا، دھانا اور اڑسپان میں تقسیم ہیں۔

قبیلہ برطان دقیس کا تیسرا بیٹا) کو اپنا مورث بتاتا ہے لیکن
غلزبوں سے ان کی کوئی چیز مشترک نہیں ہے۔ بھٹانی کبھی کبھار اپنے
ہمسایوں کے اتحادی یا حریف بنے ہیں لیکن عموماً وہ ایک ہیست حوصلہ
لوگ ہیں اور وزیروں اور محسودوں کی متحرک صفات سے محروم ہیں
مقامی طور پر وہ "وزیروں کے گیدڑ" مشہور ہیں۔

دور ۲

وزیرستان کا چوتھا قبیلہ دور ہے۔ انہیں ان کے ہمسائے
اول تو پٹھان ہی نہیں سمجھتے لیکن اگر بغرض محال سمجھتے ہیں تو پھر
انہیں پٹھانوں کی بدترین مثالیں قرار دیتے ہیں۔ روایت کے مطابق
وہ ابتدائی غورنشت معتبرین میں سے کسی کمتر معتبر کی ایک لونڈی
کی اولاد ہیں اور دوسرے قبائل پختگی سے اس نظریہ پر قائم ہیں
کہ دور ناجائز یا نصف النسل قسم کے پٹھان ہیں۔

دور قریباً ۵۰ ہزار ہیں اور وہ پٹی زاد، عیدک اور ملی زاد
میں تقسیم ہیں۔ یہ کئی درجن ذیلی حصوں میں تقسیم در تقسیم ہیں۔ دور
یا ٹوچی وادی وزیرستان کے معدومے چند زرخیز علاقوں میں سے
ہے اور تعجب ہے کہ وہ اس پر اپنا قبضہ برقرار رکھ سکے حتیٰ کہ

انگریز اتنے طاقتور ہو گئے کہ وہ اس کو تحفظ دے سکے۔
 ہر قابل تصور برائی جیسے بُزدلی، غلامت، افیون خوری
 اور غیر فطری اخلاق یا خنکی دُوروں سے منسوب کی جاتی ہے۔
 خواہ ان کے ہم ملک ہوں یا غیر ملکی۔ لیکن راقم الحروف کا ذاتی
 مشاہدہ یہ ہے کہ اگر انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ اپنی
 چھوٹی سی وادی میں نہایت عرق ریزی سے کاشتکاری کرتے ہیں
 اور اپنی جوتوں اور چمڑے کی دیگر اشیاء کی مختصر سی پیداوار کو
 بیرانشاہ بازار میں لا کر خرید و فروخت کرتے ہیں۔

زیر انتظام قبائل

مذکورہ بالا تمام یا اکثر قبیلے قبائلی علاقوں میں رہتے ہیں یا اس
 کے ساتھ بہت قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ بہت سے دیگر قبائل اور
 قبیلے جو ہیں تو اصلی پٹھان لیکن پہاڑیوں سے ان کا رابطہ مختلف
 حدود تک ٹوٹ چکا ہے۔ چھوڑیہ انتظام ضلعوں میں رہتے ہیں۔
 یہ گروہ اپنے پٹھان ورثہ اور رحم و رواج کو تو قائم رکھے ہوئے ہے

۱۔ دیکھئے۔ ای۔ ای۔ ایورڈ "ایکروس دی یارڈ آف پٹھان ایڈیلوچ" (لنڈن)
 جیپ مین اینڈ ہال، ۱۸۹۰ء ص ۱۲۱، ڈیوس مذکورہ بالا، ص ۶۶ + بارٹ
 محولہ بالا، ص ۵۳ + برجویئے محولہ بالا، ص ۸۳۔

لیکن ایک مرکزہ الزراعت زندگی اور حکومتی نظم و نسق کو تسلیم کرنے کی ضرورت نے اس کے قبائلی ڈھانچے کو بہت حد تک کمزور کر دیا ہے۔

داؤد زئی، محمد زئی اور خلیل وادی پشاور کی جفاکش برادری کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ ہر گروہ کا اپنا اپنا مخصوص علاقہ ہے لیکن گڈ ڈیہات بھی موجود ہیں۔ اگرچہ قبیلے کا شراب بھی مضبوط ہے پھر بھی یہ خارجی اقتصادی و سیاسی اثرات کے پیش نظر جو اس کے افراد کو متاثر کرتے ہیں اپنا کوئی مجموعی کردار ادا نہیں کر سکتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ عزت و غیرت میدانی دکوہی پٹھان کے لئے ایک ہی جیسی عزیز ہونے کے باوجود اول الذکر اسے صرف انفرادی بنیاد پر ہی قائم رکھ سکتا ہے کیونکہ وہ قبائلی اقدام کا سہارا نہیں لے سکتا۔ اس کا ایک جزوی نتیجہ یہ ہے کہ زرخیز وادی کے چپے چپے پر آباد پڑمان زرعی دیہات میں قتل کی وارداتیں اتنی زیادہ ہیں۔

مزید جنوب کی طرف دو میدانی قبیلے کافی کثیرالعداد ہیں۔ وہ اس بات کے بھی غمازیں کر پٹھان سردار مختلف سمتیں اختیار کر سکتا ہے اور قابل ذکر ہو سکتا ہے۔

بنوچی ہر

بنوچی جو بنوں شہر اور اس کے ارد گرد کے میدان میں رہتے
ہیں زیر انتظام پٹھانوں کے لئے وہی حیثیت رکھتے ہیں جو اہل
کوکہ کے لئے دور۔ وہ غور غشت کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرتے
ہیں لیکن مغل، درانی، پنجابی اور ہندوستانی خون کا امتزاج ہیں،
جس میں غالباً ترک، ایرانی اور قدیم خون کا شائبہ بھی موجود
ہے۔ وہ سات علیحدہ علیحدہ طائفوں میں منقسم ہیں۔ بنوں بازار
پورے سرحد کی اشیائے تجارت کی منڈی ہے اور شہر کے ارد گرد
کے کھیت اور باغات قریبی پہاڑیوں کو خوراک مہیا کرتے ہیں۔

نٹک ہر

نٹکوں کو ایک مستند بیرونی عالم نے پورے سرحد میں
پٹھانوں کے احسن ترین نمونے قرار دیا ہے اور ان کے بہت سے
ہمسائے بھی اسی رائے کے مالک ہیں، قبیلہ اہل کوکہ کی ساری
ہمت و جاہلیت کا بھی حامل ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کے
افراد آپس میں بھی اور دوسروں کے ساتھ معاملات میں بھی

کافی حد تک صاف گوئی اور تھل سے کام لیتے ہیں۔ وضع قطع میں وہ ایک مضبوط اور لطیف اندام لوگ ہیں اور اپنی صفائی کے لئے مشہور ہیں۔ وہ اپنے اختیار کردہ دو گونہ پیشیوں، جنگوئی اور کاشتکاری کے اہل بھی ہیں اور ان پر مطمئن بھی۔

قبیلہ غور غشت کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور زیادہ تر جغرافیائی بنیاد پر تین حصوں، یعنی خٹک، اکوڑہ خٹک اور ساغری خٹک میں منقسم ہے۔ جن میں سے آخر الذکر شرق سندھ میں رہتے ہیں۔ خٹک زمینیں دریائے سندھ کے ساتھ الٹک کے اوپر سے لے کر کوئی پندرہ میل تک کالا باغ کے شمال تک پھیلی ہوئی ہیں۔ جنوبی حصہ مغرب کی طرف وادی کرم کے دہانے تک چلا جاتا ہے سنی خٹک ضلع کوہاٹ اور اکوڑہ خٹک مردان کے شمالی حصہ میں آباد ہیں۔ قبائلی علاقہ میں کوئی خٹک نہیں، تاریخی لحاظ سے خٹک دیگر قبائل کی نسبت قریباً ایک قوم کہلا سکتے ہیں۔ جب سے وہ تیرھویں اور چودھویں صدی سے اپنے موجودہ علاقے میں آئے ہیں پورا قبیلہ کم و بیش ایک ہی سردار کے ماتحت رہا ہے اور مساوات جس کا ہر آدمی طلبکار تھا، یہاں نیم نراجی کیفیت نہ پیدا کر سکی جو دوسرے قبائل پر مسلط ہوئی۔

۱۔ خٹک روایت کے مطابق قبیلہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے۔ چار (باقی صفحہ ۱۱۱ پر)

خٹک مہذب منگولوں سے ہی بڑے قریبی تعلقات رکھتے تھے ایک
خٹک سرخارا کوڑنے اٹک گھاٹ اور پشاوڑ کے راستے کے تحفظ کی ذمہ داری
قبول کی اور شہنشاہ اکبر نے جاگیر عطا کی۔ خوشمال خان نے منگولوں سے
قطع تعلق سے پہلے اجمیر میں ایک قلعہ پر قبضہ کیا جو کئی مغل جرنیلوں
کے لئے دردِ سر بنا رہا تھا۔^۲

(بقیہ حاشیہ)

پیٹھان بھائی، قحان، عثمان، اتان اور جدران اکٹھے شکار کھیل رہے تھے۔ انہیں چار برقعہ
پوش لڑکیاں ملیں، عثمان، اتان اور جدران قرعہ ڈالنا چاہتے تھے لیکن قحان نے سب سے
بڑا ہونے کی بنا پر سچی اولیت مانگا، اس نے بہترین ملبوس کی لڑکی پسند کی جب پردے
ہٹائے گئے تو وہ بد صورت ترین نکلی۔ دوسروں نے طعنہ دیا "قحان خٹہ یعنی کچڑ میں جلا گیا"
اور اس کی اولاد خٹک کہلائی۔ عثمان کو فراد بد نما تھا۔ کچھ مہانوں نے اس کے نوکروں سے
پوچھا "وہ کیا یاکون ہے؟" نوکروں نے جواب دیا "وہ بھی آخریدہ یعنی خدا کی مخلوق
ہے" لہذا عثمان کی اولاد آخریدی کہلائی۔ برسیل تذکرہ اتان کی اولاد اتان خیل کہلاتی
ہے۔ دیکھئے تاریخ مرصع "ازافضل خان، تحریر کردہ قریباً ۱۶۹۰ء" خالداقحانی

کے ترجمہ ٹریور جیمیل پلاؤڈن (لاہور، منشی گلاب سنگھ ۱۸۹۳ء) ص ۱۸۷ تا ۱۸۸

۲- ایف۔ ایچ۔ پوک "رف نوٹس آن خٹکس آف دی تیری کنٹری اینڈ دی خود

آن دی رائٹ بینک آف دی انڈس نیلو اٹک"، سلیکشنز فرام دی پبلک

کارپانڈنس آف دی ایڈمنسٹریشن فار دی اقبیر زراف دی پنجاب" (لاہور

نٹھکوں نے بہت ابتداء میں ہی سماجی تنظیم اور ثقافت کا ایک نسبتاً اعلیٰ معیار حاصل کر لیا۔ قبیلے کے ذیلی حصے دیگر پٹھان گروہوں کے مقابلے پر زیادہ مخلوط ہیں اور ایک قسم کی خونی اشتراقیہ موجود ہے۔ مشہور ترین طائفے خان خیل جن سے یخی اور اکوڑہ نٹھکوں کے تمام سردار ماخوذ ہیں اور فقیر خیل ہیں جو خوشحال خان خٹک کے ایک بھائی کی اولاد ہیں۔

پلوئندے :

سرحد کے بعض متصل پہاڑی قبائل کی موسمی ہجرت کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے لیکن سب سے بڑی اور اہم ترین، ہجرت پلوئندوں میں وقوع پذیر ہوتی ہے جنہیں افغانستان میں کوچی کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ موسم خزاں میں افغان سطوح مرتفع سے آتے ہیں۔ وہ خیبر اکرم، ٹوچی، اگو مل اور سینکڑوں چھوٹے چھوٹے گھماں راستوں سے سرحد عبور کرتے ہیں اور سرحد اور سرحد کے پار سندھ اور پنجاب تک پھیل جاتے ہیں۔ موسم بہار میں وہ افغانستان واپس جاتے ہیں اور اکثر

ہزارہ جات میں سے گزرتے ہیں جہاں وسطی افغانستان کی بلند سطح مرتفع پر ہزاروں سے ان کی جھڑپیں بھی ہوتی ہیں۔ یہ نقل مکانی ہر سال ہوتی ہے اور اس میں ایک تا تین لاکھ لوگ شامل ہوتے ہیں۔

پونڈہ کا معنی محض خانہ بدوش ہے جیسا کہ یہ سرحد میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اکثر خانہ بدوش پٹھان ہوتے ہیں اور وہ قریباً سبھی پشتو بولتے ہیں۔ وہ پٹھانوں کی غلزیٰ شاخ سے تعلق رکھتے ہیں جس کا

تاریخی وطن قندھارا اور میدان غزنی ہے۔ ان کے اہم ترین قبائل سلیمان خیل، علی خیل، اکا خیل، ترکئی، ناصر لونجی ہوٹکا اور خردٹی ہیں۔

اس بحرت میں بظاہر کوئی تنظیم اور یکسانیت نہیں ہوتی بعض حالتوں میں پورے کے پورے گاؤں یکمشت حرکت کرتے ہیں اور اپنے گاؤں کو ساتھ لے کر سوئے سرحدی پہاڑی کی مشرقی اطراف میں اپنے گرمائی نیچے لگا لیتے ہیں۔ دوسرے گروہوں میں ایسے افراد شامل ہوتے

ہیں جنہوں نے اپنے اہل و عیال راستے میں کہیں چھوڑ دیے ہیں اور وہ پاکستان میں صرف اشیائے تجارت لانا چاہتے ہیں۔ کسی وقت

پونڈے وسط ایشیاء اور ہندوستان کے درمیان کاروانی تجارت کے اہم حمال و نقال تھے لیکن موجودہ ایام میں ان کی اکثر درآمدی خام اور بھدے طور پر کھائی ہوئی کھالیں اور لال ٹپ کاٹی ہوئی عمارتی لکڑی پر مشتمل ہوتی ہیں جو افغان سطوح مرتفع میں ملتی ہے۔

کچھ گروہ خوشحال ہوتے ہیں اور وسط ایشیاء کے تمام تعیناتی کے

ساتھ سفر کرتے ہیں۔ مویشیوں اور اونٹوں کے ریوڑ، فرنیچر خدام، اور با افراط غذائی ذخائر۔ کچھ اور فلاکت زدہ ہوتے ہیں اور وہ سخت ترین زرعی مزدوری کے بدلے اپنے چند جانوروں کے لئے خوراک اور چارہ حاصل کرتے ہیں۔ چند کے پاس جانور ہوتے ہی نہیں اور وہ حتیٰ الوسع بنجر علاقے سے دور دور رہ کر پیدل سفر کرتے ہیں۔ معدودے چند سا ہو کار ہوتے ہیں جنہیں سندھ اور پنجاب کے دیہات میں روایتی لیکن غلط طور پر "کابلی" کہا جاتا ہے، جہاں وہ چند روپے اصل زرہ پر سینکڑوں گنا منافع کھاتے ہیں۔

ڈیویڈ لاشن جس نے تاریخ پر آنا طویل اور خونی نشن چھوڑا ہے۔ سابقہ ایام میں پونڈوں کے لئے کوئی مسئلہ پیش نہ کرتی تھی۔ روایتاً وہ نادانستہ طور پر اس سے گزر کر کسی دور افتادہ پہاڑی علاقے کی طرف آتے اور جاتے رہے ہیں یا باقاعدہ سرحدی ناکوں پر محافظوں کی رسمی کارروائیوں کے بغیر ہی گزرتے رہے ہیں۔ پاکستان میں انہیں چینی اور گندم کے راشن کارڈ اور دیگر مراعات بھی دی جاتی ہیں جو یہاں کے مستقل باشندوں کو حاصل ہیں۔

x- یہ اصل میں انگریزوں کے جاری کردہ طریقہ کار کا ہی تسلسل ہے جو انہوں نے سرحد پر قبضہ کرتے ہی شروع کیا تھا۔ دیکھئے میوزیم ڈیرہ اسماعیل خان، سلیکشن، فرام دی بیکارڈز آف دی گورنمنٹ آف انڈیا، ۱۸۵۲ء (کلکتہ، گورنمنٹ آف انڈیا)

ساہا سال تک حکومت پاکستان نے ہجرت کو روکنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ پونڈے مطلوبہ موسمی زرعی مزدوری بہت سے داموں مہیا کرتے تھے اور پھر واپس جاتے ہوئے سرحد کی پاکستانی طرف کے رہنے والے لوگوں کی نسبتاً خوشحالی کے قصے افغانستان لے جاتے تھے پچھلے سالوں میں اسلحہ میں اضافہ کی وجہ سے (جو غالباً ان میں بڑھتی ہوئی خوشحالی کا بھی غماز ہے) خانہ بدوش اب لوٹ مار کرنے والے قبائلیوں کے حملوں کا بھی بہتر طور پر مقابلہ کر سکتے ہیں (زیادہ تر وزیر اور محسود)

سادات اور میاں

علاقے پہاڑی قبائل کے ہوں یا زیر انتظام قبائل کے، ان میں سادات اور میاں خاندان پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کا دیہی زندگی پر بہت اثر ہے جو عموماً بانی خاندان کے تقدس کی بدولت ہوتا ہے۔ سادات آنکھنور کے براہ راست اخلاف ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور وہ عموماً کچھ موروثی مذہبی فرائض ادا کرتے ہیں۔ یہ زیادہ تر قانونی

نوٹ۔ اس باب کے پریمی میں چلے جانے کے بعد حکومت پاکستان نے نئی پالیسی کے تحت ۶۲-۱۹۶۱ء کی سرحد میں پونڈوں کے لئے سرحد بندی کر دی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عالمی لوگوں کی یہ آخری بڑی دسالانہ ہجرت بالآخر ختم ہو گئی ہے۔

اور تقریباً ہوتے ہیں سادات قبائل کے درمیان بہت فتنہ و فساد کا موجب بنے رہے ہیں پھر بھی سیدنا مؤثرؑ ہوتا جتنا ملایا پیر جو اپنے اختیار کردہ مذہبی کردار کے علاوہ قبیلے کے جنگجو طبقات کا جزو لاینفک ہے۔ سادات قریباً آپس میں رشتے نااطے کرتے ہیں لیکن دیگر ہر لحاظ سے وہ اپنے ہمسایوں جیسے ہی ہیں ان میں سے بہت کم ہی عزلی جانتے ہیں اور وہ ثقافت کے اعتبار سے ٹیٹھٹ پٹھان ہی ہیں۔ سادات خاندان سنی بھی ہیں اور شیعہ بھی لیکن آخر الذکر اول الذکر کی نسبت اپنے لوگوں پر زیادہ گرفت رکھتے ہیں۔ انیسویں صدی میں امیران افغانستان نے برطانوی اثر و رسوخ کو زائل کرنے کے لئے اکثر و بیشتر سادات کو قبائل کے درمیان فرقہ وارانہ منابر پھیلانے کے لئے استعمال کیا۔

میاں بھی موروثی خاندان ہیں۔ وہ ایک لحاظ سے ہندو بھارت کے برہمنوں سے ملتے ہیں گوان کا برہمن یا سید کی طرح کوئی براہ راست مذہبی کردار نہیں ہے۔ خاندان عموماً اپنے بانی کے علم و حکمت کی بدولت اعزاز حاصل کرتا ہے، اگرچہ ان بڑے ”میاں“ بہت سے ہیں پھر بھی اکثر خاندان اوسط سے زیادہ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں اور مختلف عالمانہ پیشے اختیار کرتے ہیں جیسے معلمی، طب وغیرہ۔ میاں بھی عموماً آپس میں ہی رشتے نااطے کرتے ہیں لیکن وہ سادات کی نسبت قبیلے کے نظام سے زیادہ مربوط ہوتے ہیں۔

پشاور کی

سرحد کے دارالحکومت کے لوگ محض پشاور کی کہلاتے ہیں۔ وہ پٹھان علاقوں کے وسیع المشرب لوگ ہیں۔ شجرہ نسب میں ان کی کوئی جگہ نہیں مالاںکہ وہ ثقافتاً مکمل طور پر پٹھان ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک علیحدہ نسل ہیں لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ اس نسل کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں، نمایاں ترین عنصر غالباً کشمیری ہے۔

پہلا انگریز جو ۱۸۰۹ء میں شہر پشاور میں آیا تھا اس نے اس کے باشندوں کی تعداد قریباً ایک لاکھ بتائی اور ان کے متعلق لکھا: "تمام اقوام دالسنہ کے لوگ، ہر قسم کے لباس اور شکل و شہات کے، خیر کے سفید پگڑیاں پہنے ہوئے ملے جلے لوگ کچھ سفید یا نیلے پتے اور دوسرے پوستینوں میں ملبوس... ایرانی اور افغان بھورے اوتی بادرے اور کالی پوستین یا رنگین ریشم کی ٹوبیاں اوڑھے ہوئے۔ خیمہ اپنے مزی کے چیلوں اور بے ہنگم لباس میں اپنے پہاڑوں کی سر بلندی لئے ہوئے... ہزارے اپنی پوستین کی مخروطی ٹوپوں کی وجہ سے ممتاز نہیں جن کی اون سرے کی سجاوٹ معلوم ہوتی ہے اور وہ ہی اپنے چوڑے چروں اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی وجہ سے بلکہ ڈاڑھی کے فقدان کی وجہ سے نمایاں ہیں جو شہر کے ہر دوسرے چہرے کی زینت ہے۔ چند عورتیں اپنے لمبے سفید برقعوں میں ملبوس جو

ان کے پاؤں کو چھوتے ہیں۔۔۔“

بیس سال بعد جب عظیم سیاح پارلس نیس ہاتھی پر سوار اس شہر سے گزرا جس پر اس نے درہ کو ہاٹ عبور کیا تھا تو اس نے مخلوط نسلوں کا ایک عجیب و غریب امتزاج، تاجیک، ہندک، پنجابی، کشمیری وغیرہ المعروف بہ بدقماش و مقدمہ باز دیکھے۔^۱

فرید پچیس سال بعد ہر برٹ ایڈورڈز نے، جو سرحد میں رہائش رکھنے والے اولین برطانوی منتظمین میں سے تھا، شہر کے متعلق لکھا ”یہ وحشی اور جنگجو لوگوں کی ایک بڑی، معروف اور روز افزوں آبادی کا شہر ہے جو سب چاقوؤں اور خجروں سے مسلح ہیں اور قدرتی طور پر اپنے دلائل بنوک شمشیر منوانے کی طرف مائل ہیں۔“^۲

شہر کے مخلوط کردار کا تسلسل ۱۸۶۸ء کی پہلی مردم شماری میں بھی ظاہر ہوا۔ اس نے شہر میں کم از کم اکتیس بڑی خاتیں، قبائل اور نسلیں شمار کیں جن میں تعجب خیز طور پر سترہ امریکی بھی تھے۔ بیٹوں

۱۔ ایلفنٹن، ایفنا، ص ۵۶ تا ۵۷

۲۔ مین، ایفنا، جلد اول، ۱۳۲،

۳۔ ہر برٹ ایڈورڈز ”معمولینہ آف دی لائف اینڈ لیٹرز آف میجر جنرل سر ہربرٹ

بی ایڈورڈز“ جلدیں دہلن، لیگن پال، ٹریچ اینڈ کپن ۱۸۸۶ء جلد اول، ۲۲

بعد کے بیانات میں بھی غیر ملکی چاشنی موجود ہے اور پشاور
آج بھی سیاح کے دل کو گدگداتا ہے اور اسے صاف شفاف قلم آزمائی
پسرا بھارتا ہے۔ یہ شہر کبھی منڈی یا صنعتی مرکز کی وجہ سے مشہور نہیں
رہا۔ اس کی اہمیت اس لئے ہے کہ یہ بین الاقوامی تجارت کی شاہراہوں
کا سنگم اور پورے سرحد کا اعصابی مرکز ہے۔ یہ انتظامی اور فوجی صدر
مقام بھی ہے اس کا جادوئی اثر و خواہ دھیمابھی ہے (قبائلی ایجنسیوں
کے دور دراز ترین کونوں تک پہنچتا ہے اور اس کے بازار اور مساجد
قریباً ہر پٹھان کو اس کی زندگی میں ایک
دفعہ مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچ لیتے
ہیں تاکہ وہ اس کے مناظر دیکھ سکے اور اس کی آوازیں

www.freepdfpost.blogspot.com

سن کے بڑے شہر وادی کا حکمگنا تھا کہنا ہے اور پیرا من سیاح کو بہت سی خوشیاں
 دینے کے علاوہ اہل کوہ کے شکم کے کم از کم خواب و خیال کا ہمیشہ سے ایک مرکز کا بھی ہے
 پڑانے شہر کے مغرب میں ایک صاف ستھری چھاؤنی ابھری
 ہے جس کی سڑکیں کشادہ اور پُراستبار ہیں اور جس کے بانغات ہر بار
 ہیں۔ یہاں اہل مغرب اور پاکستانی افسروں کے دفاتر اور کاشانے
 ہیں جو سرحد کے دروہست کے ذمہ دار ہیں۔ غروب آفتاب پر شہر اور
 چھاؤنی کے دروازے اب بھی بند ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ بظاہر پُراست
 لوگ اندھیرے کے بعد بھی کسی رسمی پابندی کے بغیر آ جا سکتے ہیں لیکن
 خال خال ہی ایسا کرتے ہیں اور وہ بھی ہم جوں کی ایک بلکی کی تحریک
 اور اس تلخ یاد کے ساتھ کہ آفریدیوں نے ۱۹۳۰ء میں شہر کو اپنی لپیٹ
 میں لے لیا تھا۔

۱۔ پشاور کی نئی اور تیز افزون یونیورسٹی اسے ایک دفعہ پھر ایک تعلیمی مرکز
 بنا رہی ہے۔ ایلفنٹن نے (ایلفنٹن ایفٹن، ص ۱۸۹) انیسویں صدی کے اوائل
 میں دیکھا تھا کہ پشاور میں بنجارا کے طلباء بنجارا میں پشاور کی طلبہ زیادہ
 تھے۔ ہشت نگر کے ملاؤں کا علم و فضل اور زہد و اتقاء انیسویں صدی
 کے اواخر تک عالم اسلام کے طلباء کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔

دیگر لوگ :

پٹھان جیسے سرحد میں آئے ہیں وہ اس علاقے پر غالب رہے ہیں۔ پھر بھی کچھ غیر پٹھان عناصر اپنا جداگانہ تشخص قائم رکھے ہوئے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے غیر مسلم قبیلے اور فاطمیں جو ۱۹۴۷ء سے پہلے سرحد (مشولہ بدخشی ترین قبائلی علاقوں) میں بکھرے ہوئے تھے ہندوستان ہجرت کر گئے ہیں گو تھوڑے سے ہندو اور بقول بعض سکھ بھی مختلف پٹھان قبیلوں کے تحفظ میں بحیثیت افراد موجود ہیں۔

بلوچ قبائلی جو پاک افغان سرحد کے ساتھ ساتھ جنوب میں رہتے ہیں ڈیرہ بات کے حصوں تک پھیلے ہوئے ہیں ۱۰ اس قبیل کے چند گروہ اپنی مخصوص زبان اور رسومات قائم رکھے ہوئے ہیں لیکن اکثر پشتو قبول کر چکے ہیں، اور پٹھان قبیلوں میں گھل مل گئے ہیں۔ سرحد کے وسطی حصے میں مختلف ہندی الاصل مسلمان گروہ بکھرے ہوئے ہیں ان تمام کو ہند کی کہا جاتا ہے ان میں اہم ترین گوجر ہیں جو یوسفزیوں میں مرکز ہیں اور ان کے کاریگر اور مزارع ہیں۔ گوجر اور انہی جیسا گروہ اعوان ہر سکاٹ سے پٹھانوں سے ملتے جلتے ہیں اور سرحد کے باہر یاد اور وہ یوسفزی کہلاتے ہیں، لیکن قبائلی حیثیت میں ان کی کوئی جگہ نہیں اندرون سرحد انہیں سماجی طور پر گھٹیا سمجھا جاتا ہے گو وفادار اور سختی طفیلی سیاروں کے طور پر۔

شرق سندھ کے ضلع ہزارہ کے باشندے مخلوط النسل ہیں۔
ان کی ثقافت اور حسب و نسب پٹھانوں کی نسبت زیادہ تر پنجابی اور
کشمیری ہے لیکن ہزارہ کے قریباً بیس فی صدی لوگ پشتو بولتے ہیں
اور کئی جداگانہ قبائلی گروہ بندیاں ہیں۔ ان میں اہم ترین جدوں
ترین، دلازک، ترخیلی اور مشوانی ہیں۔

جدونوں کا علاقہ ہری پور کے عین اوپر سے شروع ہو کر ماہڑ
کے عین جنوب تک جاتا ہے اور اس میں ضلعی صدر مقام ایبٹ آباد
بھی شامل ہے۔ وہ غور غشت کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور
سترہویں صدی میں غرب سندھ سے موجودہ علاقے میں آئے قبیلہ
کے تین بڑے حصے ہیں۔ حسن زئی، سالار اور منصورہ۔ ترین ہری پور
کے جنوب اور مغرب کے میدان پر قابض ہیں۔ وہ سٹرنی پٹھان ہیں
اور انگریزوں اور سکھوں کے خلاف بہت عرصہ لڑتے رہے ہیں اور
اس پر بہت فخر کرتے ہیں۔ ان کا ممتاز ترین چشم و چراغ آج کل
محمد ایوب خان، صدر پاکستان ہے۔

دلازک کا کہنا ہے کہ انہیں افغانستان سے مغل شہنشاہ نے باہر
نکالا۔ وہ تعداد میں مھوڑے ہیں لیکن اپنا جداگانہ وجود قائم
رکھے ہوئے ہیں۔ وہ زیادہ تر ہری پور میدان کے مشرقی سرے پر رہتے
ہیں۔ ترخیلی ضلع ہزارہ کے انتہائی جنوب مغربی کونے میں رہتے ہیں
سندھ کے ساتھ ساتھ اوراکھ سے کچھ زیادہ اوپر نہیں۔ وہ صرف چند

ہزار ہیں، مشرقی تریخیوں کے شمالی ہمسائے ہیں۔ ان میں سے بہت سے دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ سید بھی ہیں اور پٹھان بھی، وہ بھی سکھوں کی مزاحمت کرتے رہے ہیں۔ ضلع ہزارہ کے شمالی حصہ گلگت اور شمال مشرق کی طرف پھیلی ہوئی ایک بڑی قوس میں جو ہمالیہ کے بیچ میں سے سندھی کوہستان، بالائی سوات اور چترال کو جاتی ہے، ایسے لوگ رہتے ہیں جنہیں پٹھان کوہستانی کہتے ہیں، اس مغربہ میں بہت سے مختلف زبانیں اور نسلی گروہ ہیں لیکن سب کے سب ایک دوسرے سے ایک خاص مشابہت بھی رکھتے ہیں۔ وہ مرد و زنان کے دوران منگول، چینی، ایرانی اور پٹھان خون کا برصغیر کے ابتدائی آریہ حملہ آوروں کے خون سے امیزاج کا ثمرہ معلوم دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض جیسے ہنزہہ کا شاہی خاندان سکندری یونانیوں کی براہ راست اولاد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

اس علاقے میں شیعہ فرقہ غالب ہے جس کے ماورائے ہمالیہ سکیانگ میں کاشغر کے ارد گرد کے علاقے کے ساتھ گہرے ثقافتی تعلقات ہیں۔ ایک گروہ کافر، جو جنوبی چترال کی تین چھوٹی پھوٹی وادیوں میں رہتا ہے، کبھی مشرف بہ اسلام نہیں ہوا اور ابھی تک ایک قسم کی فطرت پرستی کا قائل ہے، سواتی نامی ایک بڑا گروہ پٹھان ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور سندھ کے دونوں طرف بالائی حصوں میں رہتا ہے۔ یہ لوگ بظاہر وادی سوات کے اصلی باشندے تھے اور

یہی ان کی وجہ تسمیہ ہے۔ انہیں یوسفزئیوں نے سترہویں صدی میں نکال باہر کیا۔ اگر وہ پٹھان جمعیت کا حصہ بھی تھے تو بھی وہ دورِ حاضر میں اس سے بہت حد تک کٹے ہوئے ہیں اور انہیں سوات کے موجودہ باشندوں سے منسوب نہیں کرنا چاہیے جن میں سے اکثر یوسفزئی پٹھان ہیں جیسا کہ پہلے ذکر ہوا۔

ہمالوی گروہوں میں اہم ترین چترالی ہیں۔ یہ لوگ سرحد کے انتہائی شمال مغربی کونے میں رہتے ہیں۔ ان کی زبان خواریا کھوار ہے اور اس میں ان کا علاقہ کھوکھلا تا ہے۔ وہ قریباً ایک لاکھ ہیں اور اڑھزار فٹ اونچے درہ لواری کے ذریعے ویرا اور سوات سے علیحدہ ہو جاتے ہیں جو جنوب کی طرف سے ریاست میں داخل ہونے کا واحد قابل گزر راستہ ہے۔

چترالیوں کے تین بڑے حصے ہیں (۱) آدم زادہ جو شرفاء کا طبقہ ہے اور جس کا سربراہ مہتر چترال کا خانوادہ ہے (۲) اربا زادہ جو چھوٹے چھوٹے اہلکار اور تجارت پیشہ لوگ ہیں اور (۳) فقیر، مساکین جو غرباء ہیں۔

۱۔ اکثر لوگ معنی اور بے فریبی سیکن آدم زادہ کی خاندانی تاریخ اتنی ہی خوں ہے جتنی کہ دنیا میں کسی حکمران گروہ کی ہو سکتی ہے ۱۸۹۲ء میں

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ)

جب مہتر اعظم امان الملک مراٹو ۱۷۰۱ء میں سے اس کے ۱۶ بیٹے جنگ تخت نشینی میں موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ یہ مسئلہ بالآخر اس وقت حل ہوا جب انگریز آرمی کے اور انہوں نے باقی ماندہ بیٹے کو تخت پر بٹھا دیا۔ شجاع الملک ایک ذہین، قابل اعتبار چھوٹا سا لڑکا، نو یا دس سال کا، دیکھنے میں فریبکہ اور جادو جانینگ سبب ”دی ریلیف آف چیرال“ (لندن، میکملین، ۱۸۹۵ء)

ص ۱۷

باب سوم

سماجی تنظیم

تعارف :

اپنی خونخواری اور ناقابل رسائیت کی وجہ سے پٹھان دنیا کے دیگر بہت سے قدامت پیوستگان کے مقابلے پر ایک بلاٹ یعنی سیاہی کے دھبوں کے جائزوں بشمولیائی اور شمار یاتی بشریات کی جانچ پڑتال سے بہت کم گزرے ہیں۔ لہذا ان کی کردار نمائی کی ہر کوشش کا انحصار بنیادی طور پر انہی کی تحریرات اور افعال پر ہوگا اور شانوی طور پر ان معدودے چند بیگانوں کے تجربات پر ہوگا جنہوں نے ان سے قریبی رابطہ پیدا کیا ہو۔

ایسے مطالعہ سے جو اہم تاثر پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ پٹھان کا وصف اعلیٰ اس کی انفرادیت پسندی اور یہ قبائلی رکفیت کے مقرر کردہ کٹر رویہ جاتی معیارات کے باوجود تاہم کئی اہم روایاتی اور سماجی عوامل ہیں جو اجتماعی زندگی کی رہنمائی کرتے ہیں اور اثرات

میں افراد کے اعمال پر اثر انداز ہوتے ہیں بلکہ انہیں معین کرتے ہیں۔
یہ عادات و اطوار پٹھان علاقے کے مختلف حصوں میں کافی حد تک
مختلف ہیں اور ان کو ضبط تحریر میں لانا قریباً ناممکن ہے لیکن ان
میں سے بعض ہر جگہ یکساں ہیں اور ان کا کچھ علم ضروری ہے تاکہ یہ سمجھا
جاسکے کہ پٹھان کیلئے اور وہ اس نہج تک کیسے پہنچا۔

پنجتون ولی:

خوشحال خان نے اپنی ایک نظم میں کہا ہے،
میں اس شخص سے نفرت کرتا ہوں جو اپنی زندگی عزت سے
ہنیں گزارتا

عزت کا لفظ ہی مجھے پاگل بنا دیتا ہے،
اور پاگل آدمی کو سود و زیاں کی کیا پروا ہے؟“
عزت کے تقاضے پنجتون ولی میں مضمر ہیں جسے بعض اوقات
تنگ پنجتون یا پنجتون فضا بطعریات بھی کہا جاتا ہے۔ پشتو بولنے
والے پورے علاقے میں شاید کوئی ایسا بچہ اور بچی بھی نہ ملے جو پنجتون
ولی کے اہم عناصر سے آشنا نہ ہو۔ یہ آنا ہی قدیم ہے جتنی پٹھان تاریخ
اور روایت کے مطابق اس سے بھی قدیم تر۔ پشتو میں اس پر
طویل و مبسوط تفسیریں لکھی گئی ہیں اور اس کے بعض لطیف نکات
علماء و فضلا کے درمیان ایک غیر مختتم موضوع بحث بنے رہتے ہیں۔

لیکن اکثر و بیشتر عمومی فلسفیانہ تصورات جن پر نظام قوانین ایستادہ ہے پٹھان کے پہنچ سے بہت باہر ہیں اور عام قسم کے قواعد و ضوابط بطور اپنے بے شمار ادا و مرد و نو اسی اس کے سامنے پیش ہیں لہذا وہ اپنی زندگی چند سادہ سے اصولوں کی بناء پر گزارتا ہے۔

بدل،

ان میں سے اولین اور عظیم ترین بدل ہے یعنی بدلہ جس کی کتنی بھی قیمت کیوں نہ دینی پڑے یا کتنے بھی نتائج کیوں نہ بھگتنے پڑیں ایسے شواہد موجود ہیں کہ ابتداءً بدلہ صرف مظلوم ہی لے سکتا تھا اور بصورت قتل مقتول کا خاندان 'صرف اس فرد سے جس نے نقصان پہنچایا ہو' لیکن بدلے کی پابندی مدتوں سے مورد توہین یا مجروح قبیلہ پر بحیثیت مجموعی عائد ہوتی ہے اور اس کا مداوا اسی صورت میں کیا جاسکتا ہے کہ فرد متعلقہ اور جارح قبیلہ کے خلاف کارروائی کی جائے اس کا نتیجہ خوئیں جھگڑوں کی صورت میں نکلا ہے جو بین القبائلی تعلقات کو متاثر کرتے ہیں جو پورے کے پورے خاندانوں اور چھوٹے چھوٹے قبیلوں کو نیست و نابود کرنے کے ذمہ دار ہیں پھر بدل میں زمان و مکان کی

۱۔ دیکھئے گورنمنٹ آف انڈیا، سنٹرل ایشیا، پارٹ I، III، ص ۲۶۶

۲۔ دیکھئے پینن، ایضاً، ص ۸۲

کوئی قید نہیں اور ناقص گیری ضروری ہے جب تک قبیلہ کا ایک فرد واحد بھی زندہ ہو۔ کلکتہ اور سنگاپور جیسے غیر پٹان ماحول میں کبھی کبھار کاشت و خون کسی ایسے جھگڑے کا نتیجہ ثابت ہوتا ہے جو خیر یا گول میں کسی مدت بعد میں شروع ہوا تھا۔

میلستیا

بخنوں ولی کا دوسرا اہم ترین تقاضا میلستیا یا مہان نوازی اور مہان کا تحفظ ہے۔ قبائلی اس پر اس حد تک عمل کرتے ہیں کہ وہ اس اوقات مہان کے لئے باعثِ رحمت ہو جاتا ہے خواہ وہ ایک غیر ملکی ہو جو جانتا ہے کہ وہ کبھی اس کا بدلہ نہ چکاسکے گا، اور خواہ ایک ہم قبیلہ ہو جو ڈرتا ہے کہ موقع آنے پر وہ اس کا پورا بدلہ چکانے سے قاصر رہے گا۔ میلستیا تحفظ اور خورد و نوش کی دگرگتہ پابندی عائد کرتا ہے، گویہ پابندی اسی لمحہ ختم ہو جاتی ہے جب مہان میزبان کی دبیر سے باہر قدم رکھے یا اس کی علاقائی ذمہ داری کی سرود سے نکل جائے۔ کبھی کبھی تحفظ کا دائرہ اس قدر وسیع کر دیا جاتا ہے کہ سیاح کو کسی خاص سردار یا قبیلے کا مہمان قرار دے دیا جاتا ہے جب تک وہ پٹانوں میں رہے اس کی روایتی علامت ایک خنجر یا لباس ہوتا ہے جو ذمہ گیر سردار کی طرف سے دیا جاتا ہے اور جسے مہان نشانِ محافظ کے طور پر پہن لیتا ہے۔ کسی اجنبی یا ایچی

یاد دشمن کے لئے ایک رسمی محافظہ و رستہ یا ضمانت تحفظ بدرجہ کہلاتا ہے۔ کسی مسئلہ مہمان پر کسی قسم کوئی سختی نہیں کی جاتی اور رستہ ہی اسے کوئی چوٹ پہنچائی جاتی ہے خواہ وہ کتنا بھی غریب یا خلف طبع کا کیوں نہ ہو کیونکہ اولاً میلستیا کی پابندی واجب التعمیل ہے اور ثانیاً ایسی صورت میں انتقام گیری میربان پر لازماً ہو جاتی ہے۔ کوئی بھی جو کسی پٹھان یا بالخصوص اس کے گھریلو پہنچ سکتا ہے میربان سے پناہ مانگ سکتا ہے خواہ ان کے سابقہ تعلقات کیسے بھی رہے ہوں۔ ایسے واقعات ہوئے ہیں جن میں بے گناہ لوگ اجنبیوں یا اپنے ذاتی دشمنوں کو بچاتے ہوئے مارے گئے مہجھنوں نے اپنے حریفوں کے تعاقب کی وجہ سے پناہ مانگی تھی۔

انگریز ارباب بے دست و کش و عام طور پر پنجتون دلی کا احترام کرتے

۱۸۳۶ء و ۱۸۳۸ء کے دربار کابل کے لئے برطانوی ایچی ایگنڈہ نڈر برتہ "کابل" اے پرسنل نیٹو آف

اے جزمی انڈر نیڈنس ان ڈیٹ سٹی ان دی ایریز ۶ ۱۸۳۶ء تا ۱۸۳۸ء

لنڈن جے مرے ۱۸۳۶ء پنجتون ولی کی انتہائی کہانی میں افسانوی لیکن

حقیقت پسندانہ طور پر بیان کی گئی ہیں یعنی "دی لورز آف قندھار"

میں جو کاؤنٹ گو بی نیو کی "بیلز آف ایشیا" (لنڈن، جیو فری پریس)

۱۹۶۷ء) میں شامل ہے۔

تھے اور آزاد قبائل کو اس کے مطابق زندگی گزارنے کی اجازت دیتے تھے لیکن میلیمیا کی پابندیاں اکثر مشکلات پیدا کرتی تھیں، مشترکہ قبائلی ذمہ داری کے انگریز اصول کے تحت حکومت اصرار کرتی تھی کہ قبائل زیر انتظام ضلعوں میں سنگین جرائم کے مرتکب افراد کو تحفظ نہ دیں اور انہیں حکومت کی تحویل میں دیدیں جو پہاڑیوں میں پناہ لے چکے تھے۔ انفرادی مینز بان اور اکثر پورے کے پورے طاقتور یہ بات نہ مانتے تھے اور کوئی بھی طرف اپنا اصول چھوڑنے پر تیار نہ ہوتی تھی۔ وظائف بند کر دیے جاتے، ہجرت بھی بھیجی جاتی، پل اڑا دیے جاتے اور دستوں کو زرخیز میں لے لیا جاتا اور سرحد میں ایک اور فتنہ کھڑا ہو جاتا۔

سرحد کے اولین ارباب نظم و نسق میں سے ایک نے جس نے اپنے محکومین کی اور کوئی تعریف نہیں کی، اپنی سرکاری رپورٹ میں اعتراف کیا کہ ”وہ سونا لے کر سب کچھ کو گزریں گے سوائے ایک جہان کو دھوکہ دینے کے۔ اس نے مزید لکھا ”کوئی بھی جوان کے گھروں میں چلا جائے نہ صرف محفوظ ہوگا بلکہ اس کا پر تپاک استقبال کیا جائے گا“۔

۱۔ رچرڈ ٹیلر، رپورٹ شوٹنگ دی ریلیشنز آف دی برٹش گورنمنٹ و دی ٹرائیبر، انڈی پینڈنٹ، انڈی پینڈنٹ، آن دی نارٹھ ویسٹ فرنٹیئر آف دی پنجاب، مشمولہ ”سیکیشنز فرام دی ریکارڈز آف دی گورنمنٹ آف انڈیا ۱۸۵۶ء دکن گورنمنٹ آف انڈیا“ ص ۵۵

میلستیا کی واحد خلاف ورزی جو عموماً تسلیم کی جاتی ہے دگو یہ مرکب کو بدل میں طوٹ کر دیتی ہے (چھپ کر کسی بیرونی سیاح پر گولیاں چلانے کی رسم ہے جب وہ دشمن قبیلہ کی سرزمین پر ہو۔ یہ وزیرستان میں عام ہے، اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ارباب اختیار اس قبیلے کو زیرِ عتاب لے آئیں جہاں یہ جرم ہوا ہو۔ بدلہ اور مہمان نوازی پختون ولی کے دو عظیم احکامات ہیں کئی دوسری واضح رسومات و روایات بھی ہیں جو قبائل میں مختلف درجوں کے اداروں کی شکل میں موجود ہیں اور پٹھان طرز زندگی کے مطالعہ میں قابل ذکر ہیں۔

ننواتی در

ان میں ایک ننواتی کافی تنازعہ فیہ ہے۔ اکثر انگریز قلم کار مشمولہ بہ مستند علما مثل ٹریوٹس اور کیرزن ننواتی کو محض پناہ یا پناہ گاہ بتاتے ہیں یعنی کسی کو بھی حتیٰ کہ دشمن کو بھی مانگتے پر تحفظ دینے کی پابندی۔ کیرزن ننواتی کو میلستیا کی توسیع سمجھتا ہے اور اس کی یوں تعریف کرتا ہے "ایک ماحصل مصدر بمعنی اندر آنا"۔

۱۔ کیرزن، ایف، ص ۳۵۱، ڈیریس، ایف، ص ۹۴، ایک قدیم تبرطانوی عالم ننواتی کی دوبہری تعریف کرتا ہے "تحفظ جو کسی کو دیا جائے جو انتہائی مجبور یا میں کسی کی چھت کے نیچے پناہ ڈھونڈے یا معاسحت جسے عموماً ایک کمزور فریق اختیار کرتا ہے تاکہ مجروح کے ساتھ صلح صفائی ہو سکے" بجوئے، ایف، ص ۱۹۔

لیکن پٹھان خود اس تعریف کو تسلیم نہیں کرتے۔ پناہ اور پناہگاہ کے تصورات مسلمانوں کے ہی حصے سمجھے جاتے ہیں۔ کم از کم آج کل ننواتی ایک مختلف چیز ہے، یہ ایک دشمن کے ہاں اندر جانا، یا اس کے سامنے گھٹنے ٹیکنا ہے جو اس کے اختیار کنندہ کے لئے ایک شرمناک منصوبہ رکھتی ہے اور جس کو یہ پیش کی جاتی ہے اس پر قبولیت کی پابندی عائد کرتی ہے مثلاً ایک قبائلی نے دوسرے کو ایسی زک پہنچائی ہے کہ اپنے خلاف بدلے کو دعوت دیدی ہے۔ وہ یا اس کا خاندان اتنے کمزور یا بُر دل ہیں کہ نتائج نہیں بھگت سکتے۔ بدلہ سے پہلے ہی وہ اپنے دشمن کے پاس چلا جاتا ہے اقبال جرم کہتا ہے اور اپنے کو دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے۔ مزید نیچا ہو کر وہ اپنی مستورات کو بھی ساتھ لے جاتا ہے بے پردہ اور قرآن بدست تاکہ دشمن مطمئن ہو سکے۔ اگر دشمن مائل ہو تو وہ پشیمان سے بھیڑ لے سکتا ہے، جگرگہ ہو سکتا ہے اور بدلے کا حق اور پابندی ترک کئے جاسکتے ہیں۔ اس طرح ننواتی پناہ کی بجائے ہتھیار ڈالنا ہے۔ پٹھان جو ہیں سو ہیں لہذا سرحدیں یہ طریقہ اکثر استعمال ہوتا ہے۔ پٹھانوں کے لئے پیس کا پس ڈیگر قانونی حراست کے خلاف ملزم کا یہ حق کہ اسے اصالتاً عدالت میں پیش کیا جائے۔ مترجم اور فقہ یا پانچویں منڈ منٹ یا ترمیم نامہ کی دستور کا ایک ایسا ہی قانون جو حقوق ملزمین سے متعلق ہے۔ مترجم کا کوئی معنی نہیں لیکن

قبائلیوں کی اپنی، سی قانونی اصطلاحات ہیں جو یکساں طور پر اہم تصورات کا احاطہ کرتی ہیں ایک جرگہ کسی شخص کو دشمن قرار دے سکتا ہے یعنی کسی کا سرکاری طور پر مسئلہ دشمن۔ اس کے تحت اول الذکر کو اسے مارنے کا حق مل جاتا ہے جسے جماعت نے تسلیم اور منظور کیا ہے اس کے برعکس جرگہ یہ بھی اعلان کر سکتا ہے کہ مقتول توئی دلفظی معنی گرایا یا بھایا (سہا) ہے یعنی اس کی موت کسی موروثی جھگڑے کے تعاقب میں ہوئی، اب حساب برابر ہے۔ ادلے کا بدلہ ہو چکا اور انتقامی کشت خون کا کوئی جواز نہیں۔

ایک اور قسم کا قتل جو پختون ولی کے مطابق جائز نہ ہونے کے باوجود بد قسمتی سے عام ہے میرا تا کہلاتا ہے۔ یہ قتل اس لئے کیا جاتا ہے کہ مقتول کو سلسلہ وراثت سے نکالا جاسکے تاکہ جائیداد قاتل یا اس کے پسندیدہ شخص کو مل جائے۔

اصناف کے باہمی تعلقات میں جینے اور توڑ کے تصورات اکثر ملوث ہوتے ہیں۔ ایک آدمی کسی خاص لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن اسے ڈر ہے کہ اسے کوئی اور لے جائے گا کیونکہ وہ اس کے خاندان کی مطلوبہ شرائط پوری نہیں کر سکتا یا پھر اس کی منگنی کی کہیں اور بات ہو رہی ہے تو وہ یکطرفہ اعلان کر دیتا ہے کہ اس کا اس لڑکی پر جینے یا حق ہے گویا اگر کوئی دوسرا اس پر اپنا حق جتائے تو اسے پہلے اس آدمی کا سامنا کرنا ہوگا اس سے اگر وہ لڑکی نہ بھی لے

کے تب بھی کم از کم وہ اس کے رشتے کے مذاکرات میں کسی نہ کسی طرح ملوث ضرور ہو جاتا ہے۔

تور:

(لفظی معنی سیاہ) کھلم کھلا جرم یا سیاہ کاری ہے۔ مثلاً اگر یہ پتہ چل جائے کہ کوئی عورت کسی آدمی کے ساتھ ناجائز تعلقات رکھتی ہے تو اسے اس آدمی کے ساتھ تور (اور اس آدمی کو اس عورت کے ساتھ تور) قرار دے دیا جاتا ہے اور وہ دونوں مستوجب قتل ہو جاتے ہیں۔

شر مالہ:

ایک خصوصی جرگہ ہے جو جالاج یا اس کے نمائندوں کی طرف سے بلایا جاتا ہے تاکہ کسی جھگڑے یا تنازعہ کا مذاکراتی فیصلہ ہو سکے۔ معاوضہ پر اتفاق کیا جاتا ہے، بھیڑ دی جاسکتی ہے اور بیٹی کی شادی کی پیشکش ہو سکتی ہے۔

لڑائی میں آخری صلح (جو بالآخر فیصلہ کن صلح بن سکتی ہے) جو جرگہ یا حکومت کرائے ایک پتھر رکھ کر منائی جاتی ہے جسے سنگہ کہتے ہیں جو کم از کم ایک عارضی صلح کی علامت ہے۔

اہم معروف:

جماعت کے کسی چھوٹے سے جھگڑے کا عمومی طور پر تسلیم کردہ فیصلہ ہوتا ہے۔ معمولاً کسی مخصوص علاقے کے ملا اپنے ہی طبقے کے کسی نامند کی زیر سرکردگی اور ملک کی کم از کم پیشگی رضا مندی کے ساتھ ایک خود مختار مصالحتی یا مذاکراتی کمیٹی کی حیثیت سے جاتے ہیں اور اختلاف کے اسباب کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً کسی خاص سود خوار کی بہت زیادہ شرح سود پر عوامی تنقید و احتجاج ۱۰ ان کے فیصلے عموماً تسلیم کر لئے جاتے ہیں۔

پنجتون ولی کی قدر و قیمت در

بوجودیکہ اس نے خوہیں جھگڑوں کو دوام بخشتا۔ پنجتون ولی نے جنگو قبائل کے معاشرے میں زیادہ سے زیادہ ممکنہ امن و امان فراہم کیا ہے۔ یہ پتہ ہے کہ اکثر و بیشتر فرد ہی اس ضابطے پر عمل کرتے ہیں لیکن پوری جمعیت اس کے فعل کی حقانیت پر متفقہ طور پر نظر ڈالتی ہے اور اس کی حمایت یا مخالفت کرتی ہے۔ پنجتون ولی اب بھی قبائلی علاقے میں ہر سحاطے مضبوط ترین قوت ہے اور پہاڑی بٹھان افغانستان اور پاکستان کے زیر انتظام ضلعوں کے بھائیوں کے برعکس سوائے اپنے قانون کے کوئی اور قانون تسلیم نہیں کرتے۔ اپنی دورا فتادگی اور طاقت کی وجہ

سے اہل کوہ نے اپنا قبائلی معاشرہ برقرار رکھا لہذا وہ کافی حد تک اس ثقافتی اور نفسیاتی تناؤ سے محفوظ ہیں جو زیادہ مہذب اور پٹھانوں کو گھیرے رکھتا ہے جو پاکستان کے برطانوی قسم کے سول قانون کو اپنے ہاں پختون ولی کے تقاضوں کو اکثر پس پشت ڈالتا ہوا دیکھتے ہیں۔ اقتصادی، سماجی اور سیاسی دباؤ بلاشبہ و شبہ سرور زمان کے ساتھ اس صورت حال کو بدلیں گے گو پچھلے سو سال میں ان کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ لیکن سر دست کم از کم پہاڑی قبیلے اپنے آبائی قانون کے بل بوتے پر زندہ ہیں اور وہ باقی دنیا کو برائے نام ہی مراعات دیتے ہیں۔

پختون ولی پر رویہ کے ایک ناگزیر معیار کی حیثیت سے کبھی کبھار برطانوی اور پاکستانی قبائلی نظم و نسق کے تقادوں نے سخت تنقید بھی کی ہے۔ اس استدلال کے مطابق پختون ولی بنیادی طور پر ایک ثقافتی روایت ہے اور اس نے اپنی موجودہ فضیلت صرف اس لئے حاصل کی کہ اہل برطانیہ اور پاکستان نے جنگی اور حفاظتی وجوہات کی بنا پر پٹھانوں کو انیسویں اور بیسویں صدی کے قانونی ارتقاء سے مستفید نہیں ہونے دیا۔ فرید سہا جاتا ہے کہ قبائلی ضابطے سے واحد قانونی استفادہ فریئر سرائمز ریگولیشن میں کیا گیا جو قبائل کے ارتقاء سے زیادہ ان کو مرعوب و مغلوب کرنا چاہتا تھا۔ اس دلیل میں صحت کا عنصر موجود ہے۔ یہ یقیناً درست ہے کہ قبائلی علاقے میں پختون ولی

کی بالادستی کی کم از کم جُزوی وجہ یہ ضرور ہے کہ اس کے مقابل کوئی نظام قانون نہیں لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ سرحد کی افغان طرف کے قبائل جو باقی افغانستان کی طرح انہی قومی اور شرعی قوانین کے ماتحت ہیں (خواہ برائے نام ہی ہوں) اب بھی اپنے معاملات پنچتون ولی کے مطابق ہی طے کرتے ہیں۔ پاکستانی پہاڑی قبائل کے ہاں ایک مقابل نظام قانون کا فقدان اس لئے نہیں کہ انگریزوں اور پاکستانیوں نے اسے انہیں پیش کرنے سے انکار کیا بلکہ زیادہ تر اس لئے ہے کہ قیامیوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ وہ اب بھی کرتے ہیں۔ گو وہ سکولوں اور طبی ہسپتال سے مستفید ہونے کے بھی مشتاق ہیں۔ اپنے میدانی بھائیوں کے برعکس وہ اب بھی ایسی حیثیت کے مالک ہیں کہ تہذیب کے فرامد میں سے چھٹنے اور چھانٹنے کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔

جرگہ ہر

جرگہ اپنی سادہ ترین شکل میں محض ایک اسمبلی ہے۔ قریباً تمام اجتماعی امور خواہ وہ سرکاری ہوں یا عوامی اس کے دائرہ اختیار میں ہیں۔ اپنی کارکردگی میں یہ غالباً ابھتر کی جمہوریت سے قریب ترین ہے جو قدیم الایام سے موجود رہی ہے۔ یہ انتظامی عدالتی اور قانونی فرائض ادا کرتا ہے اور اکثر و بیشتر ثالثی یا مصاست کا ذریعہ بھی ہے۔ منزل سفر، سکھ جرنیل، برطانوی ارباب اختیار

غیر پیشانی قبائلی، پاکستانی سیاستدان اور امریکی مشاہیر مرد و زنانہ کے دوران جرگوں کے روبرو پیش ہوئے ہیں۔

ایلفٹن سن ۱۸۰۹ء میں کابل جاتے ہوئے سرحد میں سے گزرتے ہوئے اس نے جرگہ کو ایک بے حد منظم ادارے کی صورت میں دیکھا۔ اس کا بیان ایک سوئٹ نظام کے مشابہ ہے جس میں کندی دوارڈ یا چھوٹا سا گھاؤں (جرگہ اپنے نمائندے دیہی جرگہ میں بھیجتا تھا جو اپنے منتخب ارکان خیل جرگہ میں روانہ کرتا تھا جس کی نمائندگی بڑے قبائلی جرگہ میں ہوتی تھی۔ ہوتے ہوتے ہر قبیلہ کے بہترین نمائندے نوے (عظیم بڑے) جرگہ میں بیٹھتے تھے جو امیر کابل کو مشورہ دیتا تھا اور موقع ملنے پر اسے تخت پر بٹھاتا یا تخت سے اتار دیتا تھا۔

آج کل کا جرگہ سٹم کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے لیکن چونکہ پٹان دو الگ الگ ملکوں کے شہریوں میں تقسیم ہو گئے ہیں لہذا اسے جرگہ پوری پٹان آبادی کا نمائندہ نہیں رہا۔ اہم جرگہ میں ہر کندی، خیل اور قبیلہ کی

۱۔ ایلفٹن سن، ایضاً ص ۵۸ تا ۱۸۷۔ نیز جیمز، ایضاً ص ۴۵

۲۔ حکومت افغانستان نے نوے جرگہ کو اپنے سیاسی ڈھانچے کا حصہ بنایا

ہے لیکن اس کے اجلاس شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں اور وہ بھی عموماً حکومت کی

پالیسی کی تائید کرنے کے لئے برنظر ثانی کے بعد اس کی رکنیت پٹان قبائل کا

بجائے افغانسان کے مختلف اندرونی گروہوں تک پھیلا دی گئی ہے۔

نمائندگی ضروری ہے، انتخابات اور تعارفی و تصدیقی اداروں کا کوئی وجود نہیں، نمائندے عام طور پر ہاتھ کے ہاتھ ہی چنے جاتے ہیں اور قریباً ہمیشہ عمر، فراست اور ساکھ کی بنیاد پر۔

جرگہ بنیادی طور پر ایک گول میز کا نفرنس ہے اس کا کوئی مقصد یا ممبر مجلس نہیں ہوتا۔ ہر وہ آدمی جس کے مفادات متاثر ہوتے ہوں بولنے کا حق رکھتا ہے۔ فیصلے لازماً متفقہ ہوتے ہیں اور دُعا پر مختتم ہوتے ہیں اگر ایسا نہ ہو سکے تو جرگہ منتشر کہہ جاتا ہے۔ جرگے کا انعقاد وزیرستان کی کسی گمراہ و آلود سڑک کے پاس کسی تنہا درخت کے سائے تلے بھی ہو سکتا ہے یا پشاور کے گورنمنٹ ہاؤس کے کشادہ سبزہ لان پر بھی۔

ایک بڑا جرگہ ایک متاثر کن منظر پیش کرتا ہے۔ مبصر اگر قریب سے دیکھتا ہو اور تھوڑی سی پشتو بھی جانتا ہو تو وہ کچھ مانوس نمونے پہچان سکتا ہے۔ مقررین میں سے ایک عموماً بہت سنجیدہ طویل گفتار سفید ریش ہوتا ہے جو نہایت متانت سے روایت و صداقت کی پاسداری کی تلقین کرتا ہے۔ اس کے جواب میں ایک چیر جو ش سر بھرا نوجوان بولتا ہے اور بولتے سے زیادہ لڑنا چاہتا ہے اور ان میں سے جس طرف بھی نکل جائے اس کا رُکن محال ہو جاتا ہے۔ اگر تباہ کھل کر سامنے آ جائے تو ایک نرم گفتار، نازک خیال ادیبِ عمر کا ملک اپنے سامعین کو اتفاق نہیں تو کم از کم قریب الاتفاق لانے کی کوشش کرتا ہے، پھر ایک زندہ دل، کھری، کھری سننے والا پیچھے بیٹھا

ہوا، تالیاں بجانے والا، اس نرم ساختہ گمردہ کو کسی فیصلے پر لانے کے لئے کچھ گستاخانہ اور بے مجاہدانہ کوشش کرتا ہے، پیشتر اس کے کہ سلسلہ کلام کا رخ پھر بدل جائے۔

قریباً ہمیشہ بحوم کے سرے پر کہیں بیزار مخالف بھی بیٹھا ہوتا ہے پگڑی سے اپنا آدھا پہرہ چھپائے ہوئے اور اپنی چال ڈھال اور حرکتوں سکنت سے یہ ظاہر کرتا ہوا کہ وہ جسمانی طور پر تو موجود ہے لیکن روحانی طور پر نہیں۔ ناگزیر طور پر وہاں زاہد و عابد بھی ہوتا ہے۔ نوجوان اور دُبلّا پتلا یا معمر اور مٹھوس جو اللہ کا نام لیتا ہے تو اس کی آنکھوں میں ایک غیر ارغی، ملکوتی قہر چمکتا ہے۔ دیرینہ مسائل کا حل عموماً کافی آگے بیٹھا ہوا شائستہ اور سرگردہ ملک کرتا ہے جو تمام آرا پر سر ہوتا ہے لیکن بولتا ہے تو انہیں صرف کسی نقطہ اتفاق پر لانے کے لئے۔ لباس اور زبان کے سوا یہ کسی بھی امریکی سیاسی اجتماع کی جلسہ گاہ کی مانند ہے۔

آج کل جرگے کی کارگزاری کے تین اہم دائرے ہیں۔ اپنی وسیع ترین خالص ترین شکل میں یہ قبائلی معاشرے کے اندر ہر سطح پر زندگی کو منضبط کرتا ہے جو پوری برادری کے لئے توجہ طلب ہوتی ہے مثلاً ایک نئی مسجد کے لئے جگہ کا انتخاب، خانگی بے وفائی کی سزا، خونیں جھگڑے کا فیصلہ یا ایک ہمسایہ قبیلے کے خلاف ہتھیار اٹھانے کا فیصلہ۔ ثانیاً جرگہ ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے قبیلے

کے فیصلے یا آرا حکومت کے گوش گزار کئے جاتے ہیں اور حکومت کے فیصلے قبیلے کو پہنچائے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے جرگہ قبیلے کے خارجی تعلقات کا ضامن ہے اور اسے کسی خاص لائحہ عمل سے وابستہ کر سکتا ہے۔

تیسری شکل نام نہاد سرکاری جرگہ ہے جو حکومت پاکستان کے کسی افسر کے مقرر کردہ افراد پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کا رواجی پنچتون ولی سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ یہ فرنیڈز کرائمز ریگولیشنز (دیکھئے باب ششم آگے) کے تحت جرائم کا فیصلہ کرنے کے سلسلے میں اس افسر کے لئے مشاورتی جیوری کی حیثیت رکھتا ہے۔

جرگے میں رائے شماری شاذ و نادر ہی ہوتی ہے۔ "اجلاس کا مجموعی ردِ عمل" عموماً اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے گو اس کا مفہوم بسا اوقات پیرامن سوسائٹی آف فرنیڈز دسترسوں صدی کے نصف آخر میں خارج فوکس کی بنا کردہ - مترجم) کی روحوں کو بھی مجھد کر دے گا جنہوں نے یہ اصطلاح وضع کی تھی۔ جرگے کے مسلح افراد بشرطِ ضرورت تعمیل فیصلہ کرنے والے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ جرگے کو جو تقدس حاصل ہے وہ اس حقیقت سے ظاہر ہے کہ یہ شاذ و نادر ہی اختلاف سے منتشر ہوتا ہے۔ پٹھان کی متکون فطرت اور بھاری اسلحہ کے پیشِ نظریہ واقعی روایت کی جبلت پر فتح کا نام ہے۔

جرگے کی حکم عدولی کی روایتی سزا مجرم کے گھر کو جلا ڈالنا ہے۔ یہ خاص طور پر مؤثر ہے کیونکہ ایک پٹھان کا گھر ایک قلعہ ہے بمعہ

اپنے دیدیالوں، موٹی دیواروں اور آہنی دروازوں کے۔ مالک کا وقار
اعتبار اس کی اسے محفوظ رکھنے کی اہلیت سے بہت گہرے طریقے سے
مربوط ہے اور انگریزوں کے دور میں بڑی بڑی انتظامی مہات
یا بمبار جہاز بھی کبھی کبھار بھیجے جاتے تھے تاکہ کسی باغی ملک کا گھر
تباہ کر کے اسے معاشرے کا نشانہ تحقیر بنا دیا جائے۔

سیاسی نظریے کے لحاظ سے جرگہ کے کئی وچسپ پہلو ہیں۔ کبھی
شخص کے جرگے میں بیٹھنے کا انحصار برادری کی رضا مندی کے علاوہ
اس کی اپنی قوت یا شہرت پر ہے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک نمائندہ
ہے ایک خاندان کا یا قبیلے کے نقطہ نظر کا یا ایک گڈ مڈ جرگے میں
بذات خود قبیلے کا۔ برک کے مثالی پارلیمنٹ ممبر کے برعکس وہ عمل
میں خود مختار نہیں بلکہ اسے تو اس گروہ کے نقطہ نظر کو پیش کرتا
ہے جس کا وہ نمائندہ ہے۔ عموماً وہ بولنے سے پہلے اپنے گروہ
کی آراء معلوم کرتا ہے اور اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو وہ عدم اتفاق
کا خطرہ مول لیتا ہے۔ جب جرگہ ایک فیصلے پر پہنچ جائے تو اس کے

۱۔ دیکھئے جیمز ایف، ص ۵۲، اگرچی لے یا ڈی سی، ایف سی آر کے تحت کسی
فوجداری مقدمے کے تصفیے کے لئے جوڈیشل جرگہ بلائے تو وہ اس اصول
سے مستثنیٰ ہوتا ہے کیونکہ ایسے جرگے کے ممبر کم از کم نظری لحاظ سے غیر جانبدار
جیوری ممبران ہوتے ہیں۔

تمام اراکین اس فیصلے کو نافذ کرنے کے لئے عم اپنا پوری قوت اور اثر و رسوخ استعمال کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

ایک لطیف نکتہ، جو اکثر جرگے کے نیم عدالتی کردار کی وجہ سے نظر انداز ہو جاتا ہے یہ ہے کہ اس کا فرض ایک موجودہ مورتحال کو پُر امن طریقے سے سلجھانا ہے نہ کہ حق و باطل کا فیصلہ کرنا، جرم کا تعین کرنا یا سزا سنانا۔ فریقین جو ایک مغربی عدالت میں مدعی اور مدعا علیہ کہلاتے ہیں، یہاں مساوی حیثیت سے پیش ہوتے ہیں۔ ایک نے دوسرے کے خلاف کوئی اقدام کیا ہے اور اس اقدام کی نوعیت تمام متعلقہ افراد کو معلوم بھی ہے اور ان کا اس پر اتفاق بھی ہے۔ جرگے کا کام یہ معلوم کرنا ہے کہ آیا جو کچھ کیا گیا وہ صحیح تھا اور اگر نہیں پھر مظلوم فریق حساب برابر کرنے کے لئے کیا کرنے کا بجا ہے؟ مناسب فیصلہ کرنے کے لئے اراکین جرگہ پختون ولی کے تقاضوں، واقعہ مخصوص حالات اور افراد متعلقہ کے کردار کو مد نظر رکھتے ہیں۔ ان کی رہنمائی مالی معاوضہ کے ایک عمومی طور پر مسئلہ پیمانہ سے بھی ہوتی ہے جو مظلوم فریق بشرط رضامندی ادا لے کا بدلہ کی بجائے عز و افتخار کے ساتھ قبول کر سکتا ہے^۲۔

۱۔ اس نظام کے پہلے انگریز مبصر، لٹفٹننٹ نے اس نکتے کو فوراً سمجھ لیا۔ دیکھئے لٹفٹننٹ ایف ایف ۱۶۹

۲۔ یہ علاقہ علاقہ مختلف ہے۔ ایک سو سال پہلے موت ۲۶۰ روپے کے برابر تھی۔ مستقل چوٹ ۸۰ روپے

کے اور زخم ۹۰ تا ۵۰ روپے کے پچھلے سالوں میں افراد تراز اور کے (باقی حاشیہ اٹلائی)

فیصلے عام طور پر بہت سیدھے سادے ہوتے ہیں۔ محمود و فضل کو مارنے کا حق رکھتا تھا کیونکہ فضل نے محمود کے چچا کو مار دیا تھا اور بس عالمگیر نے جائزہ طور پر اپنی بیوی کو مارا کیونکہ اس نے زنا کاری کا ارتکاب کیا تھا اور اس کے سسر کو اس کے خلاف کوئی ٹکڑہ نہ تھا بلکہ حکمت نے بلا وجہ بشیر کو مار کر ناجائز کام کیا اور بشیر کے اعزہ و اقرباء حکمت کو مارنے کے مجاز ہیں یا پھر وہ اس سے ۴,۰۰۰ روپے بطور ناکہ (خون بہا) قبول کر لیں تاکہ معاملہ ختم ہو جائے اور بدلہ لاگو نہ رہے جب جائیداد کے پیچیدہ جھگڑے اور یا بین القباہی تنازعات کا سوال ہو تو فیصلہ بہت مشکل ہو جاتا ہے اور عموماً شریعت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

دقیقہ حاشیہ
کئی قیمت گھٹنے کی وجہ سے معاوضوں کی شرح بڑھ گئی ہے مثلاً آج کل کرم میں قتل کا معاوضہ ۲ ہزار اور محمود میں ۱,۷۰۰ روپے ہے۔
۱۔ زنا کار بھی مستوجب قتل ہے اور بعض قبیلوں میں اگر زنا کاری اعلانیہ یا سنگین ہو تو اس کے ایک رشتہ دار کا قتل بھی ضروری ہے تاکہ مظلوم شوہر کی عزت بحال ہو سکے۔ زنا کار کو کبھی کبھار سزائے موت دینے کی بجائے صرف اس کی ناک کاٹ دی جاتی ہے اور یہ سزا سرحدی علاقے میں آٹھ ماہ تک اس کے لئے صدیوں پہلے ایک خاص جراحی لہجا دکھنا پڑی۔ اس میں پیشانی سے کچھ گوشت لے کر ناک پر بیوند کاری کی جاتی تھی تاکہ جزدی بجالی ہو سکے۔ دیکھیے، مینٹل ایفائن ۱۹۲،
اب یہ رسم صرف ہزارہ میں ہی موجود ہے۔

رواج اور شریعت :

پٹھان کی طرز زندگی میں رواج یا رواجِ عام اور شریعت کو بھی بڑا عمل دخل حاصل ہے۔ رواجِ شریعت سے زیادہ رائج ہے اور اسے عموماً ترجیح دی جاتی ہے۔ یہ قبیلہ بہ قبیلہ مختلف ہے اور اسے ضبطِ تحریر ترتیب میں لانے کی کئی برطانوی کوششیں ایک نمائندہ مجموعہ پیش کرنے میں ناکام رہیں۔ اس کی جزوی وجہ یہ تھی کہ مسلمان پٹھان شروع میں ہی برصغیر کے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ مذہبی رشتہ وحدت کا شدید احساس رکھنے لگے اور وہ پوچھ گچھ کرنے والے انگریزوں سے بد اصرار کہتے رہے کہ رواج کا کوئی وجود نہیں تھا اور صرف شریعت ہی شریعت تھی۔ اس کے علاوہ ملوک و معتبرین نے ہمیشہ پر نسل لاء کو ممکنہ حد تک پکدار رکھنے کی عملی افادیت کو تسلیم کیا ہے۔ شادی اور وراثت کے قواعد اب بھی رواج کے بہت زبردست اثر ہیں۔ مثلاً شادی کا قوی امکان صرف اسی وقت موجود ہوتا ہے جب مطلوبہ معاہدہ کا قوی امکان ہو یعنی 'میاں بیوی' ساتھی تو کیا کرے گا قاضی کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اسلامی قانون کے مطابق تمام بیٹوں کو میراث میں یکساں حصہ ملتا ہے لیکن اس کی ترمیم یوں کر دی جاتی ہے کہ سب سے بڑے بیٹے کا خصوصی حق مانا جاتا ہے جو اپنے والد کی اجتماعی ذمہ داریوں کا وارث ہونے کے ساتھ ساتھ (خواہ آزمائشی طور پر ہی ہو) اس کے ترکہ میں بھی نسبتاً بڑے

حصہ کا وارث ہوتا ہے۔ رواج کے مطابق ایک بیٹی کو وراثت سے کچھ نہیں ملتا گوارہ تحفہ یا جہیز کی بناء پر غیر منقولہ جائیداد میں اس کا کوئی حصہ ہو تو وہ ناقابل انتقال ہوتا ہے۔ بیوہ اپنی موت یا دوسری شادی تک اپنے شوہر کی جائیداد سے گزارہ کی مجاز ہے اور ایسے ہی ایک غیر شادی شدہ بیٹی اپنی شادی تک گزارہ کی مستحق ہے۔

شریعت سے انحراف کی ایک انتہائی صورت جسے ایک ابتدائی انگریز عالم نے دیکھا یوسفزئوں میں بہت عام ہے جس کے تحت میراث میں ہر بیٹے کے مساوی حصہ کی بجائے ہر بیوی کی اولاد کے لئے میراث میں سے مساوی حصے رکھے جاتے ہیں۔ گویا اگر ایک شخص کی چار بیویاں ہوں اور پہلی تین سے ایک ایک بیٹا ہو تو ہر بیٹا کل میراث کا ایک چوتھائی حاصل کرے گا اور اگر چوتھی بیوی کے چار بیٹے ہوں تو ان میں سے ہر ایک باقی ماندہ میراث کا ایک ایک چوتھائی لے گا۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ اسی وقت کیا جاتا تھا جب بیویاں پرست سماجی حیثیت

۱۔ ایچ بی لمٹن "رپورٹ اون دی یوسفزئی ڈسٹرکٹ سلیکشن فرام دی بیلنگ سائڈز آف دی ایڈمنسٹریشن فار دی افسر آف دی پنجاب ۱۸۵۳ء ص ۲۶۰۔ رواج کی بعض مثالیں جے۔ جی۔ لوریکر "کسٹری لاء آف دی مین ٹرائیز آف دی ڈسٹرکٹ ڈیش ورائن ڈیویف پی گورنمنٹ پریس ۱۹۳۴ء اور ایچ۔ این۔ بولٹن کی "کسٹری آف دی ٹرائیبل کسٹم آف دی ڈیرہ اسماعیل خان ڈسٹرکٹ" ڈیش ورائن ڈیویف پی گورنمنٹ پریس ۱۹۰۷ء میں ملتی ہیں۔

کی ہوں۔

بعض ریتیں بھی پٹھانوں کے نزدیک روئیہ کی مسلمہ رہنما مانی جاتی ہیں۔ ایک عام ریت ”تو ما بڑھیمتا“ کہلاتی ہے جس کا بہترین ترجمہ ”ادلے کا بدلہ ہے اس کے تحت اگر کسی آدمی کی املاک کا کوئی ستمہ یا نقصان جانور کھو جائے تو وہ کسی نہ کسی طرح جو ریا اس کے قبیلہ کی ایسی اور اتنی ہی چیز پر قبضہ کرنے کا مجاز ہے۔ اس کے بعد تباہ کیا جاتا ہے اور ریت کی خوبی یہ ہے کہ متعلقہ جانور یا اشیاء آئندہ کے لئے ایسی سرگرمی سے مستثنیٰ قرار دے دیے جاتے ہیں۔

اگر پہلا مظلوم خرقی بزور یا بڑھیمتا طریقہ کے تحت اپنا نقصان پورا نہ کر سکے تو وہ اگر اس کا حریف معزز آدمی ہو تو بنگلی کا طریقہ اختیار کر سکتا ہے یعنی اس چیز کی قیمت کا پانچواں حصہ اس کے قابض کو بطور فدیہ ادا کر سکتا ہے۔

پٹھانوں کی اپنی کہاوتوں کے مطابق امن شکنی کے اکثر و بیشتر جرائم زرازن اور زمین کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ اکثر خونیں جھگڑے ان میں سے کسی ایک یا زیادہ کی بناء پر ہوتے ہیں۔ مثلاً ۲۰-۱۹۱۹ء میں شمال مغربی سرحدی ضلع میں دقبائلی علاقہ کے بغیر جہاں بلانوی سول قانون پوری طرح رائج تھا ریکارڈ کے مطابق ۴۷ قتل ہوئے وغیرہ قتل کی اصل وارداتوں کے نصف سے بھی بہت کم جن میں سے ۱۴۹ سرکاری طور پر اصناف کے تعلقات سے منسوب کئے گئے

۹۶، لوٹ مار سے، ۳۶، زمینی تنازعات سے اور ۵۸، خونیں جھگڑوں سے۔ آخر الذکر میں بلا شک و شبہ پہلے تینوں عوامل ملوث تھے^۱۔

افراد اور معاشرہ :

قبائلی معاشرہ فرد سے شروع ہوتا ہے اور فرد پر ہی ختم ہو جاتا ہے جس کا مقام اکثر قبائلی میں اس کے فخر کا ہونے پر منحصر ہے جو نظری یا عملی لحاظ سے قبائلی زمین میں حصہ دار قبائلی جرگوں میں اظہار رائے کا حق رکھتا ہے۔ ہر گز وہ کی اہمیت کہوں سے کہ قبیلہ تک براہ راست ان انفرادی قبائلیوں کی تعداد پر منحصر ہے جو اس کے وفادار ہیں۔ یہ وفاداری حسب معمول (لیکن ناگزیر طور پر نہیں)

۱۔ مارٹن ویٹ فرنیٹر پراؤنس (انڈیا) "این ڈبلیو، ایف پی اینڈ فرینڈس رپورٹ ۱۹۱۰ء تا ۱۹۲۰ء ص ۷۷ ایک تجربہ کار ریکورڈنگ انسپیکٹر آر۔ ٹی۔ آل رجوے نے اپنی اس سے پہلے تحریر کردہ کتاب اور ۱۹۱۸ء میں دوسری دفعہ طبو میں خونیں جھگڑوں کے اہم اسباب یہ بتائے ہیں اور انہوں نے ساز باز از قرض یا درشت کے تنازعات از زمین یا پانی پر جھگڑے یا کسی فرد فائدہ یا اس کے ہمسایہ کا قتل اور ۷۔ بدرگہ کی حکم عدولی۔ دیکھئے "پٹان" از آر۔ ٹی۔ آل رجوے کلکتہ گورنمنٹ پریس ۱۹۱۸ء ص ۱۹، زن اور زمین پٹان و اتان "دوا قصہ خون" گپ" مولفہ قاضی احمد جان (پیشا ور ہاری لال، ۱۹۳۱ء) کا خاص موضوع میں۔

نونی رشتہ پر مبنی ہے لہذا یہ بنیادی طور پر معاشرے سے متعلق ہے نہ کہ ایک مخصوص رہنما سے۔

ملک:

لیکن بعض افراد گروہ کے قائد اور نفسِ مطلق تسلیم کئے جاتے ہیں اور وہ اپنی قابلیت اور تجربہ کی بناء پر ایک بالکل محدود دائرے کے اندر اپنے ساتھیوں کی سرگرمیوں کو کسی خاص نہج پر ڈال سکتے ہیں اس لفظ کا اصلی معنی "بادشاہ" گمراہ کن ہے اور ملک پٹھانوں کے ہاں زیادہ سے زیادہ مسالوں میں سرفہرست ہوتا ہے۔ زیر انتظام اضلاع میں وہ عموماً خان کہلاتا ہے۔ دونوں صورتوں میں دولتِ خاندانی اثر و رسوخ اور حکومتی منظوری اس خطاب کو حاصل کرنے اور جاری رکھنے میں غیر اہم نہیں ہوتے تاہم اس کا ذاتی کردار اور قابلیت اس کے اثر و رسوخ کی وسعت کو متعین کرتے ہیں۔ پچھلے چند سالوں میں بعض قبائلی ملوک صنعت و حرفت اور پرکاشی کی بدولت امیر ہو گئے ہیں لیکن وہ اب بھی قبائلی زمینوں اور جبرگوں میں کسی دوسرے فرد سے زیادہ حصہ کے حقدار نہیں ہیں اور نہ ہی وہ پورے مرد آبادی کی رضا مندی کے بغیر اپنے گروہ کو کسی لائحہ عمل کا پابند بنا سکتے ہیں۔

اکثر حالتوں میں پٹھانوں کے ہاں بڑے بیٹے کا حقِ فوقیت

موجود نہیں ہے لیکن ملکی یا سرداری قریباً ہمیشہ اسی خاندان میں رہتی ہے۔ قبائلی علاقے میں ملک کا کردار مرد و زمان کے ساتھ نہیں بدل سکتا۔ دوسری طرف زیر انتظام علاقوں کے روایتی رہنما یعنی خوامین اپنا اصلی قائدانہ اختیار کافی حد تک کھو چکے ہیں کیونکہ ہیئت اجتماعی میں تبدیلیاں آگئی ہیں لیکن ان سے بہت سے انیسویں صدی کے وسط میں برطانوی بند و بست ارضی کے دوران بڑی بڑی زمینیں الماک کے مالک بن بیٹھے اور بے حد امیر ہو گئے۔

ملکدار

سرحدی علاقے میں ملکدار فراواں فراواں میسر ہیں۔ چونکہ اسلام میں کوئی رسمی ملکائیت نہیں ہے لہذا ملکداروں کی قبیل کے دوسرے نیک لوگ خود ساختہ ہیں۔ ملکدار کی مخصوص ذمہ داری دیہی مسجد اور بچوں کی ابتدائی مذہبی تعلیم ہے۔ وہ کبھی کبھار ملک اور دیگر اہم افراد معاشرہ کا صلاح کار بھی ہو سکتا ہے۔ زیر انتظام اضلاع میں وہ زیادہ تر خان یا کسی سرکردہ خاندان کا حلقہ بگوش ہوتا ہے۔ چونکہ عام قبائلی مذہب سے دیوانہ وار عقیدت بھی رکھتا ہے اور اس سے کافی حد تک نا بلند بھی ہوتا ہے لہذا ایک ہوشیار

۴۔ دیکھیے ایلفنٹن، ایف، ص ۱۶۳ اور جیمز ایف، ص ۸۲ تا ۸۳

ملا اپنی برادری کی سوچ پر گہرا اثر ڈال سکتا ہے خواہ معاملات کا مذہب سے دور کا تعلق بھی نہ ہو۔ ایک غیر معمولی قابلیت کا آدمی ملا اور ملک کے اختیارات کا امتزاج ہو سکتا ہے اور مذہبی و غیر مذہبی معاملات میں گروہ کا رہنما تبسم کیا جاسکتا ہے :

جو ملا مسجد میں سرکردہ ہوتا ہے اور جماعت کرتا ہے امام کہلاتا ہے۔ ایک ایسا نیک آدمی جو عام طور پر جو نمازوں کی امامت نہیں کرتا لیکن کسی خاص ولی اللہ یا سلسلہ تصوف کا مرید ہے شیخ کہلاتا ہے۔ طالب علم ایک تیسری قسم ہے جو کم و بیش باقاعدہ طور پر مذہبی مطالعہ کے لئے موقوف ہوتی ہے لیکن کسی عام پیسے سے بھی منسلک رہتی ہے۔

ایک اور گروہ آستانہ داروں کا بھی ہے جن میں پیر یا پیروں کی اولاد، میاں جو قدیم زمانے کے علماء و صوفیاء کے طبقے کی ذریعات ہیں (یہ خطاب عموماً آنحضرت کے قبیلہ قریش کے اخلاف اور اساتذہ کو دیا جاتا ہے) پیرزادگان، اخوندزادگان اور صاحبزادگان جو ایسے اصحاب کے بیٹے ہیں جنہوں نے کسی نہ کسی بنا پر تقدس کا درجہ حاصل کیا اور بعض مقامات پر چغد فقر یا درویش شامل ہیں جو نظری طور پر کسی نہ کسی سلسلہ صوفیاء کے اراکین ہوتے ہیں لیکن اکثر و بیشتر محض انفرادی صوفی یہ شاذ و نادر چھان ماخذے ہوتے ہیں۔ ان سے قدرت الٰہی اور بالاسادات میں جنہیں اکثر شاہ کہا جاتا ہے اور جن کی یادت

محض آنحضرتؐ کے حسب و نسب عالی سے ماخذ ہونے کی وجہ سے ہے۔
 مذہبی توہم پرستی کے باوجود یہ سب اصحاب ملک کی طرح
 اپنی حیثیت کے لئے بڑی حد تک اپنے ہم قبائلیوں کے حق ظن کے محتاج
 ہیں، اور جب تک وہ اپنے زہد و اتقا کے ذریعے اپنی واقعی مذہبی
 فضیلت کا ثبوت نہ دیں وہ معاشرے میں کسی اونچے مقام کے اہل
 نہیں ہو سکتے۔ مگر اگر قبیلے کا ہی فرد ہو تو وہ اپنی ذاتی زمین کے
 علاوہ سب کے لئے وقف زمین کا بھی انتظام کرتا ہے لیکن وہ اپنے
 رفیقین پر کسی قسم کا کوئی محصول نہیں لگا سکتا کیونکہ ایسا حتیٰ اسے
 ایک مستقل اختیار دے دیتا ہے جو اکثر قبائلی برداشت نہیں کر
 سکتے خواہ اس کا مقصد کتنا بھی بلند یا روحانی کیوں نہ ہو۔

مگر ان قبائل کے ساتھ برطانوی تعلقات میں ایک نمایاں کردار
 ادا کیا ہے دگو قریباً ناگزیر طور پر تخریبی (اور غیر معمولی افراد جیسے
 یونہی ملا حاجی ترنگ نہئی اور فقیر ایپی نے مذہب اور جنگ کو
 جہاد میں مخلوط کر دیا جس کی وجہ سے قبائل برطانوی ہند کے دارالحرب

۱۔ پٹھانوں کے ہاں جہاد کا مطلب اکثر وہ نہیں ہوتا جو اسلامی فقر میں ہے۔
 یہ عموماً ہر اس پر تشدد و فعل پر محیط ہوتا ہے جو کسی غیر مسلم یا غیر قدامت
 پسند مسلمان فرقہ پرست کے خلاف کیا جائے۔

پیرپل پڑے۔ پاکستان کی مسلم ریاست کے ظہور کے بعد جہاد کے لئے انگریزوں کے کفر کا محرک موجود نہیں رہا، اور گو فقیر ایسی ۱۹۶۰ء میں اپنی موت تک وزیرستانی سرحد پر اپنے چٹانی قلعے میں سرکش رہا تاہم اس کا اثر و رسوخ مذہبی حرمت کی بجائے قانون نسکن کی حیثیت سے اس کی قوت و قابلیت پر منحصر تھا۔

شکرہ ۲۔

پشتو لشکر کا بہترین انگریزی مترادف غالباً امریکی ہندوستانی ”جنگی جماعت“ ہے۔ لشکر محض ان افراد کا مجموعہ ہے جو ایک مشترکہ دشمن کے خلاف یا ایک مشترکہ مقصد کے حصول کے لئے اکٹھے ہوتے ہیں۔ پٹھان تصورِ حیات جو ہے سو ہے لہذا یہ لفظ ان کی زبان میں رائج اعام ہے۔ جو گے کی محدود تعداد کی وجہ سے وہ اس زمرے میں نہیں آتا۔ یہ اصطلاح ان درجن بھر آدمیوں پر بھی محیط ہے جو کسی قریبی گاؤں سے بھیڑ چرانے جاتے ہیں اور ان ہزار ہا افراد پر بھی جو ۱۹۴۷-۴۸ء میں کشمیر پر ٹوٹ پڑے۔

ابنی غیر رسمی نوعیت کے باوجود لشکر انتہائی عملی اور کاروباری ہوتا ہے اور اس کے لئے تفصیلی منصوبہ بندی کی ضرورت ہوتی ہے۔

۱۔ دیکھئے باب دہم جس میں تہا د کشمیر کا مفصل ذکر آ رہا ہے۔

ایک محترم ملک کے لشکر کو تین گروہوں میں تقسیم ہونا چاہیے۔ پہلا اور بہترین طور پر مسلح گروہ ہدف پر حملہ کرتا ہے اور پھر دوسرے گروہ سے آلتا ہے جو اپنے گاؤں کی طرف کچھ فاصلے پر پیچھے تعینات کیا جاتا ہے۔ یہاں پہلا گروہ لوٹ مار دوسرے گروہ کو دیکر ہٹاؤں میں منتشر ہو جاتا ہے۔ تیسرا گروہ جو اپنے گاؤں سے صرف چند میل کے فاصلے پر ہوتا ہے دوسرے گروہ سے لوٹ مار لے لیتا ہے، اور واپسی جاری رہتی ہے۔ یہ لوٹ مار اور قیدیوں کو گاؤں میں لے آتا ہے جہاں پہلے دونوں گروہ پہنچ چکے ہیں، اور اتر سرنو مسلح ہو چکے ہیں۔

اس مرحلے پر لوٹ مار کو محفوظ کیا جاتا ہے اور ہر ایک کاتھون گرم ہوتا ہے۔ اس کے بعد تو مجتمع لشکر اور اُن بے خوف تعاقب کنندگان (بشرطیکہ ہوں) پر ٹوٹ پڑتا ہے اور خاطر خواہ طور پر ان کو عبرتناک نقصان پہنچاتا ہے۔

حجرہ

حجرہ یا کمیونٹی سنٹر پٹان کردار کے ایک شریف تہ اور سماج دوست پہنو کا منظر ہے۔ یہ زیر انتظام اور قبائلی علاقوں کے قریباً ہر گاؤں میں موجود ہے اور تہذیب و وقار کا ایک نشان سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے قبائل کے بہت سے لوگ بار مہمنوں کے

بعض حصّوں کو اس لئے موردِ تنقید بناتے ہیں کہ ان کے دیہات میں شاذ و نادر ہی حجرے پائے جاتے ہیں۔ روایتی طور پر یہ ایک مردانہ سماجی مرکز ہے جہاں قبیلے کے غیر شادی شدہ نوجوان ہوتے ہیں بلکہین حجرے میں نودار و بھی ٹھہرتے ہیں اور یہ اجتماعی عمل اور فکر و خبر کا مرکز بھی ہے۔ یہاں سب کو کھانا اور چائے دی جاتی ہے۔ ایک گائوں میں کئی حجرے ہو سکتے ہیں جو مہمان نوازی میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے ہیں۔ ہر قسم کے معاشرتی امور حجرے میں منائے جاتے ہیں۔ گپ شپ بھی ہوتی ہے اور معلومات کا تبادلہ بھی کیا جاتا ہے۔ چونکہ جیسا کہ ایلفنٹن نے ۱۵ سال پہلے دیکھا ”اُن کی (پٹھانوں کی) عام مصروفیت بات چیت ہے جب وہ بیٹھے ہوئے ہوں“ لہذا حجرا ہر وقت بھر رہتا ہے۔ دور افتادہ دیہات کے بھی بہت سے حجروں میں اب بیٹری سے چلنے والے ریڈیو موجود ہیں لہذا غیر متعلقہ موضوعات جیسے اقوام متحدہ اور سرد جنگ بھی قبائلیوں کی بات چیت کا حصّہ بن چکے ہیں۔ تانٹنڈ ریڈیو پشتونستان میں ریڈیو کابل اور ریڈیو پاکستان کا مقابلہ کرتا ہے، اور بی بی سی اور وائس آف امریکہ انگریزی، اردو اور فارسی میں دنیا کی اور بہت

بہ۔ ایک کنوارا پٹھانوں کے ہاں ایک آدرہ سمجھا جاتا ہے اور وہ عموماً اپنے بھائی کے

گھر میں بھی نہیں سوتا۔

سی خبریں بھی مہیا کرتے ہیں۔

ما تحت طبقہ:

کسی پٹھان گاؤں کا ایک سرسری سامطالعہ بھی ظاہر کر دیتا ہے کہ عام پٹھان دفتری جو دیہی عوام کی تشکیل کرتا ہے اپنی جگہ پر ایک چھوٹا سا خان ہے۔ اس کی ضروریات مختلف ہنگامہ اور کاریگر پوری کرتے ہیں جنہیں ہمسایہ اور غلام دیہی نفع اب بتدریج متروک ہو رہا ہے، کہتے ہیں ان میں اکثر گوجر اور اعوان قبائل سے تعلق رکھتے ہیں جو ماحذ کے اعتبار سے غیر پٹھان ہیں۔ ان میں سے اکثر مسلمان ہیں لیکن ہندو ہمسائے بھی موجود ہیں، آج کل بھی موجود ہیں۔ بعض علاقوں میں ان لوگوں کے علیحدہ دیہات ہیں جو پٹھانوں سے متباہر زمینوں پر اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ انفرادی طور پر وہ ایک پٹھان گاؤں یا گھرانے میں خدمت گاری اور منشی گیری کرتے ہیں۔ دونوں حالتوں میں وہ اپنے مخدوم لیکن متکبر پٹھانوں کے مقابلے پر اقتصادی لحاظ سے زیادہ خوشحال ہوتے ہیں۔ ہمسائے کا اپنے پٹھان مربی سے تعلق بیان کرنا مشکل ہے۔ انگریزوں کی آمد سے پہلے قبائل میں ایک نرم قسم کی غلامی کا رواج تھا۔ غلام نہ کسی زمین کا مالک ہو سکتا تھا نہ مویشیوں کا۔ وہ علاقہ چھوڑ نہیں سکتا تھا اور اپنا بیشتر وقت یا پیداوار اپنے آقا کے لئے وقف کرتا تھا

۱۸۷۰ء تک یوسفزئیوں میں غلامی عام تھی اور ہندو ہمسایوں کو تو
جنوریہ بھی دینا پڑتا تھا جو اسلام کا کفار پر عائد کردہ روایتی فی کس
ٹیکس ہے ۱

انیسویں صدی میں ایک اور قسم کی غلامی بھی عام تھی جسے زیادہ
صحیح طور پر ہرکارہ پن کہا جاتا ہے۔ اس کے تحت ایک بے زمین پٹھان
اپنے آپ کو ایک دفتری کے رحم و کرم پر چھوڑ سکتا تھا۔ اسے چوریکار
کہا جاتا تھا اور اس کے بدلے میں آقا کاشتکاری کے لئے اسے ایک
قطعہ زمین کچھ پیشگی روپیہ اور اکثر و بیشتر ایک لونڈی دے دیتا
تھا تاکہ وہ اپنا گھر بسا سکے۔ چوریکار حلف دیتا تھا کہ وہ اس وقت
تک رہے گا جب تک وہ سب پیشگی رقومات ادا نہ کر دے چونکہ پیداوار
کامین چوتھائی حصہ دفتری کو چلا جاتا تھا بوجہ ملکیت لہذا باقی ماندہ
ایک چوتھائی سے ہی اسے نقد پیشگی رقوم اور وندزا کی قیمت ادا کرنا
ہوتی تھی اور اسی سے اپنا گھر بھی چلانا ہوتا تھا لیکن چوریکار کی زندگی
نامناسب حد تک سخت نہ تھی کیونکہ وہ جب ایک دفعہ لائسنس
کاشتکار ثابت ہو جاتا تھا تو اسے کوئی دوسرا دفتری مل جاتا تھا جو
بخوشی اصلی آقا کو قرض ادا کر دیتا تھا اور چوریکار سے اسی قسم کا
معاہدہ کر لیتا تھا۔

آج کل بھی قبائلی علاقے میں ہمسائے کا کہ دار انتہائی جاگیر ہے اور بعض اطلاعات کے مطابق انفرادی طور پر انہیں مشکل ہی غلاموں سے میسر کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اوسط ہمسایہ کسی اور گاؤں کا کوئی بے سہارا پٹھان ہوتا ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے اکثر قانونی گرفت اپنے آپ کو ایک درباری یا محافظ کی حیثیت سے کسی طاقتور ملک سے منسلک کر لیتا ہے یا وہ ایک ہندو محاسب ہو سکتا ہے۔ جو اپنے آقا کے فوائد اور منافع جات میں حصہ گیر ہوتا ہے۔ جو قبیلے کے غیر رکن افراد کے ساتھ روابط کی وجہ سے اسے حاصل ہوتے ہیں جن کے ساتھ وہ منسلک ہوتا ہے۔ تکنیکی طور پر ہندو محاسب آنے جانے میں آتا ہی آزاد ہوتا ہے جتنا ایک پٹھان، محافظ لیکن اس میں اپنے آقا کی حکم عدولی کہہ کے یا اسے خیر باد کہہ کر اپنی فلاح و بہبود کو خطرے میں ڈالنے کی اہلیت کم ہوتی ہے۔

عورت کا مقام اور کردار

پٹھان عورتیں سماجی یا اجتماعی معاملات میں عموماً کوئی حصہ نہیں لیتیں۔ قبائلی علاقے میں ملک کے خاندان اور دیگر خاندانوں کی تمام مستورات اپنے سماجی امتیاز کی وجہ سے برقعہ اوڑھتی ہیں، یعنی انتہائی حالتوں میں یہ پردہ "پار دیواری" ہوتا ہے جس کے تحت عورت کبھی اپنے گھر سے نہیں نکلتی حتیٰ کہ اپنی سہیلیوں اور

اقربا سے ملنے کے لیے بھی نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بالائی طبقے کی پٹھان عورتیں بے اثر ہوتی ہیں۔ رسم و رواج کی تجدیدات کے اندر رہتے ہوئے یہ عورتیں ذہین اور ہلکار ہوتی ہیں اور اپنے مردوں کے اہم گھریلو معاملات کو اپنی ہاتھ پر چلاتی ہیں اور رشتوں نا طوں اور خاندانی میل ملاپ میں بڑا کردار ادا کرتی ہیں۔ کبھی دوسرے خاندان کی مستورا کے ساتھ براہ راست گفت و شنید کے ذریعے اور کبھی توسط دیگران۔ عورتیں میل میا کے تقاضوں کو پورا کرنے کا بھی عملی وسیلہ ہیں جو بختون ولی کا اتنا اہم حصہ ہے اور بہت سے ملک کی عزت محض اس لئے بڑھی ہے کہ ان کی بیگمات کو کھانے پکانے کا خاص ملکہ حاصل ہے۔ عورتیں بھی بختون ولی پر اتنی ہی سختی سے عمل کرتی ہیں جتنے مرد اور وہی اثر و بیشرا اپنے کاہل اور غیر رضا مند مردوں کو بدل پر اکسانے کا اہم عامل ہیں۔ ان میں سے معدودے چند ہی ایسی ہوں گی جو رائفل، پستول یا خنجر نہ چلا سکتی ہوں اور لڑائی بھڑائی کے دوران جنگی صفوں کے عقب میں ہر طبقے کی عورتیں ہاتھ بٹاتی ہیں۔ عام قبائلیوں کی بیویاں کام کا بیشتر حصہ کرتی ہیں۔ کھانا پکانا، پانی، گھاس اور ایندھن لانا، دودھ دہنا اور بلوتا، قصیں کاٹنا، جانور سنبھالنا، سینا پر دنا اور کپڑے دھونا، لہذا وہ پردہ بہن کہتیں لیکن غیر محرم کو دیکھتے ہی پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔ زیر انتظام ضلعوں کے صرف چند افسر بڑے شہروں کے

سوا پردہ کے خلاف آج تک عورتوں میں ابتدائی بغاوت کے آثار بھی نظر نہیں آتے اور ایک ایسے علاقہ میں جہاں ہر قسم کے محنت کار فاضل ہیں۔ ایسا کرنے کے لئے کوئی اقتصادی محرک بھی نہیں ہے۔ سرحد میں پردہ اتنا سخت ہے کہ کراچی، لاہور اور ساو لینڈی کی فیشن ایبل خواتین بھی جو رات کے وقت محفل رقص و سرود میں مردوں کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھیں پٹا ور پہنچتے ہی برقعہ اوڑھ لیتی ہیں اور زمانہ میں چلی جاتی ہیں۔ ایک دوسرے سے ملنے کے علاوہ مقامی خواتین ہر جمعہ کو مساجد و مقابر میں جاتی ہیں اور تقریبات شادی میں شریک ہوتی ہیں اور یہی ان کی تفریح طبع ہے۔

اکثر بھٹانوں کی ایک ایک ہی بیوی ہوتی ہے لیکن سب پر اصرار کہتے ہیں کہ اگر وہ چاہیں تو چار بھی رکھ سکتے ہیں، جس کی اسلام اجازت دیتا ہے اور چند دولت مند لوگ واقعی چار چار بیویوں کے شوہر ہوتے ہیں۔ ایام گزشتہ میں بعض چار سے بھی زیادہ رکھتے تھے۔ یہ اضافی عورتیں عموماً سڑوتی ہوتی تھیں یعنی خوبصورت لونڈیاں جنہیں کا کا خیل خٹک کا شہر سے لاتے تھے اور ۲۰ تا ۳۰ روپے فی لونڈی بیچ دیتے تھے۔ دلہن خریدنے کی روایتی قبائلی رسم شہروں کے متوسط

۱۰۔ پردہ سسٹم پٹا دریں ان دو سالوں میں ٹوٹنا شروع ہو گیا ہے جیسا کہ مواد پریس کے لئے تیار کیا گیا تھا۔

طبقے میں کسی حد تک کم ہو گئی ہے اور اس کی جگہ اسلامی اور پاکستانی
تکلیف نامہ نے لے لی ہے، جس کے تحت شوہر چہیز اور کفالت یا تحریج کی
ضمانت دیتا ہے۔ آخر الذکر کا مقصد بیوی کو اس کے شوہر کی وفات
یا بعد میں اسے طلاق دینے کی صورت میں ایک خاص رقم کا حق دار بنانا
ہے۔

لیکن اکثر قبائلی دہشتیں اب بھی ان کے والدین کو نقد رقم یا جنس دیکر
خریدی جاتی ہیں۔ زیر انتظام ضلعوں کے بعض امیر خواتین اور زیادہ طاقتور
پہاڑی لوگ میں خاندانی کبر و ماز نے ان دونوں رسموں میں ایک خاص
تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ بیوی کو ایک بڑی رقم کی ضمانت دینے کی بجائے
جو صرف طلاق کی صورت میں یا شوہر کی وفات کے بعد ادا کرنا ہوتی
ہے صرف ایک علامتی رقم کی ضمانت دی جاتی ہے جو ہر ایک آسانی
سے ادا کر سکتا ہے۔ یہ اس بات کی غمان ہے کہ طلاق یا اس کی جائزہ دہوتی
کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا اور معزز خاندانوں کے درمیان ایسے
مالی تحفظ کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کے عقیب میں یہ حقیقت ہے کہ
جس سے طرفین اچھی طرح واقف ہیں کہ طلاق کا نتیجہ محض مالی سزا ہی
نہیں ہوتا بلکہ سابقہ بیوی کے رشتہ داروں کے ہاتھوں معاہدہ شکن شوہر
کی موت بھی ہو سکتی ہے۔

زمینی مالکیت:

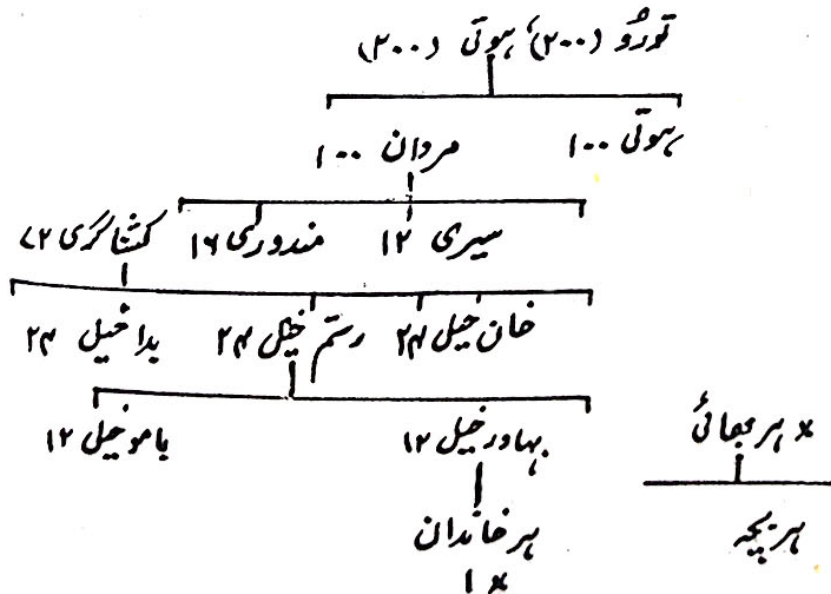
غلامی پوندوں کے سوا بڑے بڑے پٹھان قبائل میں سے کوئی بھی صحیح معنوں میں خانہ بدوش نہیں۔ وہ اپنی سرزمین سے ایسے ہی محبت کرتے ہیں جیسے اپنی تلواروں سے اور اکثر ایک قبائلی اپنی ایک مخصوص نجر اور سنگلاخ زمین سے ایسی محبت کرتا ہے جو اس محبت سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے؛ جو امریکی وسط مغرب کے ایک شیرخانہ کے مالک کو اپنی سرسبز اور زرخیز چراگاہوں سے ہوتی ہے۔ پٹھان کی قبیلے میں شہریت کا انحصار ہی اس کے حق دفتر یعنی حصہ زمین پر ہے اور قبائلی معاشرے کے مجموعی ڈھانچے میں جو اہم کردار زمینی نظام ادا کرتا ہے اس کا تقاضا ہے کہ اس کا مطالعہ قدرے تفصیل سے کیا جائے۔

جب قبائلی اپنی موجودہ زمینات پر آئے تو نئی زمین ایک اچھے خاصے معیاری طریقے سے تقسیم کی گئی۔ کل زمین کا قریباً نصف پورے قبیلہ کی مشترکہ چرائی کے لئے علیحدہ کر دیا گیا۔ اسے شاملات کہا جاتا ہے۔ باقی ماندہ قبیلے کے تمام بڑے بڑے گروہوں میں قریباً برابر برابر بانٹ دی گئی۔ ان میں سے ہر حصہ آگے ذیلی گروہوں میں برابر برابر تقسیم کر دیا گیا اور چھوٹا سا حصہ مشترکہ یعنی بطور شاملات رکھا گیا۔ اس شاملات کا ایک قطعہ مسجد، امام اور ملاؤں کے لئے علیحدہ کر دیا گیا جسے سیری کہتے ہیں۔ پھر ہر بڑے ماندان نے ذیلی

گروہ کے باقی ماندہ حصہ میں سے برابر برابر اپنا قطعہ حاصل کیا۔
پھر خاندان نے اپنے بالغ مردوں کو الگ الگ پلاٹ دے دیئے۔ جو
مالک کے بیٹوں کو برابر برابر مل گئے ایسے ہی جیسے مالک کے حقوق
گروہی اور قبائلی شملات میں لگاؤں میں رہائشی پلاٹ بھی اسی
طریقے سے تقسیم کئے گئے۔

فرد کا مفوضہ پلاٹ بنجرہ کہلاتا تھا اور شملات میں اس کا
حصہ انعام، بنجرہ اور انعام ملکہ و فز بنیتہ تھے اور تمام اصلی و نسلی
پیشان و فز بنیتہ تھے۔ جب کئی نسلوں کے بعد اراضی کی تقسیم و تقسیم
اپنی انتہا کو پہنچ گئی تو ایک بھر گئے نے کچھ شملات کے حصے بنائے

۱۔ مثلاً یوسفز پور کے خاندانی سیکشن میں تقسیم یوں ہوئی۔ مائزئی نے قریباً ۶۰ فیصد
زمین بطور شملات رکھی اور باقی ۴۰ پلاٹوں میں کاشتکاری کے لئے یوں تقسیم
کی گئی۔



اور بانٹ دیئے تاکہ اصلی بخروں میں کچھ اضافہ ہو سکے۔ اگر کوئی آدمی اپنی زرعی زمین پر کاشت نہیں کرنا چاہتا تھا یا اپنی رہائشی جگہ کو استعمال میں نہ لانا چاہتا تھا تو وہ اسے کسی مزارع کو ٹھیکے پر دے سکتا تھا لیکن ملکیت اسی یا اس کی اولاد کی ہی رہتی تھی۔ نہایت غیر معمولی حالات میں ہی وہ اس کا سرکاری طور پر انتقال کرتا تھا کیونکہ ایسا کرنے سے اسے قبیلے میں اپنی بنائے رکینیت سے ہاتھ دھونے پڑتے تھے۔ مگر وہ زمین کوئی بھی استعمال میں لا سکتا تھا لیکن مالک یا اس کے خلاف کسی وقت بھی اس پر نفعہ ترقیات اپنا حق دوبارہ حاصل کر سکتے تھے۔

بعد میں جب چرائی اور کاشتکاری کے لئے بار بار تقسیم کی وجہ سے شاملات ختم ہو گئی تو نسلاً بعد نسلاً تقسیم و رتقسیم کا سلسلہ رکنا ممکن نہ رہا اور آہنی دفتری نظام نے بہت سوں کو ہندوستانی میدانوں میں محنت مزدوری یا سرحدی پہاڑیوں میں ڈکیتی پر مجبور کر دیا۔ یہ زیادہ تر ایسے قبائل میں ہوا جیسے یوسفزئی جو زرخیر وادیوں میں رہتے تھے اور جن کا معاشرہ کاشتکاری پر ہی دار و مدار کا عادی ہو چکا تھا۔ بخر پہاڑیوں میں جہاں محض زراعت یہ انحصار ممکن نہ تھا قبائلی ڈھانچہ، بخت سے کم متاثر ہوا اور ایک تنگ دست خاندان کی مطلوبہ ضروریات خورد اک و رہائش پوری کرنا عمومی چند کے ذریعے آسان رہا۔

جب انگریز آئے تو یہ زمینی ڈھانچہ کم از کم ۳۰ سال کی شکست و
 ریخت کے باوجود خاصاً محفوظ تھا۔ اولین برطانوی ارباب بست و
 کشاد میں سے ایک نے ۱۸۵۱ء میں پوسٹمزٹوں کے متعلق لکھا کہ اسکا
 کے وقت ہر آدمی اپنا بجرہ یا اس کا کچھ حصہ اپنی مرضی سے کاشت کرتا
 تھا اور کسی کو نہ لگان ادا کرتا تھا اور نہ ہی پیداوار کا کچھ حصہ قبیلے
 کے لئے اس کا فرض صرف یہ تھا کہ وہ ان تمام جا رہانہ اور مدافعانہ کارروائیوں
 میں حصہ لے جن کا فیصلہ جس کے کرتے تھے۔^۱

سکھوں کی زمینی پالیسی غیر مستقل تھی اور غالباً منفعت گیری
 کے لئے۔ انگریزوں کا مقصد ہر قیمت پر ایک منصفانہ لگان وضع کرنا
 اور وصول کرنا تھا لیکن یہ دونوں شملات کو لگان سے مستثنیٰ قرار دیتے
 تھے جیکس سے بچنے کی ایک غلط کوشش میں بہت سے پٹھانوں نے
 اپنے بجروں کے کچھ حصے انعام میں بدل دیئے۔ ان کا مزید اصرار تھا
 کہ اگر وہ کسی زمین کو مصنوعی آبپاشی کے ذریعے زیر کاشت لائے ہوں
 تو وہ ان کے محصولی بجروں کا حصہ نہ سمجھی جائے۔

یہ چالیں سکھوں کے دور میں تو کامیاب رہیں لیکن جب انگریزوں
 نے اپنے قبضے کے بعد بیس سال کے دوران بندوبست اراضی کیا تو وادی
 پشاور کے دفتر یوں پر اکثر و بیشتر ان کے تباہ کن اثرات مرتب ہوئے۔
 ملوک خوانین کو انگریز افسران بندوبست کے ساتھ اکثر سابقہ پڑتا تھا۔

جن کا سابقہ تجربہ بنگال میں حاصل ہوا تھا جہاں زمینی نظام کافی مختلف تھا۔ افسران بند و بست کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ وہ یہ معلوم نہ کیسے کہ شملات اور معاف اراضیات کا ذمہ دار کون تھا۔ ملک و خوانین کو جلد ہی احساس ہو گیا کہ ایک بڑی شملاتی ملکیت ان کا وقار بڑھا سکتی تھی لہذا انہوں نے اکثر اپنے ناموں پر اس کی لگان دہی کی ذمہ داری قبول کر لی اور وہ بند و بست کے نتیجے میں برطانوی قانون کے تحت شملات کے بلا شرکت غیرے بن کر ابھرے۔

بظاہر متروکہ بھجروں نے افسران بند و بست کے لئے ایسا ہی نازک مسئلہ پیش کیا جیسا کہ امریکی مغرب میں پیش آیا تھا۔ ابتدا ہی سے انگریزوں نے قابضین کے حقوق کو تسلیم کر لیا گو پہلے پہلے دفتری مالک رہا اور حصہ پیداوار کا حق دار بھی لیکن مخصوص حالات کے سوا اس کا مزارع کوڑا کرنے کا حق جاتا رہا۔ لیکن بعد میں ملکیت اور لگان ادا کرنے کی ذمہ داری طے کی گئی اور قطعی قرار دے دی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض سابقہ دفتری نہ بخرہ کے مالک رہے نہ انعام کے گوجر یا اعوان غلام یا ہمسائے، کاشتکاری کے دائمی حقوق ہیں۔ مستقل کر دیئے گئے اور پٹنان دفتری کے پاس ملکیت رہی اگر اس کے پاس واضح ثبوت تھا اور تہمین بوجہ عدم ادائیگی لگان ضبط نہ ہوئی تھی۔ چند حالتوں میں انگریزوں نے پٹنان رعائے کی بنیاد کو مرے سے نظر انداز کر دیا اور زمین کی ملکیت بھی انہی گوجروں یا

اعوانوں کو دے دی جو اس پر کاشت کر رہے تھے۔

ابتداءً ملک کا دفتر کسی اور قبائلی کے دفتر سے بڑا نہ تھا، لیکن یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ عوامی نمائندہ کی حیثیت سے اس کے فرائض ایلے تھے کہ وہ اسے خود کاشت کرنے میں حائل تھے لہذا بہت سے ملکوں نے اپنی پوری یا جزوی زمین کاشت کے لئے بغیر پٹھان ہمسایوں کو دے رکھی تھی چونکہ یہ لوگ اکثر و بیشتر پٹھانوں کی نسبت بہتر اور زیادہ محنتی اور زراعت کا رتھے اور اپنے کم تر سماجی وسیعے کی وجہ سے ایک کمتر معیار زندگی پر قانع تھے۔ لہذا وہ ملک کے لئے زمین سے بہتر پیداوار لیتے تھے، جو ایک خود کاشت ملک نہ کر سکتا تھا۔ کچھ ملاؤں نے سیری پر بھی اسی طریقے کا اطلاق کیا اور وہ مذہبی مطاببات و فرائض کو زیادہ وقت دے سکے۔ اگر مزدور دستیاب تھے تو بہت سے عام پٹھان دفتروں نے بھی اپنی زمین پر بزرگسا دیئے اور خود جرگہ لشکر، بدل اور میلہ مستیا کے تقاضے پورے کرتے رہے اور جگرے کی دلچسپیوں میں بے فکر می سے مگن ہو گئے۔

یہ صورتحال دود جو بات کی بناء پر دائمی بن گئی ہے۔ ایک تو بیرونی وظائف میں جو پٹھانوں کو ان کی سیاسی اور جنگی اہمیت کی وجہ سے خراج کے طور پر ملتے ہیں اور دوسرے زر خیز میدانوں میں لوٹ مار کے امکانات ہر وقت موجود ہیں۔ اس طرح بنجر زمینوں کے مالک قبائل بھی شاذ و نادر ہی بھوک کی شدت سے اتنے مجبور ہو

یہی کہ وہ اپنے قبائلی عادات و اطوار کو ترک کر کے گذارۂ بخش زرعی
معیشت اختیار کر لیں۔

ماہر بشریات فریڈرک بارتھ نے جس نے ۱۹۵۴ء میں ریاست
سوات میں کام کیا) پٹھان معاشرے کے اسی پہلو کی بنیاد پر ایک دلچسپ
ماحولی نظریہ قائم کیا۔ بارتھ نے یہ معلوم کیا کہ مقامی کوہستانیوں کو
آگے دھکیل دھکیل کر اور یہ عمل کئی صدیوں تک جاری رہا (وادی سوات
کے بالائی حصوں تک پٹھانوں کی توسیع و پامان رک گئی۔ جہاں وہ
اس علاقے کے سرے تک جا پہنچے۔ جس میں ان کی طرز زندگی کے سہارے
کے لئے دوہری فصل کاری ممکن تھی۔ کوہستانی نسبتاً زیادہ خالص
زرعی معاشرہ ہونے کی بناء پر بلند تر علاقوں میں زندہ رہ سکتے تھے جہاں
ایک ہی فصل اور قدرے گلہ بانی ممکن تھی بلکہ

ولیش

روایتی پٹھان زمینی نظام کا ایک انوکھا پہلو یہ تھا کہ وقتاً
وقتاً ایک طرف قبیلوں اور طائفوں اور دوسری طرف ایک ہی قبیلہ
کے افراد کے درمیان تبادلۂ زمین ہوتا رہتا تھا۔ اسے ولیش کہتے تھے۔

۱۔ فریڈرک بارتھ "ایکولوجک ریلیشنز ان سوات" تارتھ پاکستان "امریکی انٹرویو

پالوجسٹ شمارہ ۵۸ دسمبر ۱۹۵۶ء، ۱۰۸۱

اور اس کا مرکزی خیال یہ تھا کہ ہر گروہ کا ہر فرد اور ہر گروہ ایک اکائی کے طور پر کچھ عرصے کے لئے بہترین زمین سے متفق ہو سکے اور اس طرح اقتصادی قوت کی بنا پر قیادت کے ظہور کو روکا جاسکے۔ یہ تبادلے یوسفزیوں کے بعض گروہوں میں گزشتہ صدی کے وسط تک جاری رہے اور تعجب تیز امر یہ ہے کہ یہ عموماً بلا کشت و خون ہو جاتے تھے۔ تبادلے مختلف مدت کے بعد ہوتے تھے۔ تین، پانچ، دس اور تیس سال کے بعد، کبھی صرف زمین کا تبادلہ ہوتا تھا اور کبھی رہائش گاہیں بھی شامل ہوتی تھیں۔ یہ رسم اب ختم ہو چکی ہے، گو ویر، بنیر اور باجوڑ کے ٹیٹ بہاڑی علاقوں میں یہ اس صدی کے چوتھے عشرے میں بھی رائج پائی گئی ہے۔

سکھوں کے قبل از وقت بندوبست اراضی تے ویش تو تسلیم کر لیا لیکن انگریزوں نے ایسا نہیں کیونکہ اس کی وجہ سے ایک علاقہ نہ نظام لگان بھی ممکن نہ تھا اور نہ ہی زمین کا ارتقا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں تبادلے کا مفصل بیان، ایفٹن، ایفٹن، ص ۲۲۶ تا ۲۲۵ پر دیکھا جاسکتا ہے۔ اسم کا ذکر اور برٹن، ایفٹن، ص ۲۳، جیمز ایفٹن، ص ۱۰۱، تا ۱۰۲، ڈیوس، ایفٹن، ص ۵۵، اور لمسن، ایفٹن، ص ۳۰ پر بھی موجود ہے۔

ثقافت اور تصور حیات

پیمٹھان ثقافت پر مذہب اور زبان کا بہت گہرا اثر ہے اور یہ دونوں عوامل پیمٹھان قومیت کے پیچیدہ مسئلے میں بھی بے حد اثر انداز ہیں۔ پیمٹھانوں پر تفصیلی نظر اور ان کے تصور زندگی کی تفہیم کے لئے مذکورہ بالا تینوں عوامل پر کچھ تبصرہ فروری ہے۔

۱۔ مذہب :

اسلام برصغیر کے دوسرے حصوں کے مقابلے پر سرحد میں پہلے پہنچا سوائے سندھ کے جہاں اسے عربوں نے آٹھویں صدی عیسوی میں متعارف کروایا۔ لہذا یہ حیران کن نہیں ہے کہ تمام پیمٹھان مسلمان ہیں چونکہ انہیں اپنا مذہب سنی ترک خاندانوں کے ذریعے ملا لہذا یہ عین فطری تھا کہ پیمٹھانوں کی اکثریت سنی حنفی ہے۔

یہ بھی تعجب خیز نہیں ہے کہ پیمٹھان چونکہ سنجیدہ چیزوں کو سنجیدگی سے ہی لیتے ہیں لہذا وہ اپنے مذہب کے والہ و شیدا اور انٹر دیوانہ

پیرویس۔ لیکن اجتماعی معاملات میں ایک بے حد عزیز غیر مذہبی روایت
خواتنگی کی کم شرح اور اسلام کی اہم روؤں سے صدیوں پر پھیلے ہوئے
الگ تھلگ پن نے اکثر قبائلیوں کے مذہبی شعور کو تنگ اور ذاتی بنا دیا
ہے اور تو ہم پرستی کے راستے کھول دیئے ہیں۔

اصولی لحاظ سے پٹھان اسلامی عقائد کی سادہ ترین شکل پر عمل پیرا
ہے۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ مقررہ نمازیں، اکل و شرب کے قوانین
اور ماہ رمضان کے روزے سختی سے زیرِ عمل ہیں۔

دیکھیں کہ پٹھانوں کی دو اہم ترین مذہبی تحریکات سنی
قدامت پرستی سے منحرف ہوئی ہیں اور ان کا پٹھان تاریخ پر بہت
گہرا اثر ہوا ہے۔

روشنیہ

سولہویں صدی عیسوی کے وسط کے قریب بایزید نامی ایک شخص
جو غالباً پٹھان ماخذ کا تھا گو وہ مدینہ کے عرب انصاری قبیلہ کی رکنیت
کا دعویدار تھا جس نے مکہ شریف سے ہجرت پر آنحضرتؐ کو خوش آمدید کہا
تھا، سرحدی پہاڑیوں میں نمودار ہوا۔ بایزید اپنے دور کے لحاظ سے خاصا
تعلیم یافتہ تھا۔ اس نے مشہور پنجابی صوفی، ملا سلیمان جالندھری سے استفادہ
کیا تھا اور وہ ایرانی صوفیا اور ہندو لوگوں سے بھی متاثر تھا۔

بایزید نے ”پیروشن“ کا لقب اختیار کیا اور ۱۵۴۲ء میں

پٹھانوں نے ایک نئے فرقے کی بنیاد ڈالی۔ وہ ہندو عقیدہ تناہی ارواح کی تبلیغ کرتا تھا اور اس میں مزید اضافہ کرتا تھا کہ کچھ بھی موجود نہیں ہے سوائے خدا کے جس کو پرستش کی کوئی خاص قسم مطلوب نہیں ہے۔ اس کے مطابق زمین پر خدا کا عظیم ترین اظہار پیر کی شخصیت میں ہوتا ہے اور عظیم ترین پیر وہ خود تھا۔

یہ خیالات اسلام کے بنیادی عقائد کے خلاف تھے لیکن روشنی فرقہ چند ہی سالوں میں پورے سرحد میں پھیل گیا اور قریباً سب یوسفزیوں نے اسے قبول کر لیا۔ مذہبی میدان میں پیر روشن کا مہیب ترین مد مقابل پشاور کا اخوند درویش تھا جو پشتو ادب کی اولین عظیم شخصیات میں سے ہے اور غالباً پٹھان تاریخ کا محترم ترین مسمی مذہبی رہنما ہے۔ اخوند نے پیر روشن کو پیر تاریک کہا اور بہت سے گم فداان فرقہ کو واپس آغوش اسلام میں لے آیا۔

سولہویں صدی کے نصف آخر میں روشنی تمام پٹھان معاملات میں ایک متحرک طاقت بن گئے تھے اور ان کی وجہ سے بہت سے بن القباہلی معرکے بھی ہوئے اور مغلوں پر بھی کئی بڑے بڑے حملے کئے گئے۔ یہ فرقہ ۱۶۱۱ء میں قریباً مکمل طور پر تہہ وبالا کر دیا گیا جب مُغل شہنشاہ جہانگیر نے اس کے خلاف ایک زبردست مورچہ لگایا۔ لیکن تیراہ اور کوہ سلیمان کے دور افتادہ وادیوں میں یہ مزید ساہما سال تک جاری رہا اور کھٹاٹ اور تیراہ میں پیر روشن کے چند مریدانیسویں صدی کے وسط تک اپنے

عقائد میں پکے رہے۔ آج کل بھی سُنی قبائل بھند ہیں کہ بنگلہش اور اورکوزہ
کے شیعہ اصل میں روشنی فرقہ ہی کے پیرو ہیں۔

سید احمد بریلوی؟

روشنیہ تو ایک قریب قریب خالصتاً پٹھان فرقہ تھا قباہلوں
کا دوسرا مذہبی جوش و خروش انیسویں صدی کے اسلام میں ایک بڑی تحریک
کا حصہ تھا۔ یہ سید احمد بریلوی کے فرقہ پر مرکوز تھی۔ جنہوں نے ایک ایسی
تحریک چلائی جنہیں برطانوی دستاویزات میں ”ہندوستان کے جنوبی“
”پٹنہ سازش“ یا ”ہندوستانی دہائی“ کہا گیا۔

سید احمد ہندوستان کے عہد سبکدہ میں ۱۷۸۲ء میں پیدا
ہوئے۔ وہ جوانی میں پٹھان قزاق کے لشکر میں سپاہی رہے جس نے
متوسط ہند میں ریاست ٹونک کی بنیاد ڈالی تھی اور بالآخر دہلی آگئے
جو ہندوستان میں انحطاط پذیر مسلمان وراثت کا مرکز تھا۔ دہلی میں
انہوں نے بزرگ محرم شاہ عبدالعزیز ابن شاہ ولی اللہ سے فیض حاصل
کیا۔ سید احمد کی مذہبی سوچ بچار مھوڑے ہی عرصہ بعد فوجی رنگ
اختیار کر گئی اور ان کے گرد کچھ ارادت مند اکٹھے ہو گئے جن میں شاہ
عبدالعزیز کا بھتیجا داماد بھی شامل تھا۔ انہوں نے ایک کتاب شائع

۱۷۸۲ء میں لکھی تھی اس عقیدے کا ذکر کیا ہے۔ ایضاً ص ۲۱

کردائی جس میں پنجاب اور سرحد کے مسلمانوں پر سکھا شاہی کے مظالم کی پیمر زور مذمت کی گئی تھی۔

۱۸۲۰ء میں سید احمد نچ پر گئے اور عرب میں وہ سعود خاندان کے بنا کردہ وہابی فرقہ کے زیر اثر آگئے۔ ہندوستان واپس آکر انہوں نے سکھوں کے خلاف اعلان جہاد کیا اور جب ہندوستان میں کئی دوروں کے بعد ان کے پیروؤں کی تعداد بڑھ گئی تو وہ سرحد کو چل پڑے۔ پٹھان بالخصوص یوسفزئی جو سکھا شاہی سے بہت تنگ تھے سید احمد کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے اور موخرالذکر نے ورانی سرداروں کے ساتھ مل کر وسیع پیمانے پر بناوت کے انتظامات کئے۔ یہ سردار سکھوں کی طرف سے پشاور کے حکمران تھے جب ایک سکھ فوج سرحد پہنچی تو سرداروں نے سید صاحب کا ساتھ چھوڑ دیا اور ان کے قبائلی لشکر کو ۱۸۲۸ء کے معرکے میں تتر بتر کر دیا گیا۔ اس کے بعد سید احمد یوسفزئی علاقہ میں پناہ گزین ہوئے اور مزیدہ اور جھنڈ کے خوانین اور ملک میر بابا چارگلئی کی مدد سے سرداروں پر کامیاب حملہ کیا اور یار محمد ۱۸۲۹ء کی جنگ زیدہ میں مارا گیا۔ ۱۸۳۰ء میں وہ پشاور کے سرداروں اور سکھ گورنر کو بھگانے میں کامیاب ہو گئے اور یہ شہر

۱۔ سرولم ہنٹر کی "آرٹھن مسلمانز" (لنڈن: ٹروبر، ۱۸۷۲ء) سید احمد کی تحریک کا ایک جامع لیکن متعصبانہ بیان ہے۔

مختصر سے عرصہ کے لئے ایک نئی اسلامی سلطنت کا پایہ تخت بن گیا۔
سرحد آنے سے پہلے سید احمد نے ہندوستان میں مراکز قائم کئے
تھے۔ یہ گروہ برطانوی حکام سے متصادم ہو گئے اور سید صاحب کو
سکھوں کے خلاف مہمات میں ان کی طرف سے مسلسل کمک ملتی رہی
اہم ترین مرکز پٹنہ تھا۔

سید صاحب سرحد میں اپنے تہمیری عقائد پھیلاتے رہے اور اس
بنیاد پر کہ ہر صحیح مسلمان کو شادی شدہ ہونا چاہیے۔ انہوں نے پٹنہ
پر زور ڈالا کہ وہ ان کے پیروں کو رقیقہ ہائے حیات مہیا کریں جو
ہندوستان سے ان کے بغیر آئے تھے۔ بالآخر قبائلی ان کی تعلیمات کے خلاف
اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک مقررہ جمعہ کو پورے یوسفزئی علاقہ میں آگ
جلائی گئی اور اس اشارے پر سید صاحب کے ملاء مار دیے گئے اور
ان کی روحانی قیادت کو ٹھکرا دیا گیا۔

اس کی وجہ سے ان کے گروہ کو ضلع ہزارہ کی کچھلی وادی میں
پناہ لینا پڑی جہاں ان پر سکھوں نے دباؤ ڈالا اور ہم مئی ۱۸۳۱ء کو
بشیر سنگھ اور جنرل ایویٹیل کے تحت ایک سکھ فوج نے سید صاحب کو
شہید کر دیا۔ باقی ماندہ گروہ کو بنگال اور پٹنہ سے مسلسل امداد اور رضا کار

۱- راقم الحروف کو درانی سرداروں، سکھوں اور سید احمد کے درمیان ٹکونی آدیش
کے واقعات کا صحیح تسلسل قائم کرنے میں مشکل پیش آئی۔ یہاں جو تسلسل دیا گیا ہے۔
(باقی حاشیہ دیکھئے)

ملتے رہے اور اسکی کی سرگرمیاں روز بروز انگریزوں کے خلاف بڑھتی گئیں۔ ۱۸۵۸ء تک تحریک نے دوبارہ اتنی قوت حاصل کر لی کہ خدا خیل نے فرنگی راج کے خلاف بغاوت کردی۔ ایک برطانوی دستہ یستی تباہ کرنے کے لئے بھیجا گیا لیکن گروہ یہاں سے ناقابلِ رسائی برائے ودادی میں منتقل ہو گیا۔

۱۸۶۸ء میں انگریزوں کے خلاف اعلانِ جہاد کیا گیا اور ویر سے کوہستان تک کے تمام قبائل فرنگیوں کے خلاف اس فرقے سے مل گئے۔ نتیجہً فیصلہ کی مہم تھی جس میں انگریزوں کی ۹ ہزار فوج کا ۱۰ فیصدی حصہ مارا گیا یا زخمی ہوا۔ یہ اس وقت تک شمال مغربی ہندوستان میں انگریزوں کی سب سے بڑی مہم تھی۔ سید احمد کے پیروؤں اور قبائلیوں کے راستے ایک دفعہ پھر جدا جدا ہو گئے اور ان کی بستی بنیر اور سندھ پارکوہ سیاہ میں قائم ہونے سے پہلے تیس سال تک ادھر اُدھر بالائی یوسفزئی علاقہ میں بٹکتی رہی۔ اس کے چند علمبردار اب بھی پھر قند میں موجود ہیں۔

روشنیہ اور سید احمد کا بنا کردہ گروہ مذہب کی دو مقابل انتہاؤں پر تھے۔ اول الذکر ایک خالص مقامی فرقہ تھا جس میں صوفیانہ

(ملقہ حاشیہ)

وہ حیران افشاں، ص ۷ تا ۱۱ کے مفصل بیان پر مبنی ہے جو مذکورہ واقعات کے ۲۵ سال بعد مقامی ذرائع سے اکٹھا کیا گیا تھا۔

رجحانات غالب تھے جبکہ آخر الذکر تہلیری رجحانات کے عربی و ہندوستانی اسلام کی پیداوار تھا۔ ان کے درمیان ۱۰ سال کا زمانی فاصلہ تھا۔ پٹانوں نے دونوں فرقوں کی اطاعت قبول کی لیکن پھر تھوڑے ہی عرصہ بعد کناہ کشی کر لی۔ لیکن ہر فرقے نے اپنے عروج پر بے پناہ جوش و خروش پیدا کیا اور اہم واقعات کو ختم دیا۔ یہ سمجھنا مشکل ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔ پٹانوں کی مسئلہ زرد اعتمادی ایک ناکافی جواب ہے۔ غالباً دونوں تحریکات میں کشش اس وجہ سے تھی کہ انہوں نے اسلام کے پردے میں پٹانوں کی انفرادیت اور اپنے نام نہاد حکمرانوں دیہلی میں مغل اور دوسری میں سکھ اور انگریز کے خلاف نفرت کے اظہار کے مواقع پیش کئے۔ بہر کیف اس میں کلام ہے کہ اگر یہ تحریکات پُر امن اور غیر سیاسی ہوتیں اور ان کا اس دنیا میں انتقام و عظمت و شہرت کی بجائے صرف اگلی دنیا میں نجات سے سروکار ہوتا تو بھی ان میں کوئی کشش نہ ہوتی۔

۲۔ زبان و ادب

کابل کے بعض عاشقانِ پشتو کا دعویٰ ہے کہ یہ زبان قدیم آریہ زبان کی براہِ راست اولاد ہے اور سنسکرت اور اوستائی دونوں پشتو کی شاخیں ہیں۔ یہی مکتبہ فکر غور کے امیر کر وڑ کے حوالے سے کہتا ہے کہ پشتو شاعری آٹھویں صدی عیسوی میں بھی موجود تھی۔ یہ دعویٰ

مشکوٰۃ معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ خاصا واضح ہے کہ زبان کا ارتقا بحیثیت ایک ادبی ذریعہ اظہار و دروہ اسلام کے بعد ہوا۔

فیثا بہت کم پشتو ادب کا یورپی زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے اور معدودے چند مسودات یا مطبوعات دستیاب ہیں: ۱۔ اولین عظیم قلم کار غالباً خود دروہ تھے اور ان کی تصنیف "مخزن" قریباً ۱۵۲۵ء سے شروع ہوتی ہے۔ یہ کتاب پیر روشن کے نظریات کی شستہ تردید ہے اور اصولی الہیات، خطیبانہ طرافت اور منطقی استدلال کا ایک نمایاں امتزاج ہے اور تقاسم ایکوئیٹاس کی "ستما تقیا لوجیکا" کی یاد دلاتی ہے ۲۔

۱۔ انگریزی کتب میں شاہ ایچ۔ جی۔ راوٹ کی "سیلیکشن فرام دی پورٹری آف دی افغانز" (لندن: ولیمز اینڈ مارکیت، ۱۸۶۷ء) اور سی ای بڈلف کی افغان پورٹری آف دی سینتھ پری "لندن لیگن پال، ٹریچ، ٹرویر، ۱۸۹۰ء) جیفرڈر میٹری کی "چینس پاپویرس ڈیس افغانز" (پیرس امیری میری نیشنل ای بیروکس ۱۸۸۰ء تا ۱۸۹۰ء) میں لوک گیتوں کا ایک بڑا انتخاب ہے جن میں سے بہت سے اس دور اور قدیم دور کے مشہور واقعات پر ہیں۔ ڈارمیٹری کی کتاب کا پہلا حصہ غالباً بہترین دستیاب ثقافتی و لسانی تاریخ ہے۔ پشتو اکاڈمی پشاور کے پاس بھی مسودات کا ایک خاصا مجموعہ اور اسے کچھ مطبوعات کا بھی شرف حاصل ہے۔

۲۔ سینٹ تقاسم ایکوئیٹاس ۱۲۲۷ تا ۱۲۷۷ء الہیات اور علم الکلام کا ماہر (باقی مانشیہ لکھ صفحہ پر)

خوشحال خان خٹک :

خوشحال خان خٹک جو غالباً پشتو کا بہترین اور مشہور ترین شاعر تھا ۱۶۱۳ء میں پیدا ہوا۔ وہ طاقتور خٹک قبیلے کے سردار شہباز خان کا بیٹا تھا۔ صاحب سیف و قلم تائیس سال کی عمر میں اپنے قبیلے کا سردار بنا جب اس کا والد یوسفزیوں سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ خوشحال خان کے پاس منسل شہنشاہوں کی طرف سے ایک جاگیر تھی اور اس نے کئی شاہجہانی جنگوں میں حصہ لیا جن میں ۱۶۴۴ء میں بدخشان کی ایک مہم بھی شامل تھی۔ خوشحال خان کی شہنشاہ اورنگ زیب سے ان بن ہو گئی جو ۱۶۵۹ء میں شاہ جہان کا جانشین بنا تھا۔ اورنگ زیب نے شاعر کو سات سال کے لئے متوسط ہند کے قلعہ گوالیار میں قید کر دیا اور اسی دوران خوشحال کی اکثر بہترین تصانیف لکھی گئیں۔

رہائی کے بعد خوشحال خان واپس اپنے گھر آیا اور شہنشاہ کے خلاف ایک قبائلی اتحاد قائم کیا۔ اس میں اس کے بڑے حلیف آفریدی تھے اور بڑے حریف یوسفزی۔ آخر کار اورنگ زیب نے اس اتحاد کو رشوت اور مناصب کے وعدوں سے توڑ دیا اور خوشحال خان کا اپنا بیٹا بہرام مغلوں سے جا ملا اور کئی دفعہ اپنے والد کی جان لینے کی کوشش

(بقیہ حاشیہ)
المعرف بہ "عالم ملکوٹی" سینٹ انسٹان کے بعد کبھی تک عیسائیت پر مبنی نیا اثر لگا رہا ہے۔ اس کی مذکورہ کتاب عام معلومات اور اہلیات کا خلاصہ ہے (مترجم)

کی۔ قبائل کے افتراق اور اپنے بیٹے کی دغا بازی نے خوشمال میں ایک سخت تلخی اور بیزاری پیدا کر دی جو اس کی بعد کی نظموں میں عکس پر ہے۔

مُغلوں کے مستقل دباؤ کے تحت خوشمال نے اپنے وفادار بیٹے اشرف کے حق خٹکوں کی سرداری و ستبرداری اختیار کر لی جو خود بھی ایک معمولی شاعر نہ تھا اور خود چند جان نثاروں کے ساتھ پہاڑیوں میں جا بجا پھرتا رہا جیکہ بے رحم بہرام اس کا تعاقب کرتا رہا، ضعیف شاعر بالآخر آفریدی علاقے میں آباد ہو گیا اور ۷۸ سال کی عمر میں خاتمی حقیقی سے جا ملا۔ اس کی میت دریائے سندھ کے مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ واقع خشک پہاڑوں میں اکوڑہ کے مقام پر لائی گئی اور خفیہ طور پر دفن کر دی گئی تاکہ اسی کے الفاظ میں ہے

اڑا کر نہ لائے جہاں باؤ کوہ - مُغل شہسواروں کی گودِ سمند
اس کا مقبرہ آج بھی موجود ہے اور پٹھانوں کے لئے مقدس ہے۔
پٹھان عزت و غیرت کے مین مطابق خوشمال نے روایت کے مطابق وصیت کی کہ اگر بھی اس کا کوئی وفادار بیٹا اپنے غدار بھائی بہرام کو پکڑ سکے تو اسے دو حصوں میں کاٹ کر ایک حصہ خوشمال کی قبر کے پاؤں اور دوسرا اس کے سر پر چلا دیا جائے۔

خوشمال کی تحریات ایک وسیع میدان پر محیط ہیں۔ راولپنڈی کے مطابق خوشمال نے پشتو اور فارسی دونوں میں طب، اخلاقیات، فقہ،

فلسفہ اور شاہین بازی پر لکھا اور ایک خود نوشت سوانح عمری بھی لکھی، لیکن اس کی شہرت شاعری پر منحصر ہے۔ کئی سونظیں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں ان میں سے بہت سی کا ابھی ترجمہ نہیں ہو سکا۔ منظومات بھی موضوعات کے ایک وسیع میدان پر محیط ہیں یعنی عشق و محبت، جنگ و جدل، شکار، فطرت، مذہبی عبادات اور سیاسی معاملات ان تمام میں سے خوشحال خان حقیقت پسندی سے کام لیتا ہے اور اس لحاظ سے وہ پشتو شعراء میں اپنی مثال آپ ہے کیونکہ اکثر پشتو شعراء صوفیانہ انداز میں مادی و جسمانی تشبیہات صرف عشق الہی اور صداقتِ ابدی کو بیان کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

خوشحال خان تادن بیٹوں اور غیر شمار کردہ بیٹیوں کا باپ تھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ جب وہ اپنی محبوبہ کے شیریں لبوں، پتلی لہجہ اور گداز کو لبوں کا ذکر کرتا ہے تو وہ کسی صوفیانہ علامت کی بجائے گوشت پوست کی عورت کا ہی ذکر کرتا ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس نے اپنے بڑھاپے کی مندرجہ ذیل نشانی کو کئی دفعہ حقیقت بنایا ہوگا۔

”یوڑھے عقاب کی طرح میری پروازیں بھی پہاڑیوں میں ہیں
پھر میں نے بہت سے خوبصورت نوجوان چکور پکڑے ہیں
عقاب جوان اور اناڑی ہو یا یوڑھا اور تجربہ کار، اپنا شکار
لو۔ راورٹی، ایضاً، ص ۷۴۔

خود تلاش کرتا ہے۔ لیکن بوڑھے پسندے کی جھپٹ زیادہ چچی سکی
اور تیر ہدف ہوتی ہے۔

اے خوشحال، معاملات عشق آتیش اور بھرپور ہیں
اور اگر شعلہ مجھ بھی جلے تو دھواں باقی رہتا ہے۔

خوشحال خان کی اپنی سرزمین اور اس کے لوگوں سے محبت ان
کے افزاجِ پیاس کی مایوسی اور مغلوں سے اس کی نفرت بے پناہ
اس کی نظموں میں جیتے جاگتے انداز میں بیان کی گئی ہیں۔

”قدیم ایام میں پٹھان ہندوستان کے بادشاہ تھے
اور اب بھی وہ مغلوں سے گئے بھقت لے جاسکتے ہیں
لیکن ان میں کوئی اتفاق نہیں اور انہوں نے خدا سے بھنتے
ہوئے اتحاد کو توڑ دیا ہے۔

لہذا وہ بھی ہو کر رہ گئے
یا خدا: اگر تو انہیں پیار محبت سے نواز دے
تو خوشحال پھر سے جوان ہو جائے!

۱۔ اس کتاب میں پشتو شاعری کے ترجمے مختلف ذرائع سے لے گئے ہیں جن میں زبانی
ذرائع بھی شامل ہیں لیکن نظموں کا متن عام طو پر راوی اور بیڈلف کے تراجم
کا، متن ہے۔

نخود دار پختون مُغل کے ساتھ کیسے صلح کر سکتا ہے؟

وحشی جانور آسانی سے صلح جوئی کر سکتے ہیں

جس کا فخر ہی اس کے گھردرے پہاڑی کپڑے ہوں

اسے نمائشی مُغل شال زیب نہیں دیتے

یقیناً پختون سوجھ بوجھ میں کمزور ہیں

وہ قصاب خانے کے دُم کٹے سگ ہیں

انہوں نے مُغل سونے کے بدلے حکومت گنوا دی

اور وہ مُغل عہدوں کے لئے بے چین ہیں

اگر ایک لدا ہوا اُونٹ ان کے گھروں میں داخل ہو

تو وہ سب سے پہلے اس کے گلے کی گھنٹی چرانے کی فکر کرتے ہیں۔

وہ قندھار سے شروع ہوتے ہیں اور دغار تک پھیلے ہوئے ہیں

اور ان کے درمیان رہنے والے سب لوگ بے کار اور نکمے ہیں

اگر پختون لوگ نسل انسانی سے تعلق رکھتے ہیں

تو انداز و اطوار میں وہ بالکل ہندو ہیں

اُن کے پاس نہ کوئی ہتھیار ہے نہ ذہانت

بلکہ وہ جہالت اور لڑائی میں مست ہیں۔

وہ نہ اپنے آباؤ اجداد کے احکام مانتے ہیں

نہ اپنے اساتذہ کرام کی بات سنتے ہیں۔

وہ ہمیشہ ایک دوسرے کی گھات لگاتے رکھتے ہیں

لہذا بد نختی آن پر ہمیشہ مسلط رہتی ہے
 پھر بھی او خوشحال! خدا کا شکر بجالاؤ
 کہ وہ غلام نہیں بلکہ پیدائشی آزاد ہیں۔“

خوشحال خان نے شاعری میں وہی جرأتِ زندانہ اور جذبے کی
 آغ بھردی جس کا مظاہرہ پٹھان لڑائی میں کرتا ہے۔ اسی طرح وہ
 پٹھان کی خود اطمینانی اور فقدانِ عجز بھی اس میں لایا اور پُر سکون انداز
 میں اعلان کیا: ”جب میں نے شاعری میں اپنا جنگی پرچم بلند کیا تو میں نے
 اپنے جنگی گھوڑے پر الفاظ کی دنیا سوار کر دی۔“

لیکن اس میں تقدیر پرستی اور عیشِ کوشی کا عنصر بھی تھا جو اکثر
 طور پر ہمیں عمر خیام کی یاد دلاتا ہے جیسا کہ اس کی نظم ”توصیفِ شراب“
 میں ہے۔

”میں تو ایک بلانوش ہوں مجھ سے متانت نہ ڈھونڈو
 میں تو صبح سے شام تک جامِ ہائے بے زنیہ پیتا رہتا ہوں
 اے شراب تیرے چہرے سے حسنِ آفتاب کا کون مقابلہ کر سکتا ہے؟
 سوچ تو ایک چراغِ ناتواں ہے جبکہ تو صبح صادق کی مقابل ہے۔
 زاہد! ایک دوشیزہ کا چہرہ دیکھنے سے اپنی آنکھیں مست بند کر دو
 یہ فعلِ شرعِ عشق میں جائز ہے۔“

ساتی! لمحاتِ غم میں اپنی شراب میرے جام میں ڈال دو
 تاکہ یہ بلور میں چمکتی ہوئی ابھرے۔

محتسب! اٹھو کہ خوشحال آگیا
رٹنے کے لئے تیار ہو جاؤ! غسلِ شراب کرو
کیونکہ وضو پچھے مسلمان کا اوزار ہے“

بعد کے خٹک :

خوشحال خان کا شاعرانہ جوہر اس کی اولاد میں بھی نمودار ہوا۔
اس کی بیٹی حلیمہ ایک اچھی شاعرہ تھی اور اس کا بیٹا اشرف جس نے
اپنی زندگی کے آخری دس سال مُغل قیدی کی حیثیت سے حیدر آباد دکن
اور مہاراشٹر میں گزارے۔ پشتو کے نصف درجن بہترین شعراء میں
شمار ہوتا ہے۔ اشرف کی اکثر نگاشات گمشدہ وطن کے افسوس اور
جلا وطنی کی آرزوؤں کا ایک درد انگیز اظہار ہیں۔ لیکن وہ اپنے والد کی
آشنا کی اور عالمگیریت سے بے بہرہ تھا اور اس کی بہت سی تخلیقات
ادق اور اس کے معانی مبہم ہیں۔

خوشحال خان کا ایک اور بیٹا، عبدالقادر خان خٹک اکثر چٹانوں
کے نزدیک اپنے بھائی اشرف سے بہتر شاعر تھا۔ قادر نے جامی اور سعدی
کی نظموں کو فارسی سے پشتو میں منتقل کیا اور اس کی اپنی تحریرات میں
اپنے مدوح و محبوب ایرانی صوفیوں کے تصوف کا گہرا اثر ہے۔ قادر
اپنے بڑے بھائی سے بدخلقوں کی سرداری کا آرزو مند تھا لیکن اشرف
کے بیٹے، افضل نے ایک ہی دن میں قادر، دس دوسرے چچا اور بہت

سے عمر اور موت کے گتات اتار دیئے۔

نوشمال خان کا پوتا افضل اپنی ادبی اور خون آشام صفات کی وجہ سے مشہور ہے۔ اس کی نظمیں بہت کم دستیاب ہیں لیکن اس کی تاریخ مرصع پندھویں تا اٹھارہویں صدی کے قبائل پر ایک بہترین تاریخی ماخذ ہے۔

افضل کا بیٹا قاسم خان خشک (نوشمال خان کا پڑپوتا) ۱۷۲۵ء کے قریب پیدا ہوا۔ وہ اوائل عمری میں ہی اپنی آبائی سرزمین چھوڑ گیا اور کشمیر اور ہندوستان میں پھرتا رہا۔ وہ تھوڑا عرصہ سرہند میں رہا اور پھر رام پور کی روھیلہ ریاست میں آباد ہو گیا۔ اس نے شادی نہیں کی اور جب وہ رام پور میں فوت ہوا تو اس کی میت خشک پہاڑیوں میں لاکر آبائی قبرستان میں ہی دفن کی گئی۔ قاسم "شیدا"، تخلص کرتا تھا اور اپنی زندگی کے آخری ایام میں سرہندی صوفیا کا ارادت مند رہا۔ اس کی نظموں میں تصوف کی چاشنی ہے اور ان میں کلاسیکی فارسی تشبیہات اور مابعد الطبیعیات استعارات بہت زیادہ ہیں۔ پٹان اس کی نگارشات کو بہت محرم گردانتے ہیں لیکن ان میں نوشمال خان کے اشعار کی جذبات انگیزی نہیں ہے

تاریخ مرصع کا جزوی ترجمہ "خالہ افغانی" مجموعہ میں مل سکتا ہے۔ مترجم ٹرلوپر چیل

پلاؤڈن (لاہور) منشی گلاب سنگھ، ۱۸۹۳ء

اور بہت سے قبائل تو قاسم کے صوفیانہ مطالب کو شاید ہی سمجھے
ہوں گے۔

رحمان بابا ۲

ملا عبد الرحمان المعروف بہ رحمان بابا غالباً خشک مکتب شعر
کے باہر سب بڑا شاعر تھا اور پٹھان اس کا ایسے ہی حوالہ دیتے
ہیں جیسے عظیم خوشحال خان کا۔ رحمان ایک غوریہ خیل مہمند تھا جو
اپنے ولایتی گاؤں میں الگ تھلک زندگی گزارتا تھا اور زیادہ وقت
مذہبی ریاضت پر صرف کرتا تھا۔ ۱۰ اس کی اکثر نظمیں ۱۶۶۰ء اور
۱۷۱۰ء کے درمیان لکھی گئی ہیں یعنی خوشحال خان سے کم و بیش
ایک نسل بعد۔

رحمان بابا کی نظموں میں بھی صوفیانہ رنگ ہے لیکن ایرانی صوفیا
اور ان کے مقلدین کے برعکس اس کی نظمیں سادہ اور دل بدل ہیں۔
اس کی ایک نظم اللہ تعالیٰ کی حمد و مناجات ہے جس میں اسماء الحسنیٰ
ایسے گنوانے گئے ہیں جیسے مائی سین دتا ویر میں لم اور اسلام کے عید

المعمیائی عقائد کا ایک باقاعدہ منشور جسے نائسیا منعقدہ کونسل نے ۲۲۵ء میں ایک
دستویر کی شکل دی اور جس میں عقیدہ تشلیث پر بہت زور دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ
مشابہت غلط اور گمراہ کن ہے (مترجم)

امثال، اللہ کی جنگ جو باتہ واحدیت و احدیت پر بار بار تکرار کے ذریعے
 زور دیا گیا ہے۔ رحمان نے اخوت انسانی اور تسخیر ذات کی بھی ایسی
 زبان میں تبلیغ کی جو عیسائی صوفیا کی یاد دلاتی ہے۔ اس کے ابیات
 ایسی کہاوتوں سے بھرپور ہیں جیسے ”ایک پٹ اندھا اس آدمی سے بہتر
 ہے جو دوسرے کی میوی پر نظر رکھتا ہے“ اور ”ہیں رحمان ہر اس آدمی کا
 غلام ہوں جو خدا ترس ہو خواہ وہ اونچے، درمیانے یا نیچے درجے کا ہو۔“
 لیکن رحمان بابا میں اتنی پٹھانیت تھی کہ وہ خوشحال خان کے ایک نصف
 صدی پرانے چیلنج کا جواب دینے بغیر نہ رہ سکا جب اس عظیم شک
 نے ”دنیا کے انفاظ پر چھا جائے“ کا شیخی بھگاری تھی ۱۰ اس نے اپنی ایک
 نظم کے مقطع میں کہا ”خوشحال خان میرا ایک غلام تھا کیونکہ پشتو زبان
 میں میں ہی واحد عالمگیر ہوں“ ۱۱

عبدالحمید :

رحمان بابا کا ایک نوجوان معاصر عبدالحمید بھی مہمند تھا اور
 صوفیا کا معتقد تھا۔ وہ موٹگانی کا شیدا تھا اور زندگی کے متعلق ایک
 طنزیہ اور مزاحیہ تصور رکھتا تھا ۱۰ اس کی ایک بے حد اثر انگیز نظم یوں
 شروع ہوتی ہے :

۱۰۔ عالم گیر مغل شہنشاہ اور نگریب کا لقب تھا جس نے خوشحال خان نیکست دی تھی۔

”اے احتیاج! تو کیسی بلائے عظیم ہے!

تو فطرتِ انسان کو فطرتِ سگ میں بدل دیتی ہے
تو مسلمان کو ہندو و رسومات منانے پر مجبور کر دیتی ہے
اور ہندوؤں کو مسلمانوں کے رواج کا پابند بنا دیتی ہے
تو شاہوں اور شہزادوں کو اپنے دروائے پر لاکھڑا کرتی ہے
اور انہیں ان کے تخت و تاج سے محروم کر دیتی ہے۔“
عبدالحمید کی ایک اور نظم جو عشق کے موضوع پر ہے اس طنزیہ
انراز میں شروع ہوتی ہے۔

”جیسے تخت و تاج بادشاہوں کو

ایسے ہی تباہی و بربادی عاشقوں کو عجزِ نیرہیں

مرزا خان انصاریؒ

مرزا خان انصاری عام طور پر روشنیہ فرقہ کے بانی، پیر روشن
کا ایک پوتا خیال کیا جاتا ہے لیکن کچھ مدح سرچٹھان اسے سوفیصدی
یوسفزئی قرار دیتے ہیں۔ قاسم خان خشک کی طرح انصاری بھی اپنی
پہاڑیوں سے باہر نکل گیا۔ وہ ہرات میں جانا پہچانا جاتا تھا۔ وہ ایک
راجپوت ریاست میں کچھ عرصے کے لئے درباری شاعر بھی رہا۔ مُغل
شہنشاہ اورنگزیب نے اس کی سرپرستی کی اور اپنی قدامت پسندی کے
باوجود انصاری کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا حالانکہ اس کی نگارشات

میں اپنے دادا کی بدعت اور آرتا اور اس کے اپنے صوفیانہ میلانات کے آثار پائے جاتے ہیں۔ آخری ایام میں انصاری سبکدوش ہو کر واپس تیراہ میں آگیا۔ اپنے بدعتی عقائد سے تائب ہوا اور اس وقت کے پشاور کے موقت الشیوع مکاتب فکر کا ایک مشہور مذہبی عالم بن گیا۔

خواجہ محمد بنگش

خواجہ محمد بنگش کی زندگی کے حالات بہت کم معلوم ہیں اور اس کی صرف چند نظمیں ہی دستیاب ہیں۔ خواجہ محمد بشتوا دب میں ناقدین کے شاعر کی مانند ہیں اور اب بھی بنگشوں کے بعض قبیلے اسے اپنے آبائی شاعر کی حیثیت سے محرم گردانتے ہیں گوارے سمجھنا کاردار۔ اس نے شہنشاہ اورنگزیب کے دور حکومت میں راسخ الاعتقادی کے محافظ کی حیثیت سے بہت شہرت حاصل کی اور حرمین شریفین کی زیارتیں بھی کیں تاہم اس کی معدودے چند دستیاب نظموں میں بہت سے دیگر پٹھان شعراء کی مانند صوفیانہ رجحانات پائے جاتے ہیں اور اس کا روایتی اخلاقی و نیات سے انحراف اس کے مندرجہ ذیل شعر سے ظاہر ہے :

اللہ تعالیٰ کے بحر رحم و کرم کی مہر آگیں لہروں میں
خواجہ محمد کے چھوٹے چھوٹے گناہ کیا حیثیت رکھتے ہیں؟
پشتو شاعری کی تاریخ میں اور بھی بہت سے اسمائے صغیرہ

ہیں۔ اس عظیم روایت میں قریباً سب کے سب مشمولہ بہ بہت سے
 مذہبی رہنما اہل سیف و قلم ہیں۔ آج کل بھی پشاور یا کابل میں غالباً شعراء
 کا اجتماع ہونا دوسرے پیشوں کے مقابلے پر آسان تر ہے سوائے مجاہدوں
 کے۔ اہم ترین باغی ملوک (جو آج کل پختونستان تحریک چلاتے ہیں)
 میں سے ایک میراجان مہمند ہے جو اپنے تخلص سیال کی بدولت دُور
 دُور تک جانا پہچانا جاتا ہے اور آتنا متنازعہ فیہ نہیں رہتا۔ ایسے ہی
 حاجی ترنگزئی ایک مہمند ملا تھا جو بیسویں صدی کے ربع اول میں انگریز
 حکمرانوں کے پہلو میں کانٹا بنا رہا لیکن وہ بہت سے قبائلی دیہات میں
 انگریزوں کے خلاف جہاد سے کہیں زیادہ پشتو زبان کے مرئی اور عالم
 کی حیثیت سے مشہور تھا۔

احمد شاہ ابدالی !

لیکن ان دوسرے قلم کاروں میں سے ایک خصوصی ذکر کا مستحق
 ہے اور وہ بنیادی طور پر اس لئے کہ اس کا ادبی ذوق ایک عظیم تاریخی
 اہمیت سے مربوط تھا۔ یہ احمد شاہ ابدالی ہے جو افغانستان کا
 اصلاً اور واقعاً بانی ہے، جیسا کہ پہلے ذکر ہوا۔ احمد شاہ نے ۱۷۴۸ء
 میں درانی خاندان کی بنیاد رکھی اور بعد میں ایران کے بیشتر حصہ
 کشمیر اور شمالی ہندوستان پر اپنی حکومت پھیلا کر ۱۷۶۱ء کی تیسری
 جنگ پانی پت میں مرہٹہ طاقت کو پاش پاش کر دیا۔ احمد شاہ نے

فارسی میں کئی نظمیں لکھیں اور غزلوں کا ایک مجموعہ اپنی مادری زبان پشتو میں چھوڑا۔ اپنی خونیں زندگی کے برعکس احمد شاہ کی نظمیں اپنے گناہوں کے لئے خدا کے رحم و کرم کی التجاؤں اور اپنے جسم کی تصریحات و مطموعات کو زیر کرنے کی قوت کے لئے عموماً عاؤں سے مملو ہیں۔ ایک کا مطلع ہے۔

”میرے اللہ! میں تجھے پکارتا ہوں کیونکہ میں اپنی خطاؤں اور عداوت پر شرمسار ہوں لیکن میں مایوس نہیں ہوں کیونکہ کوئی بھی تیرے در سے رحم کی امید سے خالی نہیں گیا“

ایک اور نظم کا مطلع ہے :-

”خدا تجھے غارت کرے انسانی فطرت! کہ تو ایک مکھی ہے

اور کوئی بھی منہ تیری ناپاک لمس سے عیر آلودہ نہیں رہا!“

اپنے گوشت و پوست کی لذتوں کے تعاقب سے یہ اظہار

نفرت سخت کوش ایشیائی قائد احمد شاہ کو کم از کم ایک لحاظ سے

قرن وسطیٰ اور ابتدائی نشاۃ ثانیہ کے عیسائی یورپ کے حکمرانوں

کے دوش بدوش لا کھڑا کرتا ہے۔

پشتو لوک ادب :-

بہت سے گیت اور قصے جو پٹھان دیہات میں دہرائے جاتے

ہیں قرن وسطیٰ کے یورپ کے لوک ادب کی جولان کی یاد دلاتے ہیں۔

ایک مشہور ترین گیت کابل عشیقہ گیت ہے ”زخمی دل“ جو ایک بدلے ہوئے
 لہجے اور الفاظ (بے مدعیاں) میں برطانوی راج کے پٹان سپاہیوں
 کے کوچ کا پسندیدہ گیت تھا۔ ایک اور نسبتاً آسان اور سادہ عشیقہ
 گیت دو بیتہ ہے۔ چونکہ مستورات حصہ نہیں لیتیں لہذا محبوبہ کا جواب
 محبس کا ایک اور مرد رکن جو اکثر و بیشتر ایک عورت کے محبس میں
 ہوتا ہے، ہی گاتا ہے۔ اس گیت کا کچھ حصہ درج ذیل ہے۔

”پھول تیرے بالوں میں ماند پڑ جاتے ہیں

اور تنہا راتیں میری محبوب! محبت کے پھول ہیں۔

اے میری خزانہ نایاب!

اے میری زندگی! اے میری روح!

اے میری چھوٹی سی پہاڑی کوکنار!

تو میری ستارہ صبح ہے:

تو پہاڑی پر کھلا ہوا پھول ہے۔

تو چوٹی کی سفید برف ہے۔

تیری ہستی آتش ہے

تیری سرگوشی ہوائے شب ہے۔

اے میری سگوفہ سیب کی ٹہنی!

تیری آنکھوں میں چاندنی کس نے بھری؟

اے میری تیلی!

آؤ اور میرے ساتھ رہو!

اے میرے محبوب! میرے لئے تخت سلیمان پر ایک جھونپڑی

بنادو!

اور میں ایک سنہری چکور کی طرح ناچتی ہوئی وہاں پہنچ جاؤں گی!“
پٹھان قصہ خوانوں کی ایک پسندیدہ کہانی پٹھان کے تیزی سے
بدلتے ہوئے لیکن ہمیشہ عملی تصور زندگی کا آئنا بھر پورا اظہار ہے کہ اس
کا چر بہ مکمل لیکن خلاصہ کی شکل میں درج ذیل ہے۔

” ایک دفعہ ایک بادشاہ کی ملکہ بہت خوبصورت تھی۔ اس کے حسن
کا شاہکار اس کی آنکھیں تھیں جن میں وہ لطائف و عجائب منعکس ہو
جاتے تھے جو وہ دیکھتی یا سوچتی تھی۔ ایک دن بادشاہ نے جو اس پر دل در
جہاں سے فریفتہ تھا، اس کی آنکھوں میں اُداسی دیکھی۔ حکماء کے علاج کے
باوجود یہ ویرانی بڑھتی گئی۔ بادشاہ نے اپنے تمام مشیروں کو بلایا اور
مشورہ پوچھا۔ شعر گو عمر کا یہ مشورہ تھا کہ بادشاہ کو اس حسن کے لئے
شکر گزرا ہونا چاہیے جس سے وہ پہلے ہی ملکہ کی آنکھوں میں دیکھ کر محفوظ
ہو چکا تھا، اور اسے اس تکلیف کو قبول کر لینا چاہیے لیکن اسے
آسان بنانے کے لئے اسے اپنے تمام خوابوں کا رنگ اور اپنے دل کی
ساری روشنی ملکہ کی آنکھوں میں انڈیل دینی چاہیے۔ عمر کا یہ خیال تھا
کہ اس طرح وہ دوبارہ وہی ندر سے یاد کر سکے گا اور سن سکے گا جو
ملکہ کی آنکھوں سے برآمد ہوتے تھے۔

وانشمنڈ خلیل نے کہا ”بے ہودہ، خرافات، جھوٹ موٹ! میرے
بادشاہ! عقلمند اور غلی بنو۔ دنیا چمکدار آنکھوں کی خوبصورت عورتوں سے
بھری پڑی ہے میں آپ کے لئے داری شیم سے ایک جھنڈے آؤں گا جو
آپ کے محل کو موسم گرما کی رات میں ایک جگنو بنا دے گا۔“
غمر وہ بادشاہ غضبناک ہو گیا۔ اس نے خلیل کی داڑھی نوچی اور اسے
نکال دیا۔

غیب دان رحمان بولا، ”دُرُیا پار کے پہاڑوں میں ایک آدمی رہتا
ہے جسے دنیا ایک فقیر کہتی ہے لیکن اس کے دل میں کسی چیز کا ذخیرہ ہے
جو ہر بیماری کا علاج ہے کیونکہ اس نے وقت اور موت کو فتح کر لیا ہے،
میرے اچھے بادشاہ! جاؤ اور اسے تلاش کر لو اور اس سے وہ جادوئی پانی
مانگو اور اس کا ایک ایک قطرہ ملکہ کی آنکھوں میں ڈال دو۔ وہ پہلے سے بھی
ت زیادہ خوبصورت، روشن اور خوابناک ہو جائیں گی۔“
بادشاہ خوش ہوا اور اپنے جان نثاروں کے ساتھ اس فقیر کی تلاش
میں نکلی پڑا۔

بالآخر اس نے اسے پایا اور اس سے پوچھا ”تمہارے دل میں کیا ہے؟“
”محبت اور رہنمی“ فقیر نے ہنستے ہوئے کہا
”کیا تم مجھے ملکہ کے لئے ان کے دو قطرے دے سکتے ہو؟“
”ہاں بشرطیکہ تم ان کی قیمت ادا کرو۔“
”بتاؤ“ بادشاہ نے کہا۔

”ہنسی کے قطرہ کے لئے تمہاری سلطنت اور محبت کے قطرہ کے لئے
تمہارا کیر و ناز“ فقیر نے جواب دیا۔

”یہ بہت زیادہ ہے۔ سلطنت اور اس کا تزک و احتشام مجھے
اللہ تعالیٰ نے عطا کیا ہے۔ چونکہ تم اپنے بادشاہ سے اتنے ناہربان ہو لہذا
میں تمہیں اس خزانے کا نااہل سمجھتا ہوں اور اسے قانون اور لوگوں کے
نام پر ضبط کرتا ہوں“۔

بادشاہ نے فقیر کے بیڑیاں پہنائیں اور اسے اپنے ساتھ لاکر
جیل میں ڈال دیا۔

اگلی صبح جب جیل کا دروازہ کھولا گیا تو اللہ تعالیٰ کی حکمت
سے وہاں کچھ بھی نہ تھا سوائے چیتھڑوں، کھال اور بڈیوں کے ایک
ڈھیر کے۔ فقیر چلا گیا تھا اور محبت اور ہنسی بھی ساتھ لے گیا تھا۔
جیل کی دیوار پر اس نے ایک پیغام لکھ دیا تھا ”بادشاہ سلامت! جو کچھ
آپ کے قانون کے ماتحت ہے وہ میں اس قانون کے لئے چھوڑ کر جا رہا
ہوں“۔

بادشاہ یہ دیکھ کر سخت طیش میں آیا کیونکہ اس نے اس سے پہلے
کبھی شکست نہ کھائی تھی۔ وہ سب اپنے اہل دانش پر بھی مہم تھا اور
اس نے ان کی داڑھیاں بچھا دیں۔ وہ ملکہ سے بھی سخت خفا تھا کیونکہ
اس کی وجہ سے اسے شکست ہوئی تھی اور اس نے کہا ”لعنت بیچو اس کی
آنکھوں پر! پھر اس نے دانش مند خلیل کو بلایا اور اس کی معیت میں اپنے

عُمدہ گھوڑے، موسیقار، بانرا اور شکاری کتے لے کر وادی شمیم گیا جہاں وہ اس وادی کی بہت سی دل افروز فتوحات میں اپنی اس شکست واحد کو بھول گیا۔

لیکن بے چاری ملکہ.....

وہ قریباً اندھی ہے۔" ۱۰

مندرجہ بالا سرسری جائزے سے جو تصویر ابھرتی ہے وہ ایک جاندار پست و ادب کی ہے جو اپنی قدامت کے باوجود زوال پذیر نہیں ہوا۔ شاید اس لئے کہ فارسی ادب بلکہ اردو ادب کے بھی برعکس اس کا ارتقاء بالوقفہ ہوا ہے اور ہنوز تکمیل پذیر ہے۔ لہذا یہ کئی لحاظ سے پختوں کے کردار کا نمائندہ اور ان کے معاشرے کو مضطرب کرنے والے مسائل کا منظر ہے۔ پٹھانوں کا واحد اہم ثقافتی کارنامہ ادب کے میدان میں ہی ہے۔ اسلامی روایت کے مطابق تصویری فن قبائلیوں میں شاذ و نادر ہی پایا جاتا ہے اور پٹھانوں کا دستی ہنر صرف اسلحہ کی ساخت پر داخت پر ہی صرف ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عظیم بدھ گندھارا ثقافت کے آثار، جو سوات اور خیبر پختونخوا کے عظیم تاریخی و ثقافتی ورثے ہیں، ابھی تک ان کی حقیقت کو سمجھنے اور ان کی حقیقت کو بیان کرنے میں ناکام ہیں۔

۱۰۔ کہانی کا زیادہ مفصل چربہ افغان حکومت بگرام، باختر، مورخہ ۲۰۲۹، دسمبر ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ دیکھئے ڈاکٹر میٹھیٹر ایفا ص ص ۱۱-۱۲، محیط برائے قیاس کی کئی کہانیاں۔

کے بعض حصوں میں بکثرت پائے جاتے ہیں بہت سکون قبائلیوں کے ہاتھوں بہت بے دردی سے تباہ ہوئے ہیں۔ فن موسیقی بھی زیادہ ترقی یافتہ نہیں ہے اور عام آلات موسیقی ڈھول، بانسری اور سادہ قسموں کی ہیں لیکن نغمے سب پُر زور اور لہرائیگیز ہیں۔

خٹک ناپچ جو اپنے نام کے باوجود کئی قبائل میں مشترک ہے بہت مقبول ہے۔ ناپچ کی کئی قسمیں ہیں لیکن سب کی سب انتہائی عسکرانہ اور سب میں کثیر التعداد شرکاء ہوتے ہیں جو صرف مرد ہوتے ہیں۔ اگرچہ خٹک ناپچ اکثر و بیشتر پٹھان فوجیوں کا مظاہرہ یا تفریحی عمل ہوتا ہے پھر بھی یہ کبھی کبھار قبائلی دیہات میں بھی دیکھنے میں آتا ہے^۱ یوسفزئی اور آفریدی عموماً ناپچ سے نفرت کرتے ہیں اور اسے یہودہ اور نازیبا خیال کرتے ہیں۔

۳۔ قومیت

غالباً پٹھانوں کا سب سے زیادہ پریشان کن مسئلہ پٹھان قومیت کا ہے۔ کابل کی زیر سرپرستی چلنے والی تحریک، پختونستان، پچھلے دس سالوں میں اتنا زور پکڑ گئی ہے کہ اس کے وجود و عدم وجود کا مسئلہ

۱۔ اے۔ جیمز ٹیننٹ کی "ہارڈ مون"، لندن، چواینڈونڈس، ۱۹۵۲ء میں ایک خٹک

ناپچ کی دلائل ویز تصویر ہے، ص ۲۳۵ تا ۲۲۶

ایک علمی مسئلے سے کہیں زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ کابلی تحریک نے اس مسئلے کو مزید پیچیدہ بنا دیا ہے جو پہلے ہی سادہ نہ تھا۔
 پٹھانوں میں جو قومی جذبہ پایا جاتا ہے وہ اس رجحان کا نتیجہ نہیں ہے، جس نے بیسویں صدی میں پورے ایشیاء میں ہل چل مچا دی تھی۔
 یہ ایک مختلف اور قدیم تر چیز ہے اور کم از کم خوشحال خان خٹک سے شروع ہوتا ہے۔ پچھلے سالوں میں تحریک پنجتوستان کے افغان علمبرداروں نے بالخصوص محمد غوری اور میر ولس جیسی تاریخی شخصیات کو پٹھان قوم پرست کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ پیر روشن کو بھی ایک ابتدائی قوم پرست بتایا گیا ہے لیکن وہ بس سیوا جی سے زیادہ نہ تھا جو مغلوں کے خلاف لڑنے والا مرہٹہ ڈاکو تھا کیونکہ وہ اس کے دور میں امن وامان کی نمائندگی کرتے تھے۔ وہ ہندوستان کی تحریک آزادی کا بابا و آدم بنگیا جس کا آخری نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۴۷ء میں ایک آزاد ہندوستان میں کانگریس پارٹی نے حکومت سنبھال لی۔
 اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خوشحال خان خٹک میں واقعی قومی جذبات تھے گو یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ یہ جذبات اس وقت ظہور پذیر ہوئے جب مغلوں کے ساتھ اس کے ذاتی اختلافات نمودار ہوئے اور جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ان مالی فوائد سے محروم ہو گیا جو اسے ان سے ملتے رہے تھے۔ پھر بھی خوشحال خان پہلا انسان تھا جس نے

۱۔ تحریک پنجتوستان پر آگے باب دو انہ دم میں تبھو ہے۔

ایک بہم مربوط پٹھان قومیت کا اظہار کیا اور اس کی طویل زندگی کے آخری حصے میں اس کی ہر مغل چیز سے نفرت ایک فوری دشمن کے خلاف ایک قبائلی سردار کی رقابت سے آگے بڑھ گئی۔ خوشحال خان نے پٹھانوں کو مغلوں کے خلاف متحد کرنے کی جو کوششیں کیں اور اپنی تقدیر سازی کے سلسلے میں ان کی اہلیت پر جو اصرار کیا ایک ذاتی جنگ اقتدار میں اتحادی جیتنے سے کہیں زیادہ تھا۔

لیکن خوشحال خان کی کوششیں قبائل کے باہمی عدم اعتماد کی نذر ہو گئیں جس سے اورنگزیب نے نہایت ہوشیاری سے فائدہ اٹھایا۔ خوشحال خان کے وقت سے کافر برطانوی عیسائیوں نیز سکھوں کے خلاف نفرت اور قومی امنگوں کی بجائے قبائلی رسم و رواج میں بیرونی مداخلت کی مزاحمت حکومت کے خلاف پٹھان بغاوت کے محرکات رہے ہیں۔ اس احساس نے پٹھانوں کو نہ تو برطانوی ہند میں اور نہ ہی اب تک پاکستان میں ضم ہونے دیا، لیکن یہ انہیں ایک علیحدہ قوم بنانے میں بھی ممد و معاون نہیں ہوا حالانکہ بہت سی افریشیائی ملکوں کے مقابلے پر نسلی و ثقافتی لحاظ سے دس ملین ہم جنس افغان ایک زیادہ ٹھوس قومی اساس کے مالک ہیں۔

یہ واضح کرنا مشکل ہے کہ پٹھانوں میں قومیت کا ارتقاء زیادہ قطعی کیوں نہیں ہو سکا۔ اگر وہ واقعی ایک ملک بنا جا رہے تو اس کے سلسلے میں ان کے موجودہ علاقے کی سیاسی و اقتصادی غیر موزونیت حائل نہ

ہو سکتی تھی اور نہ ہی افغانستان یا پاکستان کے ساتھ ان کی تاریخی یا مذہبی بندھنیں رکاوٹ بن سکتی تھیں۔

اس میلان کا صرف اندازہ ہی لگایا جاسکتا ہے جو بیسویں صدی کی وسیع تر سیاسی روسے ہم آہنگ نہیں ہے۔ غالباً پٹھانوں میں فکری قومیت کی اہم ترین وجہ ان کی بین القبائلی حدود رقابت کی طویل تاریخ ہے جو ایک ایسے اندازہ حیات میں ڈھل گئی ہے کہ حصول اتحاد انتہائی مشکل ہو گیا ہے۔ مزید برآں امکانی طور پر غیر فوجی تحریک جو سترھویں صدی میں خوشحال خان کے گرد نمودیر ہو سکتی تھی اسے اورنگ زیب نے اعلیٰ پالیسی کے تقاضوں کے تحت شعوری اور موثر طور پر قریباً ختم کر دیا۔

اس پرسترا دیہ کہ پٹھان سرزمین اتنی الگ تھلگ ہے کہ اس کے باشندے ان وسیع تر قومی میلانات سے نسبتاً معزاً رہے جنہوں نے سوہویں اور سترہویں صدیوں میں دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا جواب بیسویں صدی میں پھر بل چل چکا ہے ہیں۔ مثبت طور پر یہ بھی حقیقت ہے کہ پٹھان قبائلی ڈھانچہ اتنا مضبوط رہا ہے کہ پٹھان من حیث الفرد اس کے اندر رہتے ہوئے اپنے مقاصد حاصل کر سکتا ہے اور کر رہا ہے۔ لہذا وہ اسے بدلنے کے محرک سے محروم ہے۔

اس طرح پٹھانوں کی حیثیت کئی لحاظ سے مغربی ایشیا کے دوسرے بڑے اور زندہ قبائلی معاشرے یعنی کردوں سے مشابہ ہے۔

دونوں کرد اور پٹھان جن کی سر زمینیں در سبیل تذکرہ) کہیں نہیں ملتی
عربوں کے بعض حصوں کے مقابلے پر د جو آزاد مملکتیں بنتے ہیں کامیاب
ہو چکے ہیں) بہت سے نقطہ ہائے نظر سے زیادہ تر قوم“ ہیں۔

چونکہ پٹھانوں میں قومیتی دھکیل کا فقدان ہے لہذا پاکستان
کی قومی زندگی میں ان کے بالآخر انجذاب کے روشن امکانات ہیں گو
اس کے لئے ایک لمبی مدت بھی درکار ہوگی اور ان میں قومی قیادت
کی قابلیت کا بھرپور اعتراف بھی۔ ان میں سے بہت سے نسلی تصورات
پر مبنی قومی نظریے سے اب بھی متاثر ہو جاتے ہیں بالخصوص جب
بیرونی ذرائع اسے مسلسل اور چال بازی سے پیش کریں۔ اس طرح پنجتستان
کا موجودہ افغان تصور خواہ کتنا بھی مصنوعی ہو یہ اس وقت تک
مکمل طور پر زائل نہیں ہو سکتا جب تک افغانستان ان تحریکات کو
مستقلاً دہر نہیں کرتا جو اس نے پچھلے دس سال میں پیش کی ہیں۔ ایسا
کرنے سے افغانستان کیوں گریز کرتا ہے۔ یہ مسئلہ آگے باب دوازدہم
میں زیر بحث لایا گیا ہے۔

انگریزوں کی آمد

تعارف :

انگریز سرحد پر بہت عرصے سے فعال تھے پشتون اس کے کہ برطانیہ نے رسمی طور پر ۱۸۴۹ء میں سکھوں سے یہاں کی حاکمیت حاصل کی چند جیسے ایلفنٹن اور برنز محض یہاں سے گزرنے والے تھے جن کا زیادہ تعلق سلطنت کے بڑے امور سے تھا۔ دوسرے جیسے ولیم مور کرافٹ جو ۱۸۴۲ء میں وزیر عدلتے میں نفوذ کر گیا اور چارلس مین جو اس پورے علاقے میں تیسرے اور چوتھے عشرے میں پھرتا رہا۔ پٹانوں میں بہت عرصہ رہے اور ان کی تاریخ اور اطوار کا مطالعہ کرتے رہے۔ پہلے پہل آنیوالوں میں سے کوئی بھی سکھ نظم و نسق سے متاثر نہیں ہوا۔ میسن رنجیت سنگھ کی فوج کی زیادتیوں کا شکوہ کرتا ہے اور سکھ رہنما کی حماقت کی طرف اشارہ کرتا ہے جب اس نے دو دفعہ پشاور کو فوجیں بھیجیں تاکہ وہ یار محمد خان سے پشاور کے حاکم درانی سرداروں میں سے تھا۔ ایک ہندو

گھوڑے کا تحفہ ایٹھ مسکین بٹ

برنہ ۱۸۲۷ء میں پشاور سے گزرا تو اس نے دیکھا کہ جنرل ایوی
ٹیل کی گورنری میں ”سکھوں نے ہر پتھر بدل دیا ہے“، سارا قرب و جوار
ایک وسیع کیمپ ہے اور ۲۰ تا ۴۰ ہزار آدمی میدانوں میں تعینات

۱۔ مین ایف، ۱، ص ۲۴ تا ۱۲۶۔ مین کا اصلی نام جیمز یوس تھا اور

وہ برٹش ایٹ انڈیا کمپنی کی فوج کا ایک بھگڑا تھا۔ اس نے اپنا سفر اگرہ سے

۱۸۲۷ء میں شروع کیا اور امریکی مہم جو جو سیارہ لان سے جابلو اور نجیت سنگھ

یا دوست محمد کا ملازم بننے کے لئے لاہور اور کابل جا رہا تھا۔ گرفتاری سے بچنے

کے لئے یوس نے اپنا نام مین رکھ لیا اور اپنے لئے ایک مصنوعی امریکی پس منظر

تراش لیا۔ یہ غلط تشخیص باری رہا اور اس کا سفر نامہ سر تقا مس ہولڈنگ کی کتاب

”دی گیس آف انڈیا“ (لندن، بیکن، ۱۹۱۰ء) میں ”امریکی ایکسپلوریشن“ کے

عنوان سے بیان کیا گیا۔ ہرلان نے بالآخر برطانوی حکام کو اس کی اصلیت کی

اطلاع دے دی اور مفروضہ قید سے صرف اس شرط پر بچا کہ وہ اس کے بدلے

میں جیتی کو افغانستان کی خفیہ معلومات بہم پہنچائے گا۔ وہ کئی سال تک یہ

کرتا رہا۔ لندن کی انڈیا آفس لائبریری میں مین کے دستاویزات کا ایک بڑا

مجموعہ ہے۔ کمپنی کے اجلاس کی حقیقہ کار روائیاں ہیں جن میں محفوظ ہیں جن میں

اسے بریت دی گئی تھی۔ مین کے دستاویزات انیسویں صدی کے نصف اول

کے دوران سرحد پر ایک گراں بہا ذریعہ معلومات ہیں۔

ہیں مسلمانوں کے رسم و رواج غائب ہو گئے ہیں ناپچ گانے
کی آوازیں ہر وقت سنائی دیتی ہیں اور پنجاب کی خوبصورت گریسیں
ہندی، کشمیری، فارسی اور افغانی گیتوں سے سپاہیوں کے دل بھاتی
رہتی ہیں،۔

سکھوں کا نظم و نسق (اگر اسے ایسا کہا جاسکتا ہے) افراتفری
کا نظم و نسق تھا۔ لاہور اور پشاور میں مال کے بھی کھاتوں میں من مانی
رقموں کا اندراج کر دیا جاتا تھا اور جب کچھ سپاہی فارغ ہوتے تو
انہیں لگان وصول کرنے کے لئے بھیجا جاتا تھا۔ سپاہی آتے تو گاؤں خالی
ہو جاتے اور منقولہ جائیداد مشمولہ بہ چوٹی کھڑکیاں اور دروازوں کے کواڑ
بھی چھکڑوں پر بہاڑوں میں منتقل کر دیئے جاتے جہاں سکھوں کو
پہنچنے کا یا رانہ تھا۔ اس کے جواب میں سکھ سپاہی دیہات کو موٹے اور
تباہ کرتے اور کھیتوں کو برباد کر دیتے۔ کبھی کبھار پٹھان مزاحمت کرتے
تھے۔ ایک نیم المیہ نیم طریقہ واقعہ اب بھی صوابی (مزان) کے ارد گرد
ایسے نایا جاتا ہے جیسے یہ چند سال کا واقعہ ہو۔ رنجیت سنگھ کے
تحت ایک سکھ فوج ایک ندی کے مشرقی کنارے پر نیمہ زن تھی اور
طغیان کی وجہ سے اسے عبور کرنے میں پس و پیش کر رہی تھی۔ پٹھانوں
نے مغربی کنارے پر کوئی بیس گائیں اکٹھی کیں جو سکھوں کے لئے مقدس
ہیں اور انہیں فوج کر کے غضبناک فوج کی آنکھوں کے سامنے کھاپی

گئے۔ جیسا کہ توقع تھی رنجیت سنگھ اس توہین پر حرکت میں آیا پہلی پیادہ کھینیاں جو پانی میں بھیجی گئیں ریٹے میں بہہ گئیں اور ڈوب گئیں اور پٹھان مزے لے لے کر اپنے کباب کھاتے رہے اور آوازے کتے رہے۔ ایک نخت منتخب سواروں کا ایک دستہ فرانسیسی جرنیل ایلارڈ کے تحت درختوں کے ایک جھنڈ کے عقب سے نمودار ہوا اور سیدھانندی میں کود پڑا۔ پیشتر اس کے کہ بو کھلائے ہوئے پٹھان اپنے اکل و شیربے سے فارغ ہوتے سوار ندی پار کر گئے اور ان پر ٹوٹ پڑے۔ وہ سب پٹھان نیزہ جو ایک دن کے تعاقب سے ان کے قابو آ سکے پکڑ لئے گئے اور نذر شمشیر ہوئے۔

سکھوں کی واحد بچپی سرحد میں صرف لگان تھی۔ جن علاقوں پر سکھ اپنی گرفت قائم کر سکے تھے وہاں خوانین پر ۱۰ ہزار روپے سالانہ ٹیکس لگایا گیا اور کاشتکاروں سے تین چوتھائی تک پیداوار ہٹور لی جاتی تھی۔ قطعات زمین بلاتمیز پنجاب کے ہندو ساہوکاروں کو دیئے گئے اور ان میں سے بعض کو یہاں تک اجازت دی گئی کہ وہ اپنا خراج روپے کی بجائے جزواً پٹھان سردوں کی صورت میں ادا کر سکتے تھے۔ اس

۱۔ جیمز ایفٹا، ص ۵۴، ایچ۔ سی۔ لسنڈن رپورٹ اؤن دی یورپین ڈسٹرکٹ (۱۸۵۲ء)

سیکشنر فریمڈی پبلک کارپنڈنس آف دی اینڈسٹرینٹن فار دی فیڈرل آف دی

پنجاب، ص ۳۶۸ -

مسلل جبر و ستم کی وجہ سے باہمت لوگوں نے اپنی زمینیں ہی ترک کر دیں
اور مستقل پہاڑیوں میں چلے گئے۔

یہ تھی وہ صورت حال جو اولین برطانوی ناظمین نے ۱۸۴۸ء اور
۱۸۴۸ء میں سرحد میں پائی۔ یہ لوگ برطانوی حکومت یا ایسٹ انڈیا
کمپنی کے براہ راست نمائندے نہ تھے۔ ان میں سے بعض لاہور و بارے
منسلک کے مل گئے تھے تاکہ سکھ سلطنت کو سہارا دیا جاسکے جو رنجیت سنگھ
کی موت کے بعد دوبارہ زوال تھی۔

وہ اپنے ناراضی آقاؤں کا طرز حکومت پسند نہ کرتے تھے لیکن وہ
مشرع میں تعمیل احکام پر رضا مند تھے۔ ہربرٹ ایڈورڈز نے ۱۸۴۸ء
میں بنوں پر محصول اندوزی کے لئے ایک سکھ چھاپے کا آنکھوں دیکھا
بیان کرتے ہیں۔ سکھ دیوان، دنیا ناتھ نے نوجوان برطانوی افسر کو بتایا
کہ بنوں کے ارد گرد کے پٹھانوں کے ”آزادی کے متعلق بالخصوص وختیانہ
خیالات کی وجہ سے کئی سال سے ایک رہائش پذیر سکھ گورنر کی برکات
سے یہاں کے لوگوں کے لئے مستفید ہونا ممکن نہ رہا تھا۔ نتیجتاً ۶۵ ہزار
روپے کا سالانہ مالیہ بیشتر لوگوں کے ذمہ بقایا تھا۔ ایڈورڈز کو سکھ
سپاہیوں کے ساتھ جانا تھا۔ زیادہ سے زیادہ روپیہ جمع کرنے میں ان کی
مدد کرتا تھا۔ ممکنہ حد تک پٹھانوں کو موت کے گھاٹ اتارتا تھا اور
اپنی نگرانی میں مالیہ سکھ خزانے میں جمع کرواتا تھا۔

ایڈورڈز حسب الحکم روانہ ہوا لیکن اس کے اندر سلطنت کی

چنگاری روشن تھی۔ اس نے پیش قدمی کرتے ہوئے پابھیوں کو ایل دیہات
کو تنگ کرنے کی اجازت نہیں دی، اور جب وہ بنوں میں داخل اور
گامزن ہوئے تو انہیں سخت ضبط میں رکھا۔ یہاں اس نے سفید ریشوں
کا جرگہ بلایا اور اپنا مقصد بیان کیا۔

”آپ لوگوں کا سالانہ مالیہ ۶۵ ہزار روپے ہے اور چونکہ آپ
لوگ اسے ادا نہیں کرتے لہذا سکھ آتے ہیں اور آپ کو پچاس گنا
نقصان پہنچاتے ہیں۔ وہ آپ کی فصلوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ گھر
جلا دیتے ہیں۔ ریوڑ اور کٹے لوٹ لیتے ہیں اور بیوی بچوں کو بطور غلام
بیچ دیتے ہیں۔ یہ خوبصورت وادی جو قدرت نے آپ کو عطا کی ہے
ایک عذاب میں بدل گئی ہے۔ کس لئے؟ آپ کہتے ہیں کہ آپ کی آزادی
کے لئے میں آپ کو وہ آزادی دیتا ہوں۔۔۔ صرف برضا و رغبت
اپنے کسی بھی پندیدہ خزانے میں۔ ہم ہزار روپے سالانہ جمع کراد وادر
کوئی فوج آپ کی وادی میں داخل نہ ہوگی اور کوئی سکھ آپ کی حدود
میں اپنا چہرہ نہ دکھائے گا اور آپ اپنے علاقے میں اپنے ہی قوانین
کے تحت زندگی بسر کرنے میں آزاد ہوں گے۔“

جرگے نے اس انقلابی پیش کش پر غور کیا اور اسے یہ کہہ کر
ٹھکرا دیا کہ وہ آزاد اور زیرِ عتاب رہنا پسند کرتے تھے۔ ایڈورڈز
نے جواباً سخت تنبیہ کی۔

”میں آپ کی وادی میں پھر ہوں اور اس کی زرخیزی کو مانا

ہوں۔ میں نے آپ کا خفیہ راستہ دیکھ لیا ہے میں نے آپ کے ہم قلعے گن لئے ہیں۔ میں نے آپ کے قبائل کا اندازہ لگایا لیا ہے۔ میں ایک نئے راستے ایک اور فوج لائوں گا۔ آپ کے قلعے مسمار کر دوں گا۔ آپ کے قبائل سے ہتھیار چھین لوں گا اور علاقے پر قبضہ کر لوں گا۔ آپ کو بہترین قوانین ملیں گے جو روشن ضمیر لوگ آپ کے لئے وضع کر سکتے ہیں لیکن ان قوانین کا نفاذ ایک سکھ گورنر کرے گا۔ وہ آپ پر ظلم نہ کر سکے گا کیونکہ انگریز اس کے اوپر ہوں گے۔ آپ پر منصفانہ حکومت ہوگی لیکن آپ آزادانہ رہ سکیں گے۔“

ایڈورڈز نے ۱۸۴۸ء میں اپنا وعدہ پورا کر دیا ۱۸۴۹ء میں سکھ گورنر غائب ہو گیا جب ۲۰ مارچ کو انگریزوں نے لاہور کے بڑے دربار میں حاکمیت اختیار کر لی اور پنجاب کی چند وندہ سکھ سلطنت کے دن پورے ہو گئے۔

جب ایڈورڈز بنوں میں سلطنت کا راستہ ہموار کر رہا تھا دوسرے بھی جیسے جیمز پشادیمی، لمسٹن بونفریو، می، بیرٹ ہزارہ میں اور ٹیلر ڈیرہ جات میں نئے شاہی قانون کے پیشرو بنے ہوئے تھے۔ انتقال حاکمیت کے بعد ہی لوگ نو ساختہ پنجاب کمشنر کی زیر ہدایت کام کرنے

۲۔ ہربرٹ لی ایڈورڈز ”اے میسر اؤن دی پنجاب فریڈیر“ دو جلدیں لندن

آر۔ بیٹلی، ۱۸۵۱ء ص ۲۷ تا ۲۸۔

لگے۔ ان کے سامنے جو مسائل تھے وہ بہت گہنیر تھے۔

سندھ پار علاقوں کی حدود بھی غیر واضح تھیں۔ مشرق میں سندھ
اہیں پنجاب سے علیحدہ کرتا تھا۔ شمال میں وہ غیر واضح طور پر ہمالیہ میں
ضم ہو جاتے تھے۔ مغرب میں کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ سکھ صوبہ کہاں
ختم ہوتا تھا، اور افغانستان کہاں شروع ہوتا تھا۔ سرحد جس کا انگریزوں
نے یقین کیا وہ عین اسی کے مطابق تھی جو آج کل زیر انتظام ضلعوں اور
قبائلی علاقوں کے درمیان موجود ہے۔ انگریزوں نے واضح کر دیا کہ وہ اس
خط سے پرے کوئی اختیار یا ذمہ داری نہ چاہتے تھے اور پہاڑی قبائل کو اختیار
تھا کہ وہ آزاد رہیں یا اگر چاہیں تو کابل کے اطاعت گزار بن جائیں۔

۱۔ ٹیبل نے اس وقت اسے یوں بیان کیا ”سرحد کی لکیر کاغان گھاٹ ہزارہ
کے ماتحت کی چوٹی سے شروع ہوتی ہے جو چلاس کے قریب ہے۔ ہمارا بڑا گلاب سنگھ
کے علاقہ کشمیر کے شمال مغرب کوٹے پر اور پھر ہزارہ کی شمال مغربی سرحد کے گرد
گھومتی ہے۔ مشرق کی طرف سندھ تا تربیلا، پھر دریا عبور کر کے یہ وادی پشتاور
کی شمالی اور شمال مغربی سرحد کے گرد دگھومتی ہے اور درہ خیبر تک جاتی ہے۔ پھر
آفریدی پہاڑیوں کے گرد سے کوہاٹ جاتی ہے پھر ضلع کوہاٹ کی مغربی سرحد کے گرد
میرانڑی وادی کے ساتھ ساتھ جاکر سلطنت کابل کی حدود کو چھوتی ہے پھر وزیر پہاڑیوں
کے گرد ہو کر بنوں اور کوہ سلیمان کے سر پر آتی ہے اور پھر آکر دامن سلیمان سے سندھ
اور حکومت قلات کی حدود تک چلی جاتی ہے“ دیکھئے ٹیبل، ایضاً ص ۱

۲۔ ایضاً ص ۵۷ -

سرحد پر قبائل سے تعلقات !

انگریزوں کا اولین اور فوری ترین مسئلہ اپنے نئے مقبوضات کے تحت تحفظ کا تھا۔ پہاڑی قبائل حسب معمول ۱۸۴۹ء میں کمسا رہے تھے۔ ان کی بے چینی میں ان کثیر التعداد پٹھانوں کی وجہ سے اضافہ ہو گیا تھا جو سکھ جوہر سے بچنے کے لئے میدانوں سے پیارڈن میں پناہ گزیں ہوئے تھے۔ انگریز چند سالوں سے سکھوں کے اتحاد کی راہ تھے اور دس سال سے بھی کم عرصہ پہلے انہوں نے سکھوں کے ساتھ بل کرا میر افغانستان سے جنگ کی تھی جس سے اکثر پٹھان قدرے اپنا بت محسوس کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ سرحد کے نئے آقاؤں سے نفرت خود سکھوں کے مقابلے پر کچھ ہی کم تھی۔ مزید برآں میدانوں میں تیلی حکومت کو بھٹو کے اہل کوہ ہمیشہ ٹوٹ مار کا ایک نادر موقع سمجھتے تھے۔ ان کے سمد شوق کو کابل نے بھی کسی حد تک تازیا نہ لگا دیا جو اپنے کھوئے ہوئے علاقے واپس لینے کی امید رکھتا تھا۔ جنہیں فتح کرنے والی سکھ سلطنت اب ملیا میٹ ہو چکی تھی۔

بلد۔ افغان واقعی حملہ آور ہوئے اور بنوں اور پشاور پر چند روزہ قبضہ کر لیا جب انگریز اور سکھ ۱۸۴۹ء کے شروع میں پنجاب میں لہجے ہوئے تھے لیکن گجرات میں سکھوں پر انگریز فتح کی جوش سے ہی وہ رنڈ پکیر ہو گئے۔

کوہ سیاہ کے حسن زنی نئی حکومت سے فوراً ہی ٹکرائے جب
انگریزوں نے پہلے ان پریکس لگانے اور پھر پنجاب سے ان کی رعایتی
تجارت نمک روکنے کی کوشش کی۔ سید احمد کے پیروؤں نے قبائل
کی اشتعال انگیزی میں اضافہ کر دیا تاکہ وہ ”نئے کفار“ کے خلاف
بغاوت کر دیں اور بالائی سندھ کے مختلف مقامات پر انگریزوں
کے قائم کردہ ناکوں پر وقتاً فوقتاً چھاپے مارنے شروع کر دیے۔
۱۸۵۴ء میں ان لوگوں کی مفسدانہ کارروائیاں ٹھگوں کے ایک گروہ
کی آمد کی وجہ سے اور بھی بڑھ گئیں جو پشاور کے قریب سڑکوں پر
کام کرتے ہوئے برطانوی حراست سے بھاگ آئے تھے۔
سوات کا ہمعصر بادشاہ برطانوی علاقے کے قبائل کو اپنی اطاعت
کی دعوت دے رہا تھا اور میدانِ پشاوَر میں چھاپہ مار پارٹیاں بھیج
رہا تھا۔ بہت سے مہمند جو برطانوی علاقے کے اندر رہتے تھے خان
لاہور کے توسط سے امیر کابل سے کم از کم رسمی وفاداری کا دم
بھرتے تھے۔ وہ کم لیٹرے قبائل پر چھاپے مارتے تھے اور تعاقب
کیا جاتا تو افغان شہریت کا سہارا لے لیتے۔ ورہ خیبر کے آفریدی جو
بقول ٹیل ”دغا باز قبائل میں سے دغا باز ترین“ تھے خیبر پر اپنی حاکمیت
پر مصرعے اور اسے اپنی مرضی سے بند کر دیتے تھے۔

وادی کرم کے بالائی سرے کے نوری میدان بنول پر موسمی چھاچھ
 مارتے تھے اور وادی کا یہ سرانہو زامیر کابل کے ایک بیٹے کی جاگیر کا
 تھا۔ کابل خیل وزیر اور محسود اپنا دیرینہ جھگڑا قائم رکھے
 رہتے تھے اور ارد گرد کے علاقے میں امن و خوشحالی کو محسوس کرتے
 رہتے تھے۔ ٹوچی وادی کے دور برطانوی حکام سے ربط و ضبط سے
 منکر تھے اور قبضہ تھے کہ وہ امیر کابل کی رعایا ہیں۔ نئے علاقے کے
 انتہائی جنوبی سرے پر بلوچی قبائل جن میں سے بہت سے سال کا کچھ
 حصہ برطانوی علاقے میں گزارتے تھے۔ نئی حکومت کے اختیار کو تسلیم
 کرنے سے گریزاں تھے۔ گومل جو اس وقت قریباً اتنا ہی اہم راستہ
 تھا جتنا خیبر، اکثر بند کر دیا جاتا تھا۔ انگریزوں نے نظم و نسق کا مشد
 قوت اور دہ بھنی سے حل کیا۔ اکثر سکھ دستے لاہور چلے گئے تھے تاکہ
 انگریزوں کے خلاف لڑائی میں شریک ہو سکیں جو ۱۸۶۹ء کے اوائل
 میں شروع ہو گئی تھی اور بالآخر اسحاق پنجاب پر منتج ہوئی، جو
 رہ گئے تھے انگریزوں نے قبضہ کرتے ہی انہیں واپس بلا لیا۔ اسحاق
 کے بعد تھوڑے عرصہ تک پشاوڑ کو ہاٹ اور ہزارہ کے اضلاع لاہور
 میں ہنری لارنس کی زیر سرکردگی پنجاب کے لئے قائم شدہ بورڈ آف

۱۸۵۵ء کے اینگلو افغان معاہدے کے مذاکرات میں انگریز مان گئے تھے کہ امیر
 دوروں کو لے سکتا تھا اگر وہ چاہے تو۔

ایڈمنسٹریشن کے براہ راست انتظام میں رکھے گئے لیکن ایک سال کے اندر اندر سیرتینوں ملازمین ایک کمشنر کے تحت باقاعدہ ڈوئیرن بنادیکے گئے مگر حتیٰ کہ ۱۸۶۱ء میں ایک علیحدہ کمشنر کے تحت ڈوئیرن جات ڈوئیرن بنادیکے گئے۔ ۱۸۵۳ء میں پنجاب بورڈ ختم کر دیا گیا اور جان لارنس پنجاب کا چیف کمشنر بنا۔ مؤسس انگریز جلد ہی نئی مہمیں کے حصے بن گئے۔ نیلر ڈیرہ اسماعیل خان کا ڈپٹی کمشنر بنا۔ ایڈورڈز نے پشاور میں خدمات انجام دیں، اور پھر پہلے کمشنر، میکسین کا جانشین بنا جب اسے ۱۸۵۳ء میں ایک قبائلی تے قتل کر دیا۔ ایریٹ ہزارہ کا پہلا ڈپٹی کمشنر ہوا۔ بہترین اور تجربہ کار ترین ناظمین جو ہندوستان کے دیگر حصوں سے فارغ کئے جا سکتے تھے اور بہت سے فوجی افسر جو اپنی اپنی رجمنٹوں سے سول فرائض کے لئے منتقل کئے گئے سرحد بھیج دیئے گئے۔ لاہور نے اختیار روے دیا کہ رواں قبائلی وظائف جاری رکھے جا سکتے تھے اور حسب ضرورت نئے وظائف جاری کئے جا سکتے تھے۔ ایک خاص فوجی تنظیم جلدی جلدی قائم کی گئی جو ان دنوں کے لحاظ سے کافی ہمیت آفریں تھی۔ اس میں وہ فوجیں شامل تھیں جو انگریزوں نے سکھ سلطنت کو سہارا دینے کے لئے بمقام کی تھیں۔ اسے پہلے پنجاب بے قاعدہ فوج کا نام دیا گیا جسے جلد ہی پنجاب فرنٹیئر فورس سے بدل دیا گیا۔ برطانوی ہندوستان کے عسکری دستاویزات میں ان دونوں کے اراکین کو "یفر" کہا جاتا ہے۔ فرنٹیئر فورس مندرجہ ذیل پر

مستمل تھی۔ پانچ پیادہ رجمنٹیں، ہکے بٹھلے فیلڈ توپخانے کی تین بیٹریاں
دو گریٹر ٹن توپخانے کی بیٹریاں، سفر منیا کی دو کمپنیاں، سندھ شتر کورہ،
پانچ سوار رجمنٹیں اور مشہور و معروف کوراف گاؤڈز در منتخب گھوڑا
سوار، قریباً سب کے سب سپاہی ہندوستانی تھے اور ان ابتدائی ایام
میں بھی بہت سے پٹھان تھے۔

اس فوج کو فوراً ہی تکلیف دہ قبائل پر قابو پانے کی کوشش
میں استعمال کیا گیا۔ اسحاق کے بعد ایک سال سے بھی کم عرصے اندر تین
ہزار سے زائد آدمیوں کی ایک مہم درہ کوہاٹ کے آفریدیوں کے خلاف
بھیجی گئی تاکہ انہیں پشاور اور کوہاٹ کے درمیان سفر اور تجارت میں
مُتعلک ہونے کی سزا دی جاسکے۔ اگلے چھ سالوں میں مزید سولہ مہمات روانہ
کی گئیں۔ ان کے اہداف تھے آفریدی، یوسفزئی، میرانزئی، مہمند، آغاخیل
وزیر، شیرانی، تورئی اور سید احمد کے بیرونی۔ ان میں سے کوئی بھی فوجی
نقل و حرکت کامیاب قرار نہیں دی سکتی۔

سرمد کے محافظوں نے جلد ہی محسوس کر لیا جیسا کہ مغل اور گزنی
نے تین صدیاں پہلے کیا تھا کہ صرف فوجی طاقت ہی قابو کا مؤثر ذریعہ
نہ تھی۔ سپاہی زیر انتظام قلعوں کو تو بچا سکتے تھے لیکن جیب وہ

۱۔ دی امپیریل گزٹیر آف انڈیا، ۲۴، جنوری ۱۹۰۸ء، کلیرنڈن پریس،

۱۹۰۸ء (نومبر ۲۰۸ تا ۲۱۰)

پھاڑیوں میں داخل ہو جاتے تھے تو چھپ کر اور ایک سخت حملہ کرنے والے زیادہ نقصان دہ ہوتے تھے۔ رسد پر اخراجات بے انتہا اور قبائلی گرفت میں نہ آتے تھے۔ اکثر و بیشتر کئی ہزار کا دستہ صرف ایک خالی قلعہ یا گاؤں کو تباہ کر سکتا تھا۔ انگریزوں نے بہت تھوڑے وقت میں ہی قابو پانے کے لئے ایک چالنامہ تیار کر لیا۔ درہ کو ہاٹ کے آفریدیوں کی مثال موجود ہے۔ الحاق کے بعد ایک ماہ کے اندر ہی آدم خیل سے جو درے کے اہم حصہ کے اندر اور ارد گرد رہتے تھے ۵،۷ روپے سالانہ وظیفہ کا وعدہ کیا گیا تاکہ وہ درے سے گزرنے والے مسافروں کی حفاظت کریں یعنی ان پر حملہ نہ کریں۔ لیکن ابھی پہلے سال کی ادائیگی بہت دور تھی کہ آدم خیل نے درہ بند کر دیا اور کھلم کھلا بغاوت پر اُتر آئے۔ ہندوستان میں برطانوی افواج کا پہلے سال ۱۸۵۷ء میں سرحد میں آیا تاکہ آدم خیل کے خلاف مہم کی قیادت کر سکے، ۲۲۰۰ سپاہیوں نے درے کو عارضی طور پر کھول دیا۔ جو انہی وہ واپس ہوئے آفریدیوں نے کاروانوں پر حملے دوبارہ شروع کر دیئے۔

اس دفعہ ایک اور کرنٹی ٹملک کو جس کا طائفہ قریب ہی رہتا تھا درے کو محفوظ کرنے کے لئے ۸ ہزار روپے سالانہ کا وظیفہ دیا گیا نتیجتاً آدم خیل اور اور کرنٹی کے درمیان چپقلش شروع ہو گئی اور آفریدی اس میں اتنے لکھے کہ اس درے کی آمد و رفت میں کوئی مداخلت نہ کر سکے، جسے وہ اپنی آماجگاہ سمجھتے تھے، لیکن یہ کشمکش اس حد تک بڑھی کہ پورے

علاقے میں ہی ہر قسم کی نقل و حرکت متقل کرنا پڑی۔ اب اس مرحلے پر درے کی حفاظت کے لئے تیسرا وظیفہ نبکش کو دیا گیا۔ اس سے بین القبائلی کشمکش میں جو توسیع ہوئی اور جنگ و جدل دسے سے کافی دور ہو گئی۔ بالآخر آدم خیل نے یکم دسمبر ۱۸۵۱ء کو صلح کر لی۔ پندرہ دفات کے اس معاہدہ میں انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ ٹوٹی ہوئی یا ٹوٹی جانوالی اشیاء کو واپس کر دیں گے یا ان کی قیمت ادا کریں گے۔ برطانوی علاقے کے تمام مجرم مفروروں کو اپنے علاقے سے نکال دیں گے۔ برطانوی علاقے میں قتل کے مرتکب قبائلی کو حوالے کر دیں گے۔ قبیلے کا کوئی فرد برطانوی علاقہ میں جرم کا ارتکاب نہ کرے گا۔ مسافروں کی حفاظت کے لئے درے میں قائم کردہ چوکیوں کا انتظام سنبھالیں گے اور برطانوی علاقے میں رہنے کے لئے یرغمال دیں گے۔ اس کے بدلے انہیں ۵ ہزار روپے سالانہ وظیفہ ملے گا۔^۲

۱- ٹیلر، ایضاً، ص ۲۰

۲- معاہدے کا متن جو اس قبیل کا پہلا تھا حکومت ہند کے ”سنٹرل ایٹ“ پورٹ^۱ ۵ تا ۶ پر موجود ہے۔ بین القبائلی کشمکش جو انگریزوں نے ۱۸۵۰ء میں مولیٰ ایک برٹے جرگے کے ذریعے ۱۸۶۵ء میں تصفیہ پذیر ہو سکی جس نے تمام مقتولین و مجرمین کے معاوضہ کا فیصلہ کیا اور مزید طے کیا کہ ہر فریق درے کی سڑک کے ساتھ اپنی پکٹیں بنائے گا بشرطیکہ ہر پکٹ ”سڑک اور دیگر پکٹوں سے بندوٹ ماحول سے پرے ہوگا۔ اس معاہدے کا متن پی۔ ایل۔ این۔ کا وگٹری کی ”ریپورٹ آن دی (باقی ماحولہ اگلے صفحہ پر)

یہ قابلِ ذکر ہے کہ انگریز اب تک قبائل کو قابو کرنے کے لئے
مغلوں کے نقش قدم پر چل رہے تھے یعنی (۱) وظائف (۲) ایک قبیلے
کی دوسرے کے خلاف براہِ گنہگار اور (۳) آئندہ اچھے رویے کی یقین دہانی
کے طور پر برصغیر میں تینوں طریقے مغلوں، ہی کے تھے۔ لیکن تھوڑے عرصہ
بعد درہ کوہاٹ کے آفریدیوں کے منتظم کرنل کوک نامی نے قابو پانے کے
چالنامہ میں ایک اور تصور پیش کیا۔ اس نے غنیمت کی صورت میں
مندرجہ ذیل طریقہ وضع کیا:

درہ کوہاٹ کو فوراً بند کر دینا، اضلاع پشاور کوہاٹ میں موجود تمام
آفریدیوں کو پکڑ لینا۔ مردوں کو جیل میں ڈال دینا، ان کے موشی پچ
ڈالنا، آفریدیوں کے تمام درہ الاؤنس بند کر دینا اور جب معلوم
کا تصفیہ ہو جائے تو ان کے نقصانات کا ازالہ کر دینا۔ ان کے ضبط شدہ
الاؤنسوں میں سے نہیں بلکہ ان الاؤنسوں میں سے جو تصفیہ کے بعد
شروع ہوں گے۔

کرنل کوک کا وضع کردہ قبائل کی اجتماعی ذمہ داری کا یہ اصول

(بیۃ حاشیہ)

کوہاٹ پاس آفریدی، میں مل سکتا ہے۔ سلیکشن فرام دی ریکارڈز آف
دی گورنمنٹ آف دی پنجاب اینڈ اٹس ڈی پینڈنسیز دنیا سلسلہ ۱۸۸۳ء ص ۲۵
رپورٹ ۱۸۶۷ء میں لکھی گئی تھی۔

۱۔ گورنمنٹ آف انڈیا، سنٹرل ایشیا رپورٹ I ص ۶

۱۹۴۷ء تک برطانوی قبائلی پالیسی کا بنیادی اصول بنا رہا۔ یہ سیدھا سادا اور قابلِ تعریف تک علی تھا۔ مختلف پٹان قبیلے بلا استثنا ایک اکائی کی حیثیت سے سوچتے اور محسوس کرتے تھے گو اس کے افراد کبھی بکھار من مانی کر لیتے تھے۔ اگر پورا گروہ اپنے بعض افراد کے افعال کا ذمہ دار بنا دیا جائے تو یہ ایسے افعال پر قابو پانے کی طرف زیادہ مائل ہو گا اور بصورتِ دیگر اس کے خلاف جوابی کارروائی آسان ہوگی چونکہ اکثر پہاڑی قبائل اپنی ضروریات زندگی کے لئے زیر انتظام علاقے پر منحصر تھے اور اس کے بہت سے افراد کسی دیئے ہوئے وقت پر وہیں ہوتے تھے لہذا پکڑا دھکڑا اور ناکہ بندی کے طریقے واقعی بہت مؤثر تھے۔

ایڈورڈز اکتوبر ۱۸۵۳ء میں پشاور ڈویژن کا کمشنر بنا تو اس نے جلد ہی ناکہ بندی کے طریقے کو انتہائی مؤثر بنا دیا۔ اس نے ارا بیب^۱ اور مہترب، پٹان فجروں کو برطرف کر دیا جنہیں اس کے پیشرو نے رکھا۔ ہوا تھا اور وہ پہاڑی ملوک سے براہ راست معاملات کرنے لگا جب کوئی قبیلہ نئی حکومت کے تصورِ برحق و انصاف کو لکارتا تھا تو ایڈورڈز پورے گروہ کو پشاور منڈی سے بند کر دیتا تھا اور یوں پوری برادری

۱۔ پشاور وادی کے ارباب خاندان مثل دور کے ہیں جو قبائل کے ساتھ تعلقات

میں دلال ہوتے تھے ان میں سے اکثر وادی کے متمول اور تعلیم یافتہ زمین دار ہیں بڑے بڑے ارا بیب پشاور کے قریبی دیہات لاندی اور نکال بال سے تعلق رکھتے ہیں۔

کو جرم میں شرکت یا اس کے انسداد اور سزا کے سلسلے میں تغافل کا
 خمیازہ جھگٹنا پڑتا تھا۔ کسی قبیلے کو پشاور منڈی سے روکنے کا مطلب
 یہ تھا کہ اسے اپنی ضروریات زیادہ فاصلے سے درآمد کرنا پڑتی تھیں یا اپنے
 ہمسایوں سے حاصل کرنا ہوتی تھیں جو اس خدمت کا بھاری جرمانہ وصول کرتے تھے۔
 ۱۸۵۳ء کے آخر میں کچھ کوکی خیل آفریدیوں نے خیبر میں ایک ایچی
 کو روک لیا۔ جو کابل میں انگریزوں کے ایک مقامی نمائندہ کے لئے رکنین کی ایک
 برتن لئے جا رہا تھا۔ ایڈورڈز نے فوراً حکم دیا کہ برطانوی علاقے میں موجود
 ہر کوکی خیل کو قید کر دیا جائے۔ عمل کو تیز کرنے کے لئے اس نے ہر پکڑے جانے
 والے قبائلی کے لئے ۲۰ روپے اور ملک کے لئے پچاس روپے انعام مقرر کیا۔
 دیگر قبائل کے لوگوں پر اس کا اتنا اچھا اثر ہوا کہ اعلان کی شام سے پہلے
 ۲۰۰ روپے کے کوکی خیل پشاور جیل میں پہنچ چکے تھے۔ اگلے شام کوکی خیل
 معتبرین آئے اور کونین واپس کر گئے۔ ایڈورڈز نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے محدود
 بجٹ کو مد نظر رکھتے ہوئے ان سے ۲۰۰ روپے وصول کر لئے اور پھر قیدی چھوڑ دیے۔

۱۔ ہر برٹن ایڈورڈز ڈیوٹی ریز آف دی بلائف اینڈ لیٹرز آف میجر جنرل سٹر ہر برٹن
 ایڈورڈز کو تقریباً سڈنی ایڈورڈز لندن لکھی پال ٹرنپن ۱۸۸۶ء - دو جلدیں

۱۔ ص ۲۳۰

۲۔ میرا ایک قبائلی دماغ اور کونین جو انگریزوں نے متعارف کرائی بلوہی
 لوٹ مار کے لئے اتنی مقبول ہو گئی جیسے رائفل اور کار توں۔

۲۔ ایضاً، ۱ ص ۲۲۲ تا ۲۲۳

ناکہ بندی کا طریقہ بعد میں زیادہ پیچیدہ اور غیر شخصی نیز برطانوی نوکر شاہی بڑھنے کی وجہ سے کم مؤثر ہو گیا لیکن ایڈورڈ نے اپنے دور میں اس کا ماہر تھا۔ وہ قبائلیوں کی عزت کرتا تھا اور قبائلی اس کی عزت کرتے تھے۔ شاید اس عزت کی جزوی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ کبھی کبھار مقامی رسم و رواج کی خاطر انصاف کے اپنے تصور کو خیر باد کہہ دیتا تھا۔ بے حد سرکش زکاخیل آفریدیوں کے ساتھ ۲۴ اگست ۱۸۵۷ء کا معاہدہ اس کی زندہ مثال ہے۔ دستاویز کی دفعہ پانچ یہ تھی ”برطانوی علاقے کے کسی باشندے کی بیوی یا بیٹی کو اغواء کرنے کے جرم میں قبیلے کے کسی فرد پر ہرجانہ عائد نہ ہوگا لیکن اگر وہ منقولہ اشیاء بھی لے گیا ہو تو وہ واپس کی جائیں گی۔ اگر طرفین اشیاء گیری سے انکار کریں تو انہیں قرآن مجید پر قسم اٹھانا ہوگی“ یہ

سپاہیوں کی بغاوت

ایڈورڈ نے زکاخیل کو اتنی رعایت دینے پر کیسے رضامندی دے دی؟ اس کا سراغ دستاویز کی تاریخ سے مل سکتا ہے۔ اس معاہدے پر ۱۸۵۷ء کی عظیم بغاوت سپاہ کے دوران دستخط کئے گئے تھے جب دلی ابھی تک باغیوں کے قبضہ میں تھا۔

۱۔ اصلی انڈیا آفس لائبریری میں ہے۔

۱۸۵۷ء کے موسم بہار میں آلیسٹا انڈیا کمپنی کی فوج کی پینچپوس اور
چھوٹے ٹھہریں بنگال نیٹوانفنٹری بھی قلیل القعد پنجاب قریئر فورس
کے علاوہ سرحد میں آگئی تھیں۔ مئی میں میرٹھ میں بغاوت کی پشاوریں
پہلی اطلاع ملتے ہی برطانوی افسروں نے بیابہوں کی ٹاک کو سنسرتنا
شروع کر دیا تھا۔ انہیں پتہ چلا کہ بہت سے سپاہی سوارتہ رساتہ
میں سید احمد کے پیرووں سے خط و کتابت کر رہے تھے جو اپنی جگہ بنگال
پر نڈیڈنسی کے باغیوں سے اپنا رابطہ قائم رکھے ہوئے تھے۔

کو رآف گائیڈز کو فوراً ہی جنوب کی طرف روانہ کیا گیا تاکہ
باقی ماندہ برطانوی افواج سے مل سکے۔ بنگال نیٹوانفنٹری کو قبائلی
علاقے کے سرے پر بھیج دیا گیا گویا کہ اس طرف سے حملہ متوقع تھا۔
ایڈورڈز اور نکلسن رجو بعد میں تیغزدہلی میں مارا گیا) دونوں نے
پٹھانوں سے نئے نیوی بھرتی کرنے کی کوشش کی تاکہ جنوب کو بھیجے گئے
سپاہیوں کی جگہ لے سکیں۔ قبائلی بھرتی پر رضا مند نہ تھے اور حکومت
کلکتہ مزید مقامی فوجی بھرتی کرنے پر خوفزدہ تھی لہذا یہ کوشش ترک
کر دی گئی۔

تناؤ کے چند ہفتوں کے بعد نوشہرہ اور مردان کے متعینہ دستے
باغی ہو گئے لیکن ان کا رویہ ہندوستان کے دوسرے حصوں کے مقابلے
پر مودبانہ تھا۔ انہوں نے صرف احکام ماننے سے انکار کیا تھا۔ نوشہرہ
گیریشن کو آمادہ کر کے پشاور لایا گیا اور وہاں بلا تشدد ان سے ہتھیار

لے لئے گئے۔ مردان گیرین (۵۵ ویں بی۔ این۔ آئی) سے ان کے
کرنل کی مرضی کے خلاف ہتھیار لے لئے گئے۔ اس پر وہ بھاگ گئے اور
برطانوی کرنل نے مایوس ہو کر اپنے سر میں گولی مار لی۔ چند ہفتے بعد دو
مفرد سپاہی ضلع ہزارہ میں پکڑے گئے اور ۱۲ جون کو انہیں ایک بڑے
مجمع کے سامنے توپ زد کر دیا گیا جسے بلایا ہی اس لئے گیا تھا کہ وہ
بغاوت کا حشر دیکھ سکے۔ ۵۵ ویں نیٹو انفنٹری کا بڑا حصہ قریباً
۶۰۰ آدمی سوات میں جا گئے تھے۔ انگریزوں نے مقامی قبائل کے
ذریعے انہیں وہاں سے نکلوا دیا۔ میدانوں کی طرف واپسی کا امکان
نہ تھا لہذا وہ پہاڑوں کے ساتھ ساتھ مجبوراً کشمیر کو چل پڑے کہ
شاید مہاراجہ پناہ دے دے۔

انہوں نے سندھ پار کیا اور مشرق کی طرف چلتے رہے لیکن قبائل
انہیں مسلسل تنگ کرتے رہے۔ جولائی کے شروع میں وہ وادی کاغان
میں پہنچ گئے اور دشمار گزار علاتے اور دشمن قبائلیوں کی وجہ سے
ان کی تعداد بھی ۲۰۰ سے کم رہ گئی۔ اس کے بعد انہوں نے انگریزوں کے
سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ لگے ہفتوں میں وہ سب کے سب موت کے
گھاٹ اتار دیئے گئے جن میں سے ہزارہ کے طولہم و عرض میں نہایت احتیاط
سے برپا کردہ تقریبات میں توپ زد کئے گئے۔ ان میں سے بعض کی قبریں
ایسٹ آباد میں آج بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے دوران
سرحد میں ہونے والے کشت و خون کا یہی خلاصہ تھا۔

تاہم ۱۸۵۷ء کا موسم گرما سرحد میں برطانوی حکومت کے لئے ایک نازک وقت تھا۔ اگر پہلے چند دنوں کے بعد سپاہیوں سے خطرہ نسبتاً کم بھی تھا تو بھی انگریز طاقتور دشمنوں کے نرغے میں تھے جن میں سے کوئی بھی چاہتا تو ان پر کامیاب چوٹ مار سکتا تھا۔ اس میں ذرا سا بھی شک نہیں کہ سرحدی قبائلی سید احمد کے پیرو اور افغان متحدہ اقوام سے انگریزوں کو نہ ہر پار دھکیل سکتے تھے۔ ایسی صورت میں پنجاب بھی بغاوت پر آمرا آتا۔ اسی کے پیش نظر پنجاب کے چیف کمشنر، سر جان لارنس نے جو تھوڑا سا ہرگز نہ تھا، ابتداءً بحون میں مشورہ دیا تھا کہ انگریز سرحد بشمول ڈیرہ جات خالی کر دیں، امیر کابل دوست محمد کو دعوت دیں کہ وہ اپنے سابقہ علاقوں پر قبضہ کر لے اور اس کی وفاداری کے بدلے بغاوت کے بعد بھی اسے ان پر قابض رہنے دیں۔

اس مشورے کی سیوگ جیمز نے پرنسز اور مخالفت کی جو سرحد میں پہلکاروں میں سے تھا اور اب جان لارنس کا سیکرٹری تھا۔ ایڈورڈز اور نکلسن نے بھی پشاور سے اس پر اعتراضات کئے۔ لارنس نے یہ معاملہ فیصلہ کے لئے کلکتہ بھیجنے سے اتفاق کیا، اگست کو گورنر جنرل لارڈ کیننگ سے ایک تار موصول ہوئی کہ آخر دم تک پشاور میں جے رہو،

۱۔ سابقہ پیروں میں واقعات کا سلسلہ کئی ذرائع سے اخذ کیا گیا ہے جن میں سے اہم ترین ایڈورڈز "میموریلز" I ص ۳۶۰ تا ۴۷۵ اور II تا ۲۵ ہے۔

اور پہی ہوا، ۲۰ ستمبر کو مہلی پر دوبارہ قبضہ کیا گیا اور مغل شہزادے
جہنیں غلط طور پر بغاوت کے ذمہ دار سمجھا گیا، میجر ہوڈسن نے بہت
بے دردی سے مار دیئے، جو پرانا سرحدی کارکن اور کانٹرز کا سابقہ کمانڈر تھا۔
آفریدی اور ان کے ساتھی قبائل پہاڑیوں میں رہے اور مسلسل ہجرت
کرتے رہے لیکن کوئی کارروائی نہیں کی۔ سید احمد کے پیروؤں نے دل
چھوڑ دیا جب انہیں پیغام ملا کہ ان کے بعض ساتھی ہندوستان میں
شکست کھا گئے تھے، اور انہوں نے اپنی سرگرمیوں کو اپنے پہاڑی قلعہ
سے گاہے گاہے چھاپے مارنے تک ہی محدود رکھا۔ دوست مخفی بوجہ
۱۸۵۵ء کے اینگلو افغان معاہدہ پشاور کے عین مطابق انگریزوں سے
دوستی کے وعدوں کا پاس کیا، ایسا کر کے اس نے غالباً کھوٹے ہوئے
صوبوں کی بازیابی کے لئے افغانستان کا آخری موقع بھی کھو دیا۔

یہ - ڈبلیو۔ ایس۔ آر ہوڈسن "اے سو بجز لائف ان انڈیا" لندن جے پابکر
۱۸۵۹ء ہوڈسن کی کتاب حق اور بہد بریت کی آمیزش کی ایک جیتی جاگتی
تصویر ہے جس سے انگریزوں اور ہندوستانیوں نے ودان بغاوت کام لیا۔
ہوڈسن کی کتاب ۱۸۴۶ء تا ۱۸۵۴ء میں سرحد میں اس کی ملازمت کا
بمیں حال بتاتی ہے۔ وہ وہاں کام کرنے والے روشن خیال افسروں میں سے نہیں
تھا اور اس کے خطوط میں کوئی عظمت و رفعت نہیں ہے۔

بغاوت کے دوران سرحد پر اپنی گرفت پر قرار رکھنے میں انگریزوں کی کامیابی ہم عصر برطانوی افسر اور بعد کے مورخین متفقہ طور پر اس وقت کے صبر و استقامت سے منسوب کرتے ہیں جس نے مقامی لوگوں کو خوفزدہ کر دیا اور وہ برطانوی راج کی سخت جانی سے مرعوب ہو گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ ایڈورڈز اور اس کے رفقاء نے بہت ہمت و مہارت سے کام لیا اور ایک نازک دور میں امن قائم رکھنے میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے لیکن غالباً فیصلہ کن امر یہ تھا کہ پنجاب و فادار رہا۔ اگر وہاں کے جنگجو سکھ اور مسلمان اٹھ کھڑے ہوتے تو بغاوت یقیناً سرحد میں بھی پھیل جاتی۔

مزید برآں صوبہ بنگال میں سپاہیوں کی بغاوت میں برائے نام ہی پٹانوں کی کوئی ذاتی دلچسپی تھی اور ان میں بعض اگر اس کے متعلق کچھ سوچتے بھی تھے تو وہ اسے غیر ملکیتوں کے دو گروہوں کے درمیان ہی ایک جنگ سمجھتے تھے یعنی انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان۔ اس وقت کے پٹانوں کو بھاری بھر کم نوکشا ہی اور برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے کبھی کبھی کے جابرانہ اقدامات کا تجربہ نہ ہونے کے برابر تھا اور وہ اپنے آپ کو ہندوستان کا حصہ نہ سمجھتے تھے۔ وہاں جو بھی نفرت تھی وہ بعد میں ظہور پذیر ہوئی جب نئی حکومت ہند کے بعض برطانوی افسروں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے خاتمے کے بعد بغاوت کا نیا الزام (اور سزا بھی) غلط طور پر ہندوستان کے مسلمان عناصر کے سر تھوپا

دیا۔

بغاوت کے خاتمہ اور تاجِ برطانیہ کو انتقال حکومت ہند سے سرحد میں کوئی خاص تبدیلیاں نہیں ہوئیں۔ اس کی ہمیت ہمیشہ سے نقصان کی بجائے عسکری رہی تھی اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے سرحد پار سرزمین کو کوئی توجہ نہ دی تھی۔ لیکن اس تبدیلی اقتدار نے پہٹانوں کی زمینوں کو کرنے والے برطانوی افسروں کی نگاہوں میں برطانوی راج کے دوام کا نقش جما دیا۔ کم از کم کچھ عرصے کے لئے اس علاقے میں تحفظ کو کوئی بڑا خطرہ نہ رہا اور یوں انگریز اور پہٹان دونوں دیگر مسائل کی طرف اپنی توجہات مبذول کر کے۔

بندوبست اراضی ہر

ان میں سے اہم ترین مسئلہ اراضیاتی نظام کے قیام کی ضرورت تھی۔ پہٹانوں کو ایسے نظام کی اشد ضرورت تھی تاکہ ان کے روایتی ڈھانچے میں کوئی ترتیب بحال ہو سکے جو پہلے ہی بے انتہا تقسیم در تقسیم کی وجہ سے کافی کمزور ہو چکا تھا۔ پیشتر اس کے کہ سکھ شاہی نے اس کو چکنا چور کر دیا۔ انگریزوں کو ایک نظام مطلوب تھا جو لگان بھی دے اور ان کی پہٹان رعایا کی شورش انگریزی کو بھی کم کرے۔ برطانوی ارباب

۱۔ دیکھئے باب سوم گزشتہ

دروہست یہ بھی چاہتے تھے کہ وہ اپنے زیر انتظام علاقے میں زرعی حالات بہتر کر کے پشاور اور ڈیرہ جات ڈویژنوں کے آئین پذیر پٹھانوں اور پہاڑیوں میں اس کے آئین گزیر بھائیوں کے درمیان بندھنوں کو کم کر سکیں۔

ہندوستان اراضی کا عمل برصغیر میں برطانیہ کا ایک بہتر کارنامہ تھا۔ بنگال میں پہلا ہندوہست ۱۷۸۶ء میں لارڈ کارنوالس کے دور میں کیا گیا تھا۔ جب تک انگریزوں نے سکھوں سے سرحد کا قبضہ لیا وہ ہندوستان کے زمینی نظام کو ایک نئی وضع دینے میں کافی تجربہ حاصل کر چکے تھے۔ لیکن سرحد کے حالات بنگال کے حالات سے مختلف تھے قبائلی زمینوں کی ابتدائی مساویانہ تقسیم کا ڈھانچہ قائم رہا لیکن بہت سے آقاؤں نے بعد میں مختلف تقسیمات کر دیں۔ جو کسی وقت کی مخصوص سیاسی صورتحال کے مطابق کبھی نافذ ہوئیں اور کبھی نہ ہو سکیں۔

بہت سی حالتوں میں ایک ہی قطعہ زمین کے بارے میں کم از کم تین مختلف قسم کے دعوے موجود تھے یعنی پٹھان دفتر، منغل جاگیر اور سکھ عطیہ۔

سکھ دربار کے تحت ملازمت کرنے والے برطانوی افسروں نے اسحاق سے پہلے ہی زمینی نظام کو معقول بنانے کی کچھ کوششیں کیں

ایڈورڈز نے ۱۸۴۸ء میں بنوں میدان کے سرے پر رہنے والے بعض وزیر قبیلوں کے اس طرح دل جیت لئے تھے کہ اس نے میدان کے سرے پر واقع بعض زمینوں پر ان کے حقوق تسلیم کر لئے تھے۔ اسحاق کے

بندوبست جاری رہا اور پنجاب کمیشن مالیات کی کمی کے باوجود
بے اپنی اولین ترجیحات میں رکھتا تھا۔

نوائین یا جاگیرداروں کی بجائے پتھلی سطح کے قارئین سے براہ راست
رابطہ پیدا کرنے کی غلصانہ کوشش کی گئی۔ ہر گاؤں کا سربراہ گاؤں کے مالیہ
کے لئے حکومت کے سامنے ذمہ دار قرار دیا گیا اور گاؤں میں مختلف
قطععات زمین پر مالکانہ حقوق سربراہ اور اہل دیہہ کے درمیان باہمی
اتفاق کے بعد درج کیے گئے۔ یہ اصل میں تحصیلداری نظام کا آغاز
تھا جو آج تک جاری ہے۔ دیرینہ تنازعات کے فیصلے اکثر و بیشتر
نوجوان برطانوی بندوبست افسروں نے اپنی ہی مرضی سے کر دیئے
جن کی مقامی رسم و رواج سے ناواقفیت کی وجہ سے بعض اوقات
نا انصافیاں بھی ہوئیں۔

یہ دیکھ کر لندن ایفٹا ص ۲۶۹ تا ۲۸۱ برائے ابتدائی بندوبست۔ نیز
ہیوگ۔ آر۔ جیمز "دیفینٹ جیمز سمری ٹیلنٹ آف شہت نگران ڈسٹرکٹ
آف پشاور" (۱۸۵۱ء) سلیکشن فرام دی پبلک کارس پانڈنس آف دی
ایڈمنسٹریشن فار دی افیمز آف دی پنجاب ۱۸۵۷ء جلد اول جیمز انعام (قبائلی
شعبات میں حصہ) پر انفرادی حقوق نہیں مانے اور بعد ہاکم ایک آدمی کا
دفتر (زمینی حقوق) گاؤں یا کھیتوں میں صرف اس کے بخرہ (مقرر کردہ حصہ)
تک محدود تھا (دیکھئے باب سوم گزشتہ) اس طرح شاعلاتہ یا آخر کسی قبائلی رہنما
(اکثر خان) کے نام پر رکھی گئی جس نے اس کا مالیہ ادا کرنے کی ذمہ داری پورے ملکیت مالک

بندوبست کا عمل کئی سال تک جاری رہا۔ اس کے مکمل ہونے پر سرحد کو ایک علی اور معقول حد تک منصفانہ نظام ملکیت و مالیت مل گیا۔ محصولاتی ڈھانچے میں دلالوں کی تعداد کم سے کم کر دی گئی اور چھوٹے چھوٹے آزاد زمینداروں کی کافی بڑی تعداد کو اپنی زمین پر واضح اور محفوظ حقوق مل گئے۔ مالیہ مخصوص ادوار کے لئے مقرر کیا گیا اور ان غلطیوں سے احتراز کیا گیا جو نصف صدی پہلے بنگال میں کی گئی تھیں جہاں دوامی شرح مقرر کر دی گئی تھی جس کے نتیجہ میں مرور زمان کے ساتھ فصلوں اور سکوں کی بڑھتی گھٹتی قیمتوں سے غفٹار برپا ہوا۔ اس سے پشاور اور ڈیرہ جات ڈوئین میں جو زرعی خوشحال آئی تو یہ ڈوئین چند سالوں کے لئے اشیائے خوردنی کے برآمدی علاقے بن گئے اور ۱۸۶۴ء تا ۱۸۶۶ء کے دوران دو سو تا ڈھائی سو کستیاں گندم، جوار، باجرہ، دالیں، تیل کے بیج، کپاس اور اون کا بلا جلا سامان لے کر ضلع بنوں کی دریائی بندرگاہوں (زیادہ تر کالا باغ) سے سندھ اور زیریں پنجاب پہنچاتی رہیں۔

ارتقا پذیر نظم و نسق

چھٹے عشرے میں سندھ میں نظم و نسق کا جو ڈھانچہ قائم

ایچ۔ پی۔ آر مسٹن "نوش آون دی بنوں ڈسٹرکٹ، سلیکشنز فرام دی ریکارڈز آف (باقی ماحیہ اگلے صفحہ پر)

کیا گیا وہ اگلے تیس سال میں کچھ زیادہ نہیں بدلا لیکن نوکر شاہی بڑھ گئی اور ناظمین کا وہ معیار قائم نہ رہ سکا۔ جیسے جیسے حکومت کا تانا بانا، جو پولیس، رفاہی امور، آبپاشی اور بے شمار دیگر معاملات میں ظاہر ہوتا تھا، بتدریج زیر انتظام اضلاع پر پھیلتا گیا۔

برطانوی ہند کی قانونی عدالتیں بمعہ اپنے بے شمار ہندو و نیم تربیت یافتہ وکلاء (جو بات بات پر مقدمہ بازی کی حوصلہ افزائی کرتے تھے) صوبے میں قائم کر دی گئیں اور جلد ہی پٹھانوں کے ذاتی مناقشات کے تسلسل کا ذریعہ بن گئیں۔ اس کے چند سال بعد فرنیئر کرائز ریگولیشنز یعنی ایف سی آر کا پہلا سیٹ ۱۸۷۲ء میں نافذ کیا گیا تو پٹھانوں نے قدرے سکھ کا سانس لیا۔ ایف سی۔ آر جیسا کہ وہ اب بھی مشہور ہے جہوری ہرگز نہ تھا لیکن اس نے سرحد کے لئے ایک علیحدہ مجموعہ قوانین ضرور نافذ کیا جو کم از کم جزوی طور پر مقامی رواج پر مبنی تھا۔ ایف سی آر نے ڈپٹی کمشنروں کے منتخبہ سرکاری جرگہوں کے ذریعے مقدمہ کی سماعت کا انتظام کیا۔ شہادت کے عام قواعد و ضوابط اسقاط

(بقیہ حاشیہ)

دی گورنمنٹ آف دی پنجاب اینڈ ایسٹرن ریجنل مینسٹریس (سبرنری) ۱۸۶۶ء ص ۳
یہ واضح نہیں ہے کہ سرحدی اضلاع کب اور کیوں غذائی طور پر فاضل علاقوں سے خسارہ کے علاقے بنے گو آبادی میں اضافہ کا اس پر بلاشبک و شبہ کچھ اثر ضرور ہوا۔ بہر حال انیسویں صدی کے آخر تک یہ تبدیل واضح طور پر پیدا ہو چکی تھی۔

کر دیئے گئے اور خارجی قانونی و کلام کی ضرورت بہت کم ہو گئی۔
 پہاڑی قبائل ضلعوں میں ان نئی تبدیلیوں کو انتہائی شک و شبہ
 سے دیکھتے رہے اور ان سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے۔ وظائف، ناکرہی
 اور تخریب زدگی کے باوجود وہ جیسے ویسے ہی سرکش رہے اور مشکل ہی
 کوئی سال گزرا ہوگا جب پہاڑیوں میں کوئی ہم نہ بھیجی گئی ہو۔ یہ
 مہمات بقول سرولیم ہارٹن "شاید سرحد کا لائق ترین اور بیدار مقرر
 ترین ناظم" "جلاد اور تباہ کر" کی پالیسی پر عمل کرتی تھیں۔ چونکہ
 فوج قبائلیوں سے دوید و لڑائی تو ساز و نادر ہی کر سکتی تھی لہذا وہ
 کھیت جلا دیتی تھی، گھرتباہ کر دیتی تھی، پھیلدار و رخت کاٹ
 ڈالتی تھی اور بعض حالتوں میں تو زمین پر ننگ بھرے، ہل چلا دیتی
 تھی۔ یہ چالیں اس لئے چلی جاتی تھیں کہ جارج قبیلہ کو برطانوی قواؤں
 ضوابط کی خلاف ورزی کا مزہ چکھا دیا جائے اور اس طرح اسے
 آئندہ قانون شکنی سے باز رکھا جائے۔ قبائلی نگاہوں میں یہ مہمات
 اکثر و بیشتر محض انگریزوں کے خلاف بدل کا وزن بڑھا دیتی تھیں۔

انیسویں صدی کے ربیع سوم میں قبائل پر قابو پانے کا روز افزوں
 مسئلہ انگلستان اور ہندوستان میں بہت سی علما نے بحث کا موضوع
 بنایا۔ یہ جیسے جیسے دوسری جنگ افغان ۱۸۴۱ء تا ۱۸۴۲ء

۱۸۴۹ء اور ۱۸۵۸ء کے درمیان ۴۰ مہمات بھیجی گئیں۔

کے قریب بہت زور پکڑ گئی جب سامراجی روس جنوب اور مشرق کی طرف اتنا بڑھا یا کہ سلطنت زار کی بیرونی چوکیاں برطانوی ہندوستانی سرحد سے صرف پیدل فاصلے پر پہنچ گئیں۔ اس وقت دو اہم مکاتیب فکر منظر تاریخ پر آئے جن میں سے ہر ایک کم از کم چالیس سال سے ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔

کلوز بارڈر سسٹم (بند سرحد کا نظام)

ان میں سے زیادہ قدامت پسند نظام بند سرحد کا تھا، بنیادی طور پر اس کے مطابق برطانوی ہندوستانی حکومت کو کسی ایسے علاقے کی ذمہ داری قبول نہ کرنی چاہیے جس پر اپنی سلطنت کے جزو و لا ینفک کی طرح نظم و نسق قائم کرنے کی اہل یا رضامند نہ تھی۔ اس مسئلے پر بھی مختلف اوقات میں آراء بدلتی رہیں کہ برطانوی ہند کی شمال مغربی سرحد کہاں شمار کی جائے۔ وائسرائے لارڈ لارنس ۱۸۶۲ء تا ۱۸۶۸ء اس پر آمادہ تھا کہ دریائے سندھ پہ واپس آجائیں جو ایک قدرتی جغرافیائی اور ثقافتی حد تھا لیکن اکثر افسران اس سرحد کو مانتے تھے جو انہیں سکھوں سے ورثے میں ملی تھی یعنی پشاوڑ اور کوہاٹ کمشنریوں کی مغربی سرحد جس کی حیثیت مناسب بین الاقوامی سرحد کی تھی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ علاقہ ۱۸۶۹ء سے مسلسل درخواہ ہمیشہ کامیابی سے نہ سہی زیر انتظام رہا تھا۔

لیکن جیسا کہ ہر ایک جانتا تھا کہ مسئلہ خط سرحدی کھینچنے سے کہیں زیادہ اس کے ماروا علاقے پر مرکوز تھا کیونکہ پہاڑیوں کے خونخوار اور طاقتور قبائل کو نظر انداز کرنا صاف طور پر ناممکن تھا۔ یہ مسئلہ کلونیار ڈگری کے حامیوں کے نزدیک بنیادی طور پر ڈیپلومیٹک یا سیاسی تھا اور اس طرح یہ زیر انتظام ضلعوں کے انتظامی مسئلہ سے کافی حد تک علیحدہ تھا۔ ان کے خیال میں سرحدی قبائل پر سیاسی قابو زیر انتظام ضلعوں کے اندر سے رکھا جاسکتا تھا اور اس کا ذریعہ وظائف، ناکہ بندی، قبائلی معاملات میں گاہے گاہے مداخلت اور بوقت ضرورت انتقامی مہمات کی پالیسی ہو سکتی تھی۔ اس کا مقصد دو گونہ تھا یعنی زیر انتظام ضلعوں کو تحفظ مہیا کرنا اور کسی غیر مقامی طاقت کو سرحد پار علاقے سے دور رکھنا جو فوری و قریبی طور پر تو امیر قابل تھا لیکن انتہائی اہم طور پر زاہر روس یہ پالیسی جیسا کہ پہلے ذکر ہوا ۱۸۴۹ء میں ایڈورڈ زنے شروع کی تھی۔

فارورڈ پالیسی (پیش قدمی کی پالیسی)

فارورڈ پالیسی اس بات کی حافی تھی کہ بین الاقوامی سرحد کو مغرب اور شمالی طرف جہاں تک جغرافیائی طور پر ممکن ہو بڑھا دیا جائے اور پھر تعلیم اور زور مسلحہ سے اس کو وسیع یا فتنہ علاقے میں موجودہ حالات کو تبدیل کر دیا جائے اور اس پورے علاقے پر مکمل حاکمیت سے کام لیا جائے

ظاہر ہے کہ یہ اسلوب نوویا بدیر ہندوستان اور روس کو وسط ایشیا میں روئے و لے آتا۔ اس پر مختلف آراء تھیں کہ یہ آئنا سا منا کہا ہو، کچھ کے خیال میں ہندوستان کی سرحدیں پر تھی جبکہ دوسرے ہرات اور ہندوکش پر مطمئن تھے۔ دوسری جنگِ افغان کے دوران اور بلعد میں کابل سے بذریعہ غزنی قندھار تک "سائنسی سرحد" کی تجویز بہت مقبول ہوئی (انگریز ان تینوں شہروں پر ۸۰-۱۸۷۹ء میں واقعی قابض تھے)۔

یہ بات کہ بعض حالات میں قبائلی علاقوں میں نظم و نسق کو کھیلانا ممکن تھا۔ کرنل رابرٹ سنڈمین نے بلوچستان میں ثابت کر دیا۔ سنڈمین سسٹم فار ورڈ پالیسی کا ہی ایک مشفقانہ نسخہ تھا اور یہ اس لحاظ سے اپنی مثال آپ تھا کہ اس کا بنیادی مقصد قبائل کی فلاح و بہبود تھا۔ سنڈمین کا نظریہ یہ تھا کہ علم اور ہمدردی کی بدولت ان کی سرزمینوں میں "پرامن نفوذ" کیا جائے۔ اس کے عقب میں یہ مفروضہ کارفرما تھا کہ اگر انہیں اقتصادی بہتری کا موقع دیا جائے تو قلاش اہل کوہ اپنی قرآنی عادت کو چھوڑ دیں گے اور پرامن مہذبانہ اطوار اپنائیں گے۔ ایسی بہتری کا فوری ذریعہ قبائلیوں کو لیونز اور سڑکوں کی تعمیر وغیرہ کی صورت میں روزگار مہیا کرنا تھا۔

x- یہ موجب دلچسپی ہے کہ ۵۰ سال سے بھی زیادہ عرصے کے بعد شریف النفس مہاتما گاندھی نے بھی یہی سوچا کہ ہندوستان کی اصل سرحد ہندوکش تھی۔

سٹیم بوجھتیاں میں بہت کامیاب رہا اور قریباً شروع سے ہی نظم و نسق برطانوی علاقہ مفاد کی آخری حدود تک پھیلا دیا گیا۔ لیکن بلوچ سرحدی قبائل پٹھانوں کی نسبت کم سرکش تھے۔ ان کی قبائلی ثقافت اتنی ترقی یافتہ نہ تھی اور انہوں نے ماضی قریب میں ہی امیران سندھ اور خان ملات کے بدعنوان اور مطلق العنان دور کا مزہ چکھ لیا تھا جس کے مقابلے پر برطانوی حکومت ہلکی پھلکی اور مہربان تھی۔ مزید برآں وہ تعداد میں پٹھانوں سے بہت کم تھے۔

فارورڈ پالیسی عشرہ آخری میں

بالآخر ۱۸۹۰ء میں انگریزوں نے اپنا اڑھ کلوز بازو سے پرے جمادیا۔ نہایت موزوں طور پر سٹیمین نے راستہ دکھایا۔ ثرو ب (بلوچستان) سے وہ گول کے اوپر چڑھا، یہاں پکٹ قائم کی اور کلیدی مقامات پر لیویز کی چوکیاں قائم کیں۔ خضر زئی شیرانہوں نے توسیع کی مخالفت کی تو انہیں ایک ٹیم کے ذریعے مغلوب کر لیا گیا، اور انہیں اپنے علاقے میں یوہنہ جوبکوں کے قیام سے اتفاق پر مجبور کر دیا گیا۔

۱۸۹۱ء میں اورکزیوں کے خلاف ایک باقاعدہ انتقامی مہم بھیجی گئی اور اس کے فوراً بعد اعلان کر دیا گیا کہ کوہ سلیمان کی ایک اونچی گھاٹی یعنی سامانہ چوٹی جو وادی میرانزئی اور جنوبی تیراہ پر غالب نگران تھی واقعتاً برطانوی سرحد تھی اور پھر اس کے ساتھ ساتھ پکٹس

بھی تعمیر کر دی گئیں۔ اگلے سال پچیس واڈی کرم تک بڑھا دی گئیں اور
شیعہ توریوں کی رضا مندی سے جو اپنے سنی ہمسایوں کے امکانی جہاد سے
بیم مرگ میں مبتلا تھے۔ واڈی کو ایک انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کے زیر انتظام
کر دیا گیا۔

۱۸۹۳ء میں میر عبدالرحمان والی سکابل نے بادل ناخستا اپنی مشرقی
سرحد کی حد بندی پر اتفاق کر لیا جس خط سرحدی پر امیر اور سربراہ ٹیڈیونڈ
کا فیصلہ ہوا اس کی حد بندی ۹۵-۱۸۹۴ء میں کی گئی اور وہ آج
بھی بین الاقوامی سرحد ہے۔ حد بندی کے دوران محسودوں نے ہانا

۱۔ ڈیورنڈ لائن جیسا کہ یہ مشہور ہوئی اس وقت سے افغانستان اور برطانوی ہند بعد
پاکستان کے درمیان ایک وجہ نزاع بنی رہا ہے۔ امیر عبدالرحمان نے بار بار انگریزوں
پر زور دیا کہ وہ ہاڈی قبائل کو اپنی سرحدوں میں شامل نہ کریں۔ اس نے دائرائے
لارڈ لینڈن ڈاؤن کو مشہور پیراگراف میں لکھا: اگر آپ انہیں میری حکومت سے
نکالتے ہیں تو وہ نہ آپ کے کام آئیں گے نہ میرے۔ ہم ان کے خلاف ہمیشہ لڑائے
یا سکھ اور نقتہ میں ابھی ہیں گے اور وہ ہمیشہ لوٹ مار کرتے رہیں گے جب
تک آپ کی حکومت مضبوط اور با امن ہے آپ انہیں بزمور تھالور رکھ سکیں گے
لیکن جوہی کوئی بیرونی دشمن ہندوستانی سرحدات پر غور دار ہو گا یہ سرحدی قبائل آپ
کے بدترین دشمن ثابت ہوں گے۔ ان سرحدی قبائل کو مجھ سے کاٹ کر جو میری قومیت
اور مذہب کے رگ ہیں آپ میرا وقار میری رعایا کی آنکھوں میں گرا دیں گے اور مجھے کمزور کر دیں گے
(باقی ماحیہ اگلے صفحہ پر)

میں برٹش باؤنڈری کمیشن کا یہ کمپ حملہ کر کے جلا ڈالا جس کے بعد وہاں
ایک مضبوط گیرین تعینات کر دی گئی۔ تھوڑے عرصہ بعد وادی ٹوچی
پر بھی قبضہ کر لیا گیا جہاں کے دوروں نے کوئی اعتراض نہ کیا کیونکہ وہ
بھی تو ریوں کی طرح انگریزوں کی موجودگی کو اپنے ہمسایوں کے خلاف
باعثِ رحمت سمجھتے تھے۔

انتہائی شمال میں ایک انگریز پولیٹیکل ایجنٹ ۱۸۷۶ء سے گلگت
میں عارضی ریڈیڈنٹ تھا۔ پامیر کے نیچے چترال اور گلگت پر مرکز ہونے
والا وسیع علاقہ تکنیکی طور پر ہمارا جہ کشمیر کی حاکمیت کے ماتحت تھا۔
ہمارا راجہ نے اپنی جگہ ۱۸۶۶ء میں برطانوی حاکمیت قبول کر لی تھی جب
کشمیر کو پنجاب کی سکھ سلطنت سے علیحدہ کیا گیا تھا۔ نویں عشرے تک
انگریز عام طور پر ہمارا راجہ کے توسط سے شمالی علاقے پر کم سے کم اثر ڈالتے
تھے، لیکن ۱۸۸۹ء میں ایک علیحدہ گلگت ایجنسی قائم کی گئی اور انگریزوں
نے ہتر چترال امان الملک کی موت پر پیدا ہونے والے خلفشار سے
فائدہ اٹھاتے ہوئے چلٹ اور ہنزہ میں ۱۸۹۲ء میں اپنے گیرین تعینات
کر دیے۔ ۱۸۹۵ء میں ایک سڑک درہ مالکنڈ کے راستے بنائی گئی اور
درے، دریا تھے سوات کی جائے عبور اور خود چترال میں چوکیاں قائم
کر دی گئیں۔

(بقیہ حاشیہ)

اور میری کمزوری آپ کی حکومت کے لئے مضر رسال ہے عبدالرحمان ڈی لائف آف عبدالرحمان
امیر آف افغانستان مرتبہ میرمنشی سلطان محمد خان 'دو جلدیں' (دہلی - بے مرنے .. ۱۹۷۱ء) ص ۵۸

۱۰ ستمبر ۱۸۹۵ء کو روس کے ساتھ پامیر باؤنڈری ایگمنٹ کے تحت پامیر کے علاقے میں روسی افغان سرحد کا تعین ہوا اور یوں افغانستان کی بین الاقوامی سرحدوں کا کام مکمل ہوا۔ پامیر باؤنڈری مشرق میں ڈیوڈ لائن کے شمالی ترین نقطہ پر ختم ہوتی تھی۔ ان دونوں کا درمیانی علاقہ جو کہیں کہیں صرف نصف درجن میل ہی چوڑا تھا افغانستان کی وادان پٹی پر مشتمل تھا اور امید کی گئی کہ یہ برطانیہ اور روس کے مقبوضات کو واضح طور پر اور ہمیشہ کے لئے علیحدہ رکھ سکے گا۔

ڈیوڈ لائن کی نشان بندی نے کلوز بارڈر اور فارورڈ پالیسی کے درمیان تنازعہ کو اور زیادہ شدید کر دیا۔ برطانوی ہند کی اب دو واضح سرحدات تھیں جن سے اس کا تعلق تھا۔ ایک تو کلوز بارڈر یا بند سرحد جو ۱۸۴۹ء میں ملی اور جو پشاور اور ڈیرہ جات ڈویژنوں کے مغربی کناروں کے ساتھ ساتھ چلتی تھی اور دوسری افغانستان کی مشرقی سرحد جو پہاڑیوں کی بلندیوں کے ساتھ ساتھ اور پہلی سرحد سے ۶۰ تا ۷۰ میل کے فاصلے پر مزید مغرب میں اس کے متوازی چلتی تھی داتھائے شمال میں انتظامی سرحد مشرق کی طرف مڑتی تھی اور ۲۰ میل کا قبائلی علاقہ ان دونوں خطوط سرحدی کو جبا کرتا تھا یہ دونوں خطوط جنوباً شمالاً کوئی ۲۵ میل اکٹھے چلتے تھے۔ ان کے درمیان قریباً ۲۵ ہزار مربع میل کا ٹکڑا تھا جس میں پہاڑی قبائل آباد تھے، اور جہاں برطانوی تانوں نہ چلتا تھا۔ لیکن برطانوی نفوذ کی

انگلیاں، گول، ٹوچی، کرم، خیبر اور مالا کنڈ سے اوپر پھرتا میں صاف واضح تھیں۔

ان انگلیوں پر جنوبی وزیرستان، شمالی وزیرستان، کرم اور مالا کنڈ نیز خیبر ایجنسیاں (جو ۱۸۸۱ء میں قائم ہوئی تھیں) مرکوز تھیں۔ اگرچہ شمالاً انہیں ایک نقشے پر ظاہر کیا جائے تو پانچوں برطانوی انگلیاں ایک ہاتھ کا تصور دیتی ہیں جن کی بہت سی اوپر کی طرف ہوا اور مالا کنڈ اس کا انگوٹھا ہو۔ بہت سے ماہرین حربیات نے واقعی اسے سرحدیں برطانوی طاقت کا ”مضبوط دست راست“ قرار دیا تھا جو ایک مکمل بن کر ہندوستان کی طرف روسی پیش قدمی کو توڑ پھوڑ سکتا تھا۔

مشکل یہ تھی کہ انگلیاں اگر ایک لمحے کے لئے بھی غافل ہو جائیں یا ڈھیلی بیڑ جائیں تو ان کی درمیانی گھاٹیوں میں رہنے والے دشمن قبائل انہیں برسی طرح زخم خوردہ کر دیں گے۔ فارورڈ پالیسی کے علمبردار جو عسکر کے ابتدائی حصہ میں پیشرفت کی وجہ سے ہوا کے گھوڑوں پر سوار تھے زور دیتے تھے کہ ڈیوڈنڈا لن ٹک کے پورے علاقہ میں امن و امان اور نظم و نسق پھیلایا جائے خواہ پورا امن نفوذ کے ذریعے خواہ وحشیانہ طاقت کے ذریعے جس نے پہلے بھی پیش علیہ قائم کیا تھا۔

کلون بارڈر کے حامی جواہر قدرے مدافعت پر آگئے تھے۔ یہ دلیل دیتے تھے کہ روس کے ساتھ ۱۸۹۵ء کے معاہدے نے افغانستان کی قطعی

حد بندی کر کے اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک بفر سٹیٹ بنادیا تھا اور اس طرح روس کے ساتھ تصادم کے امکانات کو بہت حد تک کم کر دیا تھا۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ قبائلی علاقے پر قبضہ کا مطلب یہ تھا کہ خزانے پر بوجھ بہت بڑھ جائے گا اور اس میں پہلے سے پیوست پانچ انگلیوں کا خرچہ برداشت کرنے پر ہی زور دیتے تھے۔

آخر الذکر حقیقت ۹۸-۱۸۹۷ء کی مہیب قبائلی بغاوت نے نمایاں کر دی جب بقول سرویم بارٹن "سرحد ٹوچی سے مالا کنڈ تک شعلہ بار ہو گئی" ۱۸۹۷ء کی بغاوت کا تفصیل ذکر بعد میں آئے گا۔ یہاں یہ کہہ دینا کافی ہے کہ اس بغاوت میں ۴۰ ہزار باقاعدہ سپاہیوں کو میدان جنگ میں کودنا پڑا تاکہ وہ "مضبوط دست راست" کو محفوظ رکھ سکیں جو ایسے حالات میں روسی پیش قدمی پر کوئی مانع ضرب نہ لگا سکتا تھا۔

نیا نظام !

۹۸-۱۹۷ء کے خونی تعطل کے بعد فوراً ہی ایک نئے نظام کے فو و فال واضح ہونے لگے، اعلان کیا گیا کہ آئندہ برطانوی سرحدی پالیسی تین نکات پر مبنی ہوگی (۱) افواج کا ارتکاز (۲) قبائل میں غیر ضروری مداخلت سے

۱- بارٹن ایف، ص ۶۷

۲- دیکھئے باب نہم

گزنہ اور (س) اسلحہ کی ناجائز تجارت پر قابو نہ

یہ نکات کسی حد تک دونوں مکاتب فکر کا امتزاج تھے۔ قبائلی علاقے میں پہلے سے بیوسٹ انگلیوں کو برقرار رکھنا تھا لیکن ان کے ارگرد رہنے والے قبائل کو ملکہ نظم و نسق میں لانے کی کوئی کوشش نہ کرنا تھی۔ تاہم اضافی اسلحہ سے انکار کر کے قبائل کی قوت خارجہ کو حتی الوسع کم فرور کرنا تھا۔ اس کی اہمیت کا احساس ۹۸-۱۸۹۷ء کی لڑائی میں ہوا جب قبائل نے جدید اسلحہ کے مالک ہونے اور اس میں مہارت کا مظاہرہ کیا۔ برسیل تذکرہ قبائلی اسلحہ کو محدود کرنے کی کوشش پورے آئندہ پچاس سال تک جاری رہی لیکن یہ کبھی کامیاب نہ ہو سکی۔ پٹان اپنا اسلحہ رشوت اور چوری کے ذریعے ہندوستان اور افغانستان سے حاصل کرتے تھے۔ وہ اسے برطانوی سپاہیوں سے کبھی چھپکے اور کبھی کھلم کھلا حملے سے حاصل کرنے میں نامقابل یقین پابکدستی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ انہیں بسا اوقات کابل کے اسلحہ خانہ سے بھی اسلحہ مہیا ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنی گن فیکٹریاں بہت عرصہ پہلے قائم کر لی تھیں۔ ۱۸۹۰ء سے خلیج فارس اور ساحل مکران سے وسیع پیمانے پر ناجائز درآمدی تجارت بھی قائم کی تھی۔ انگریز ۱۹۱۰ء تک اسے کم کرنے میں تو کامیاب ہو گئے لیکن وہ قبائلی علاقے میں اسلحہ کی فراہمی کو پوری طرح کبھی

۱۔ "گریٹ برٹین"، پارلیمنٹری پیپر ۱۸۹۸ء، ۲۳، این ڈیوایف

کانڈ، ۱۸۷۱ء، ص ۱۱، ۱۷-۱۸

نہ روک سکے !

ظاہر ہے کہ اگر تہی پالیسی کو نافذ کرنا تھا تو اس کے لئے ایک نئی انتظامی
تشکیل ضروری تھی۔ حکومت پنجاب ۱۸۴۹ء میں اس کے قیام کے بعد ایک
زبردست نوکر شاہی بن چکی تھی جس کے روح رواں لاہور اور امرتسر کے
گروہ کے درخیز میدان تھے۔ دوسرے نفظوں میں سرحد کا نظم و نسق بائیں
ہاتھ سے چلایا جاتا تھا۔ بہت سے مسائل کی حریہ پاتی نوعیت کی وجہ سے
کلمتہ کو اکثر مداخلت کرنا پڑتی تھی۔ لندن بھی ملوث تھا کیونکہ وائٹ
ہال ٹیکنیکی طور پر حکومت ہند کے توسط سے افغانستان کے خارجی
تعلقات کی نگرانی کرتا تھا اور وسط ایشیا میں ایک قابل قبول مقام
کے لئے مستقل سینٹ پیٹرز برگ سے رابطہ قائم رکھتا تھا۔ قبائل کے
خلاف بے شمار مہمات نے فوج کے کردار کو غیر معمولی طور پر اہم بنا
دیا تھا۔ سندھ یار کے پڑے شورش امداد تھا فتنی طور پر مختلف اضلاع کو
بھگتانے کے علاوہ لاہور کے گلے میں اب قبائلی علاقہ میں نفوذ کا جو بھی
تھا۔

۱۸۴۹ء سے کئی دفعہ سندھ یار علاقے کو پنجاب سے جدا کرنے
کی تجاویز پیش کی گئی تھیں۔ دوسری جنگ افغان کے بعد لارڈ لٹن

۱۸۵۰ء تا ۱۸۵۸ء نیز آرمڈ کیس "کن زنگ اینڈ"

انڈین مارٹھ ویٹ فریئر (لندن: جے مرے، ۱۹۱۱ء)

اور لارڈ رابرٹس نے بھی علیحدگی پر نہ وردیا تھا لیکن نہ وہ اور نہ اس خیال کے دوسرے زبردست حامی لندن کو اس کی قبولیت پر آمادہ نہ کر سکے۔ بالآخر ۱۸۹۸ء میں جب سرحد میں لڑائی کچھ سست پڑ گئی تھی تو انڈیا آفس نے سرحد پر عملداری کو ایک نئے زاویے سے دیکھا اور نتیجہ نکالا کہ موجودہ انتظامات تسلی بخش نہیں ہیں۔^{۱۰} جنوری ۱۸۸۹ء میں کینڈلٹن کالارڈ کرنل واسرائل ہندنا۔ وہ کئی سال سے ہندوستانی معاملات میں گہری دلچسپی لے رہا تھا اور وسط ایشیا میں بہت سیر و سیاحت کر چکا تھا۔ وہ انڈیا آفس کے تجربہ سے بالکل متفق تھا اور اپنے ساتھ صورتحال کو بہتر بنانے کا اختیار بھی لایا۔ ایک سال سے زیادہ کے غور و خوض کے بعد کرنل نے ایک طویل اور مدلل یادداشت میں تجویز پیش کی کہ سرحدی اضلاع کو ایک علیحدہ یونٹ بنادیا جائے اور قبائلی علاقے کو براہ راست حکومت ہند کے ماتحت رکھا جائے۔ اس کے خیال میں ایسا کرنے سے قبائلی انتظام و انصرام خالصتاً ان لوگوں کے سپرد ہو سکے گا جو قبائل کو جانتے ہیں۔^{۱۱} کرنل کی خواہش ۹ نومبر ۱۹۰۱ء کو پوری ہو گئی جب صوبہ سرحد کی

^{۱۰} پارلیمنٹری پیپر ۱۸۹۸ء، جلد تریسٹواہین ڈبلیو ایف، کمبائنڈ

۱۸۷۱ء ص ۳

^{۱۱} پارلیمنٹری پیپر ۱۹۰۱ء جلد ۴۹، ویں این ڈبلیو ایف، کمبائنڈ ۱۹۰۶ء ص ۱۵

طور پر معرضِ وجود میں لایا گیا اور قبائلی علاقہ پر حکومت ہند کی
براہ راست گرفت قائم ہوئی۔

نئی انتظامیہ کے مسائل اور ان کے حل کرنے میں اس کی کامیابی
پر تبصرہ ایک آئندہ باب میں کیا جائے گا لیکن انیسویں صدی کے افراد
کو چھوڑنے سے پہلے ان تبدیلیوں کا مختصر سا ذکر مفید ہوگا جو پچاس
سالہ برطانوی دورِ حکومت میں پیدا ہوئی تھیں۔ ان میں سے بعض اہم
ترین دستاویزات ہیں واضح نہیں ہیں اور انہیں صرف بعد میں آنے
والے انتظام کاروں کے رویوں اور پٹھانوں کے ردِ عمل سے ہی اخذ
کیا جاسکتا ہے۔

ابتدائی ایام کے برطانوی انتظام کار حیرت انگیز لوگ تھے بہت
سے سنوارے تھے جنہوں نے اپنی ساری زندگیاں ان لوگوں کے عادات و
اطوار کو سمجھنے پر صرف کر دیں جن پر وہ حکومت کر رہے تھے یا حکومت
کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ اکثر سفر پر رہتے تھے اور تمام
برہمنوں اور قبائلیوں کی اکثریت سے دوستانہ نہیں تو کم از کم گہرے
تعلقات ضرور رکھتے تھے۔ وہ خالصتاً اسی موضوع پر اپنے وطن
میں اپنے خاندانوں، ہندوستان کے دیگر حصوں میں اپنے مرد رشتہ داروں
اور لاہور اور کلکتہ میں اپنے رفقاء کے کار کے ساتھ ایک طویل و

خط و کتابت کرتے تھے۔ وہ شاذ و نادر ہی چھٹی لیتے تھے اور دورانِ کار تفریح نہ کرتے تھے۔ وہ ۱۸۵۷ء کی بناوت، دوسری جنگِ افغان اور قریباً مسلسل قبائلی بغاوتوں کے دوران وسط ایشیا میں اپنی سلطنت کے پیشِ غلبہ پر ڈٹے رہے۔ پٹھانوں کو راہِ راست پر لانے اور رکھنے سے جو تھوڑی بہت فرصت انہیں ملتی تھی وہ اسے لاہور، کلکتہ اور دہلیٹ ہال کو قائل کرنے پر صرف کرتے تھے کہ پٹھانوں کو اپنی ہی زندگی گزارنے کی اجازت دی جائے اور یہ بخوبی سمجھ لیا جائے کہ سرحد اپنے کچھ مخصوص مسائل پیش کرتا تھا۔

بعد میں صدی کے دوران جب پاؤں مضبوط ہو گئے اور پھیل کر قبضے میں بدل گئے تو بڑے بڑے خاندان مشرق میں آگئے تاکہ سرحد میں ایک ”چھوٹا سا انگلستان“ قائم کر لیں۔ جن لوگوں کی زیادہ دلچسپی اور ترقی کے امکانات بہت دور لاہور یا شملہ میں مرکوز تھے وہ سرحد میں اپنا وقت کڑھ کڑھ کر گزارتے تھے۔ فوجی افسر جن کی پٹھانوں میں واحد دلچسپی یہ تھی کہ وہ ان کے ذریعے اپنے نئے لشکروں کو خون لینے اور خون دینے کا چسکا مہیا کرتے تھے۔ انتظامِ معاملات میں روز افزوں اہم کردار ادا کرتے لگے۔ پولیٹیکل افسرانِ دجن سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ مقامی عادات و اطوار میں دلچسپی لیں پٹھانوں کا تحفظ کریں اور جنہیں حقارت آمیز انداز میں معاف کر دیا جاتا تھا اور لشکر و کشوری انتظامیہ میں تمیز شدید ہوتی گئی۔

انتظامی فیصلوں کے لیے لاہور یا کلکتہ سے رجوع کرنا پڑتا تھا۔
 وسیع تر پالیسی لندن میں بنتی تھی اور وہ بھی اکثر و بیشتر سینٹ پیٹرز برگ
 کے ساتھ لمبے چوڑے جوڑ توڑ کے بعد، اکثر و بیشتر چٹانوں کے مفادات یا
 فلاح و بہبود کا اثر کسی فیصلے پر برائے نام ہی ہوتا تھا۔ وجہ تو انگریز
 اور چٹان دونوں اپنے اپنے راستوں پر نہایت ہمت و ذہانت سے
 چلتے رہے تاہم ان کے درمیان ایک سہ سکنداری کھڑی ہو گئی جسے
 چھاؤنیوں میں رہنے والی انگریز خواتین کے خوف اور بد اعتمادی نے
 اور بھی مضبوط کر دیا جو وہ اپنے مردوں کے برعکس خاموش اور پراسرار
 پہاڑیوں سے محسوس کرتی تھیں، ماضی پر نگاہ ڈالیں تو ایک عجیب طنز
 سا احساس ہوتا ہے کہ ۱۹۰۱ء میں جب صوبہ سرحد ظہور پذیر ہوا تو سرحد
 میں انگریز حکومت پہلے ہی اپنے نصف سے آگے گزر چکی تھی۔ یہ کہا
 جا سکتا ہے کہ ایسا خیال چھاؤنیوں کے انگریز شرفاء اور ان کی بیگمات کے
 تصور میں بھی نہیں ہو گا جو نئے واسطے یا ضعیف ملک کے جاہلانہ
 صحت نوش کرتے تھے۔ وہ تو ایسے سوچے اور کام کرتے تھے گویا وہ
 ہمیشہ ہمیشہ وہیں رہیں گے۔

(۱۰) باب ششم

عظیم مقابلہ

تعارف

۱۹۲۲ء میں ایک خصوصی مارٹھ ویسٹ فرنیچر انکوائری کمیٹی نے ایک صدی سے زیادہ پرانی برطانوی پالیسی کا لب باب یوں پیش کیا۔ ”ہماری پوری سرحدی پالیسی کا آخری مقصد ہندوستان کا تحفظ ہے۔ ہماری شمال مغربی سرحدی پالیسی کا فوری ہدف سرحد پار قبائل کو قابو میں رکھنا ہے تاکہ ہمارے سرحدی اضلاع میں جان و مال محفوظ رہے۔“

فوری ہدف کو حاصل کرنے کے لئے انیسویں صدی میں برطانوی

۱۔ گورنمنٹ آف انڈیا۔ رپورٹ آف ویسٹ فرنیچر انکوائری کمیٹی اینڈ
منس آف ڈائنٹ بائی مسٹر۔ رنگ اپجیر اینڈ مسٹر این۔ ای۔ سامرٹھ

مساعی کا بیان پچھلے باب میں ہوا لیکن یہ ہمیشہ آخری مقصد کے ہی
سیاق و سباق میں کی گئیں جو ہندوستان کے علاوہ ایشیا میں عمومی برطانوی
حیثیت کو روس سے بچاتا تھا۔ اس کی وجہ سے ”عظیم مقابلہ“ جیسے پہلنگ
رومانوی انداز میں بیان کرتا ہے۔ سو سال سے کچھ زیادہ ہی جاری رہا۔
سرحد میں برطانوی پالیسی کو سمجھنے اور جاننے کے لئے کہ یہ ہندوستان
کے دیگر حصوں میں برطانوی پالیسی سے کیوں مختلف تھی، اس عظیم مقابلہ
کے متعلق کچھ سمجھنا ضروری ہے، خواہ اس کی بعض چالیں سرحدی
پہاڑیوں سے بہت دور اور ان پر برطانوی قبضے سے ساہا سال پہلے
چلی گئیں۔

ہرات کے لئے کشمکش

پیشتر اس کے کہ کانگریس آف ویانا (ستمبر ۱۸۱۴ء تا جون ۱۸۱۵ء)
یورپ کے نقشے کی تشکیل تو کرتی انگلستان ایشیا میں روسی خطرے کے مقابلہ
کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ ۱۵ نومبر ۱۸۱۴ء کو ایڈن اور انگلستان نے معاہدہ
طهران پر دستخط کئے۔ اس کی دفعات کے مطابق (۱) ایران نے ضمانت دی کہ
وہ اپنے علاقے میں سے کسی یورپی فوج کو ہندوستان نہ جانے دیگا اور
خیونہ، بخارا اور خوقند کے خوائین پر بھی زور ڈالے گا کہ وہ بھی ایسا ہی کریں
(۲) روس اور ایران کی دونوں مملکتوں کی حدود کا تعین برطانیہ عظمیٰ، ایران
اور روس کے باہمی اتفاق سے ہو گا۔ (۳) ایران اور برطانیہ عظمیٰ جنگ

کی صورت میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے سوائے اس کے کہ (ہم) انہیں
افغان جنگ کی صورت میں ایران ایک لشکر برطانیہ کے سپرد کر دے گا لیکن
(۵) افغان ایران جنگ کی صورت میں برطانیہ غلطی مداخلت نہیں کرے
گا اور صرف فریقین کی استدعا پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کرے گا۔
کوئی بیس سال بعد ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ آک لینڈ کے
دور حکومت میں ۱۸۳۶ء تا ۱۸۴۲ء وسط ایشیا میں تبدیلیوں
کی افواہیں جن سے برطانیہ ڈرتا تھا لندن اور کلکتہ پہنچیں۔ بہارت پر
”جو ہندو کش“ کے مغربی سرے پر ایک اہم جنگی مقام تھا اور برطانوی
اور روسی مقبوضات کے قریب درمیان تھا قبضے کے لئے امیر کابل
شاہ ایران، افغان سرداران قندھار اور خان خیوا کے درمیان ایک
کثیر الجہت مقابلہ شروع ہوا۔ متقابلین میں سے کوئی بھی برطانوی
مفادات کا حامی نہ سمجھا جاسکتا تھا اور کم از کم دو پر ایران اور خیوا
روسی ترغیب کے تحت حرکت کرنے کا شہہ تھا۔

وسط ایشیائی ٹیپ پر شطرنج کا کھیل جلد ہی شروع ہو گیا ستمبر
۱۸۳۶ء میں لارڈ آک لینڈ نے امیر کابل، دوست محمد کے ساتھ تعلقات

۱۔ جین، گریٹ برٹین ”برٹش اینڈ فارن سٹیٹ پیپر“ ۱۸۱۳ تا ۱۸۴۱ء، پارٹ ۵

جلد اول لندن، رچرے ۱۹۲۹ء ص ۲۶۱ تا ۲۶۴

۲۔ ”سرمہی السن“ انگلینڈ، ان دی ایٹ لندن ۱۸۷۵ء باب ۲

قائم کرنے کا فیصلہ کیا جس نے ابتری کے دور کے بعد اپنا تخت دوبارہ حاصل کر لیا تھا۔ یہ ابتری شاہ شجاع کو معزول کرنے کی وجہ سے پیدا ہوا تھا جس کے تحت ایلفٹن نے ۱۸۰۹ء میں معاہدہ کیا تھا۔ لارڈ آک لینڈ نے کیپٹن الیگزینڈر برنز کو اپنا ایچی چٹا، برنز ستمبر، ۱۸۳۳ء میں کابل پہنچا۔ دو ماہ بعد شاہی روسی فوج کا کیپٹن واکو پورج بھی کابل میں نمودار ہوا۔ واکو پورج کی آمد نے برطانوی سکوک و شہادت کی تصدیق کر دی اور دونوں بڑی سلطنتوں کے درمیان ایک گھنیرہ کشی شروع ہو گئی۔

روسی طہران میں بھی اسی وقت حرکت میں آئے، شاہ کے روسی وزیر کاؤنٹ سائیمونچ نے زور دیا کہ ایرانی ہرت پر قبضہ کر لیں پشیر اس کے کہ خیوایا کابل و جنہیں روسی بھی اس بات پر اکتا رہے تھے ایسا کریں۔ جب یہ خبر لندن پہنچی تو وزیر اعظم لارڈ پامرسٹن نے طہران میں برطانوی وزیر، سر مہری ایلس کو حکم دیا کہ وہ روسی پر انگریزی حکومت

۱۔ برنز، ایچ، اس ۱۴، فو لیو، جان ویم کائی، ہسٹری آف دی واران
افغانستان، ۳، جلدیں، لندن، رچرڈ بینٹی، ۱۹۵۵ء، III واکو پورج اور برنز کے
درمیان تو توتوئیں کا حال ایک تیسرے فریق کی نگاہ سے دیکھئے، ایچ، ایچ
۲۔ روسی دلائل پر مبنی پہلی جنگ افغان کے واقعات کے حال کے لئے دیکھئے، فلیپ ای، موٹی
"رشین پالیسی ان ایشیا، ۱۸۳۸ تا ۱۸۴۹ء روسی سدا و تہک ریویو، چارلہ
لندن، اپریل ۱۹۲۶ء ص ۱۱

کے اعتراضات کو واضح کر دے جو ہرات میں تبدیلی قبضہ پر وارد ہوں گے۔ ایس نے ایسا ہی کیا اور اصول مانروڈ کی دو ٹوک زبان میں سائیمونج سے کہا ”افغانستان کو ہماری سلطنت ہند کی سرحد سمجھنا ہوگا۔ کوئی یورپی قدم اس ملک کے ساتھ تجارتی یا سیاسی تعلقات رکھنے کی مجاز نہیں“۔

یہ کلال میں سلسلہ جنبا ئی اور افغانستان میں کسی تیسرے فریق کی توسیع کی حمایت کے خلاف روس کو ایک صاف تنبیہ تھی۔ یوں انگریزوں نے یکطرفہ طور پر افغانستان کو اپنا ایک سرحدی علاقہ قرار دے دیا جبکہ ان کی سرحد واقعی طور پر بارہ سال بعد صرف دریائے سندھ کے پار پہنچی اور لارڈ کرزن نے پچھتر سال بعد آکسفورڈ میں اپنے مشہور رومائز بیگز میں کاسیکی انداز میں باقاعدہ مارچ لینڈ تھیوری یعنی سرحدی علاقہ کا نظریہ پیش کیا۔ یہ بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ انفاظ ”یورپی قوم“ سے ہندوستان اور اس کی آزاد ریاستیں اس ممانعت سے مستثنیٰ تھیں۔ اس میں ایک اور بنیادی برطانوی پالیسی بھی مضمر تھی

۱۔ جیمز مانرو امریکہ کا پانچواں صدر تھا، ۱۸۱۷ تا ۱۸۲۵ء اس نے ۱۸۲۳ء میں لاپل اقوم کو امریکہ میں داخلت سے روک دیا اس کا نعرہ تھا ”ہینڈ آف امریکہ“ یعنی خبردار جو امریکہ کو ہاتھ لگایا۔ یہی اس کا اصول تھا (مترجم)

۲۔ پارلیمنٹری پیپر ۱۸۳۹ء، جلد چالیس، افغانستان ۱۰۔

۳۔ لارڈ کرزن ’فرنیٹرز‘ وی رومائز بیگز ۱۹۰۷ء آکسفورڈ: کیلنڈن پریس ۱۹۰۷ء

جسے پُرزور اور مسلسل افغان اعتراضات کے باوجود ۱۹۲۱ء تک جاری رکھا گیا یعنی یہ کہ اننگلو افغان تعلقات حکومت ہند کے توسط سے قائم رکھے جائیں نہ کہ براہ راست لندن اور کابل کے درمیان۔ شاہ ایران اس کھیل میں مضبوط ترین بہرہ تھا اور اسی نے اس سارا جی کش کش میں پہلا بحران پیدا کیا۔ ۱۸۳۷ء کے موسم خزاں میں جب ابھی یرننگو افغان عزائم پر اثر ڈالنے کا بھی موقع نہیں ملا تھا اور طہران میں ایلیس کی تنہات کے باوجود محمد شاہ نے ہرات پر حملہ کر دیا۔ سائیمو پنچ نے ایلیس کے اعلان کو نظر انداز کر دیا اور شاہ کو کھلم کھلا حمایت کا یقین دلایا۔ روسی کا ڈنٹ بذات خود محاصرہ کرنے والی فوج کے ساتھ گیا اور جنگی کارروائی کی پیش رفت میں اہم کردار ادا کیا۔

ہرات اس وقت افغانستان میں شامل تھا اس کا انحصار نقشہ نگار کی قومیت پر تھا۔ ایلیس کا بیان واضح کرتا ہے کہ انگریز اسے افغانستان کا ہی حصہ سمجھتے تھے۔ لندن نے سائیمو پنچ کی شاہ نوازی پر سینٹ پیٹربرگ سے احتجاج کیا بلیپا مرشٹن نے کہا ”وہ سلمہ طور روس کے آلہ کار کی حیثیت سے کام کر رہا ہے اور افغانستان میں روسی اقدامات برطانوی ہند کی طرف آتی ہی براہ راست پیش قدمی ہیں

۱۔ پارلیمنٹری بیگزٹ ۱۸۳۹ء جلد ۱۱۵ ص ۱۷ افغانستان، ص ۱۷

جتی کہ وہ اس وقت حتی المقدور کر سکتا ہے بلکہ سینٹ پیٹر زبرگ
 نے سائیمونچ کے فعل سے لا تعلقی کا اظہار کیا اور شاہ کو کسی وقت بھی
 اور کسی حالت میں بھی جنگ جاری کرنے سے روکنے کے احکامات کا
 حوالہ دیا۔ تاہم محاصرہ جاری رہا اور روسی سفارتکار ہرات کے سامنے
 شاہ کے کیپ میں موجود رہا۔ انگریزوں نے اب ایک نیا راستہ آزمانے کا
 فیصلہ کر لیا، جون ۱۸۳۸ء میں ایک بحری ہم بھٹی سے خلیج فارس بھیجی گئی
 کرک پر قبضہ کر لیا گیا اور افواہیں پھیل گئیں کہ ایک برطانوی لشکر جزائر شیراز
 کی طرف بڑھ رہا تھا اور اپنے راستے کے سارے علاقے کو تہہ و بالا کر رہا
 تھا۔ یہ افواہیں ہرات پہنچیں تو شاہ کے لشکر میں کھلبلی مچ گئی۔ قدرتی
 طور پر انگریزوں نے اس صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شاہ کو ایک
 دفعہ پھر مطلع کیا کہ ہرات یا افغانستان کے کسی بھی حصہ پر ایرانی قبضہ
 ”انگلستان کے خلاف ایک مخالفانہ اقدام تصور کیا جائے گا، اور یہ کہ ایک
 بحری ہم پہلے ہی خلیج فارس میں پہنچ چکی تھی اور اگر شاہ چاہتا تھا کہ
 حکومت برطانیہ اپنی بحالی و عزت کے لئے مزید عمل اقدامات سے باز رہے
 تو اسے فوراً ہرات سے واپس آ جانا چاہیے“۔

۱۔ سر ایڈیوارڈ اور جی بی۔ گوچ مدیران دی کیمبرج ہسٹری
 آف برٹش نارن پالیسی۔ ۳ جلدیں کیمبرج دی یونیورسٹی پریس، ۱۹۲۳ء ص ۲۰۵
 ۲۔ کائی۔ ایف جلد اول، ص ۲۸۲ تا ۲۸۴

دو ماہ بعد سائیمونج کی طوالت محاصرہ کے لئے کوششوں کے باوجود
ایرانی قوتوں نے محاصرہ اٹھالیا اور پھر ان واپس روانہ ہوئی۔ سائیمونج
کو شاہی روسی حکومت نے واپس بلا لیا اور اس کے جانشین کو ہدایت کی
گئی کہ وہ شاہ کو مطلع کر دے کہ روس افغان سرداروں کی خانہ جنگی یا ان
کے خاندانی تنازعات میں کوئی حصہ نہ لے گا جو ہماری مداخلت پر کوئی
حق نہیں رکھتے۔^{۱۰}

پہلی جنگ افغان !

جب انگریز پھر ان میں سائیمونج کے خلاف حیلہ آزمائی کر رہے
تھے تو کابل میں ایک اور کھیل جاری تھا۔ جب الیگزینڈر برنز ۱۸۴۲
ء کو ایک "تجارتی" مشن کابل پہنچا تو امیر دوست محمد نے اس
کا نہایت دالہانہ استقبال کیا کیونکہ اسے ایرانیوں کے اپنے مشرق
کی طرف حملوں کے خلاف برطانوی امداد کی امید تھی۔ اپنی آمد کے
چار دن بعد برنز نے امیر کے ساتھ اپنی نجی ملاقات میں زور دیا کہ
وہ ایرانیوں کو ہرات سے نکال باہر کرے اور افغانستان کے مغربی خطہ
پر اپنا رعب داب قائم کرے۔ دوست محمد ہرات تو واقعی چاہتا
تھا لیکن انگریزوں کے ساتھ مشترکہ محاذ بنانے کے لئے جو قیمت وہ مانگتا

۱۰ - پارلیمنٹری پیپرز، ۱۸۴۹ء، جلد چالیسویں، افغانستان، ص ۱۰۰

تھا وہ صرف مغربی سرحد پر ایرانیوں کے خلاف امداد ہی نہیں تھی بلکہ اس کی مشرقی سرحد کا تحفظ بھی اس میں شامل تھا گویا وہ یہ ضمانت چاہتا تھا کہ پشاورد اور سرحدی اضلاع جو سکھوں نے قبضہ لے لئے تھے اسے بحال کئے جائیں۔

برز نے بہم سے وعدے کئے کہ بجالی پشاورد کے لئے رنجیت سنگھ سے کوئی انتظام کیا جائے گا۔ اس کے جواب میں دوست محمد نے ایرانی بہم کی سرگرمی سے مخالفت شروع کی۔ اس نے سردار قندھار پر زور دیا کہ وہ ہرات پر حملہ میں شاہ ایران سے گٹھ جوڑ کرنے سے باز رہے جس کا وہ منصوبہ بنا چکا تھا۔ اس نے مغرب کی طرف بھیجنے کے لئے لشکر اندوزی شروع کی۔ اس خوشگوار فضا میں دربار میں یہ خبر پہنچی کہ ایک روسی سفیر کابل کے لئے روانہ ہو چکا تھا۔

کیپٹن واکوویچ ۱۹ دسمبر کو کابل میں داخل ہوا اور کانٹنٹ سائیمنوچ اور زار روس کی طرف سے خطوط پیش کئے۔ برز نے فوراً ہی آنا سرایمہ اور متفکر ہوا کہ اس نے لارڈ آک لینڈ کو ہدایات کے لئے ایک فوری استدعا سال کی۔ اسے یہ ہدایات جنوری میں ملیں ان میں ایک سخت ڈانٹ ڈپٹ بھی شامل تھی کہ اس نے دوست محمد کے ساتھ پشاورد کو زیرِ بحث لا کر اپنے اختیار سے تجاوز کیوں کیا؟ -
واسرائے نے لکھا کہ سکھ ہندوستان میں انگریزوں کے مضبوط ترین اتحادی تھے اور پشاورد ان کا تھا اور انہی کا

رہے گا۔

دوہی اٹنا عروا کو پچ نے دوست محمد کو بتایا کہ ۵ ہزار کی روسی فوج ہرات پر افغان حملے میں مدد کے لئے تیار کھڑی تھی جو اس شہر کی تسخیر کے بعد سکھوں کے خلاف صف آرا ہوگی اور دوست محمد کو پشاور اور پنجاب کا کچھ حصہ واپس دلا دے گی۔ اگر یہ تجویز بہت عملی نہ تھی تو بھی اس لاپرواہی کے باوجود دوست محمد برنز پر ہی زور دیتا رہا کہ ایک ایسا معاہدہ ہو جائے جس میں پشاور کی بحالی شامل ہو۔ موصولہ احکامات کے پیش نظر برنز کچھ بھی نہ کر سکتا تھا ۲۱ مارچ ۱۸۲۸ء کو دوست محمد نے بنفس نفیس اک لینڈ کو مراسلہ لکھا کہ ”افغانوں کی

۱۔ کانٹا، ایضاً جلد اول، ص ۲۰۲۔ اپنے ایک نجی خط میں برنز نے اس صورتحال کو یوں بیان کیا جس میں وہ گھبر گیا تھا ”ہم یہاں ایک کھلبلی میں ہیں۔ ہرات محصور ہے اور ہتھیار ڈال سکتا ہے جس نے دوست محمد کو رنجیت شکوے سے بچنے آزمانے کے لئے برائے کی پیش کش کی ہے۔ میں اپنی آنکھوں اور کانوں کا اعتبار نہیں کرتا لیکن کیپٹن ڈاکوٹ (جو اس ایجنٹ کا نام ہے) یہاں ایک تین فٹ لمبے شاندار خط کے ساتھ پہنچا میں نے فوراً اپنے لارڈ کو ایک مکتوب بھیجا کہ وہ ازراہ کرم غور کرے کہ اس کے پیش روؤں نے اس کے لئے کیا کانٹے بونے تھے اور اس کے بعد نہیں جانتا کہ کیا کچھ رونما ہو سکتا ہے اور اب روس اور ہمارے درمیان دشمن بدوش دوڑا رہی تھی۔“

۲۔ موہن لال سلاٹک آف دی امیر دوست محمد خان آف کابل، ۲ جلدیں (لنڈن، لائنگ مین، براؤن، گرین اینڈ لائنگ مینز، ۱۸۷۴ء، جلد اول ص ۲۴)

شکایات کا ازالہ کیا جائے اور انہیں تھوڑی سی تسلی اور قوت دی جائے، ”ایسا لگتا ہے کہ وائسرائے اس کا جواب دینا پسند ہی نہ کرتا تھا۔ چنانچہ ۲۶ اپریل ۱۸۳۸ء کو بے چارہ برنز مایوس اور شرمسار ہو کر کابل سے چلا گیا اور دوست محمد نے واکوچ کی جانب رجوع کیا۔

ظاہر ہے کہ واکوچ کابل میں کافی کامیاب رہا تھا۔ انگریز سفیر بے عزتی سے نکالا جا چکا تھا۔ روسی اثر و رسوخ قائم ہو گیا تھا اور برطانوی ہند کے خلاف آئندہ روسی افغان اتحاد کی بنیاد رکھ

لی۔ کائی، ایضاً جلد اول ص ۲۰۸، کابل میں برنز کے مشن اور پہلی جنگ افغان کے ابتدائی رجوہات کے متعلق سرکاری خط و کتابت کا دافع اور مکمل ریکارڈ ملنا مشکل ہے۔ اس باب میں بیان شدہ سلسلہ واقعات ماخوذ ہے برنز سے ایضاً، ص ۱۴۰۔ فریو مین، ایضاً، جلد سوم، کائی ایضاً جلد اول، ص ۱۶۶ تا ۲۱۰، پارلیمنٹری پیپرز ۱۸۵۹ء، جلد پچیسویں، افغانستان سے کائی نے التمام لگایا ہے کہ ایک لیٹ کی برپا کردہ جنگ کا جواز پیدا کرنے کے لئے ریکارڈ کو توڑ مروڑ، گھٹا بڑھا اور منہج کر دیا گیا۔ اس نے اپنی کتاب میں ”سرایینڈر برنز کی غیر مطبوعہ خط و کتابت“ سے بہت اقتباسات دیئے ہیں، ۱۸۵۹ء کے پارلیمنٹری پیپرز میں مزید مواد موجود ہے لیکن پھر بھی پوری خط و کتابت نہیں جسکا ایک حصہ ۱۸۳۹ء میں اشاعت پذیر ہوا تھا۔

دی گئی تھی۔ لطف یہ ہے کہ اس سب کو روکنے کے لئے ہی انگریزوں نے ایران میں آتنا جوڑ توڑ کیا تھا۔

اس صورتحال کا سامنا کرتے ہوئے برطانوی پالیسی ایک دفعہ پھر طاقت کے استعمال پر اتر آئی۔ وہ خاص لمحہ جس میں دوست محمد کے خلاف جنگ کا فیصلہ کیا گیا واضح نہیں ہے۔ لیکن یہ غالباً اس کے فوراً بعد آیا جب برنز کو یہ اطلاع دی گئی تھی کہ پشاور سکھوں کے قبضے میں ہی رہے گا۔ یکم اکتوبر ۱۸۳۸ء کو لارڈ آک لینڈ نے گورنر جنرل ہند کی حیثیت سے تنازعہ فیہ شملہ منی فیسٹو جاری کیا۔ اس فیصلے و مبلغ دستاویز نے برطانوی ہند پر نجیت سنگھ اور شاہ شجاع راجو کابل کا ایک مغرور امیر تھا اور اپنے چند ہزار ہاجر جان نثاروں کے ساتھ ہندوستان میں مقیم تھا) کے درمیان ایک اتحاد کا اعلان کیا تاکہ "افغان لوگوں کی وحدت، آزادی اور خوشحالی بحال کی جاسکے اور تاج برطانیہ کے مقبوضات کے تحفظ کا سامان ہو سکے" بلکہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے شاہ شجاع کو تخت پر بجال کرنا تھا جس سے وہ قریباً بیس

۱۰۔ متن کے لئے کافی، ایضاً، جلد اول، ۳۷۳ تا ۳۷۴، نیز رٹری آف ایلین

اینڈ فرینڈ شپ اگیز ٹوٹو ٹوٹو ہما راجہ رنجیت سنگھ اینڈ شاہ شجاع الملک ودری

ایپروویشن آف اینڈ ان کنسرٹ ودری برٹش گورنمنٹ، جون ۲۶، ۱۸۳۸ء

کا متن بھی دیکھو (ایضاً۔ ص ۲۲۲ تا ۲۲۵)

سال پہلے محروم کیا جا چکا تھا۔

یہ سب جنگی تیاری ہرات پر روسی شہ کے سہارے ایرانی قبضے
کو روکنے کے پیش نظر کی گئی۔ منشور کی تہذیب کے مقوڑے ہی عرصہ بعد آک لینڈ
کو یہ خبر ملی کہ ہرات کا محاصرہ اٹھا لیا گیا تھا۔ برطانوی افغان اور سکھ

افواج پہلے ہی فروز پور میں جمع ہو رہی تھیں۔ اب کیا کرنا تھا؟

آک لینڈ نے جنگ کا راستہ اختیار کیا، ۸ نومبر کو اس نے اعلان کیا
کہ ہرات سے شاہ ایران کی واپسی، برطانوی ہند کی حکومت اور اس کے
اتحادیوں کے لئے ایک صحیح وجہ تہنیت دے گا (تھا) لیکن وہ دائرے نچھیت
صیغہ نمائے پوری قوت سے ان اقدامات کو جاری رکھے گا جن کا
اعلان کیا جا چکا ہے تاکہ افغانستان کے مشرقی صوبوں میں ایک مخالف
طاقت کی بجائے ایک دوستانہ نعم البدل مل سکے۔

نومبر ۱۸۲۸ء کے دوران لشکرِ سندھ، فروز پور میں جمع ہوا۔ یہ
بنگال آرمی کے تمام حصوں کے ۹۵۰۰ آدمیوں پر مشتمل تھا اور ایک
یورپی رجمنٹ کے کچھ حصے بھی اس میں شامل تھے۔ ۲۵ ہزار کی امدادی
نفری اس کے علاوہ تھی۔ شاہ شجاع ۶ ہزار افغان یونیٹ کے ساتھ
شامل ہوا۔ سکھوں کا ایک بڑا دستہ رنجیت سنگھ کے ماتحت لاہور سے
آیا اور رنجیت سنگھ گورنر جنرل آک لینڈ کے ساتھ ۲۹ اور ۳۰ نومبر کو

تمام افواج کی ایک عظیم نشان پر ٹڈ کے دوران معائنہ سٹینڈ پر رہا۔ چند دن بعد رنجیت سنگھ اور اس کے سکھ یہ وعدہ کر کے واپس پنجاب چلے گئے کہ وہ کابل پر حملے کے لئے خیبر کے راستے ایک فوج بھیج دیں گے جس کی تعداد نہیں بتائی گئی۔

لشکرِ سندھ کو حرکت میں لانے کے لئے ۳ ہزار اونٹ درکار تھے لیکن یہ جلد ہی قندھار براستہ کوئٹہ روانہ ہو گیا۔ راستے میں بمبئی آئی کا قریباً ۳ ہزار آدمیوں کا ایک بریگیڈ بھی آ ملا جو کراچی کے راستے آیا تھا۔ لشکرِ وردہ بولان سے گزرا اور ساڑھے چار ماہ کے سفر کے بعد اس نے ۲۵ اپریل ۱۸۳۹ء کو قندھار پر قبضہ کر لیا۔ پھر یہ شمال کی طرف مڑا۔ جولائی کے آخری ہفتے میں اس نے غزنی میں متعینہ فوج کو موت کے گھاٹ اتارا اور ۱۰ اگست کو قریباً بلا جنگ کابل میں داخل ہو گیا۔ دوست محمد پہلے ہی رخصت ہونے والے روسی مشن کے ساتھ بھاگ گیا تھا۔ شاہ شجاع کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ سکھ خوش تھے کہ انگریزوں نے ہی سارا کام کر دیا اور وہ کبھی فوج کی صورت میں شامل نہ ہوئے۔ البتہ ایک علامتی سادستہ کابل پر قبضہ کے بعد برطانوی افواج سے آہٹا۔ ایک کم و بیش مستقل قابض فوج کابل میں جھوڑی گئی تاکہ وہ مخالف رعایا کے خلاف شاہ شجاع کی مدد کر سکے، اور اس سے وعدوں کی تعمیل کروائے۔ اس کے دربار میں بھی ایک سرکاری مشن قائم کر دیا گیا۔ ایک سال تک سب ٹھیک رہا۔ ۱۰ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ روسیوں

کو افغانستان سے مؤثر ترین حکمانہ ذریعہ سے نکال دیا گیا تھا یعنی پیشگی
برطانوی فوجی قبضہ کے ذریعے۔ پھر اگست ۱۸۴۰ء میں پورے افغانستان
میں علم بجاؤ بلند ہوا۔ ایک ماہ کے اندر اندر کابل محاصرے میں آ گیا اور
برطانوی گیریزین کو لڑ کر ہی باہر نکلنے کی کوشش کرنا پڑی۔ کابل افواج
میں سے شاید ہی کوئی ہندوستان واپس آ سکا۔ ایلزبتھ برنز جو مشن
کا انتظام سنبھالنے والا تھا راتے میں ہی مارا گیا۔ جنوری ۱۸۴۱ء تک
انگریز اور شاہ شجاع ملک سے بیک بینی و دو گوش نکال دیئے گئے۔

۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۲ء میں اتری پھلی رہی۔ لارڈ آک لینڈ نے اس انتشار
سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی عزت بحال کرنے کے لئے ایک برق رفتار
دستہ کابل بھیجا۔ اس نے کابل کا بڑا بازار نذر آتش کر دیا لیکن مسلسل
جھلے اور ہراس کی وجہ سے فوراً ہی واپس آ گیا۔

جنوری ۱۸۴۳ء میں دوست محمد شمال سے واپس آیا جہاں وہ
جلا وطنی کے دن گزار رہا تھا اور اپنے ملک کا دوبارہ اقتدار سنبھال
لیا "ایمر اعظم" واپس اپنے تخت پر آیا تو وہ انگریزوں کے خلاف سربا
نفرت سے بھرا ہوا تھا ایک ایسی نفرت جس میں اس کے لوگ بھی شریک
اور جسے کابل کا ملبہ مسلسل جگائے رکھتا تھا۔

جنگ کی اہمیت!

ایک فوجی مشن کے طور پر افغانستان میں ۱۸۴۰-۴۹ء میں

برطانوی مہم آزمائی ناکام رہی۔ بہت سے ناقدین قویہ کہتے ہیں کہ یہ سب سے ہی مستحسن نہ تھا۔ تقریباً تمام متعلقہ حضرات تسلیم کرتے ہیں کہ یہ ہرات کا محاصرہ اٹھنے کے بعد غیر ضروری ہو گیا تھا۔ کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یہ کامیاب رہا۔ برطانوی اموات بہت زیادہ تھیں۔ برطانوی سلطنت میں ایک گز بھر علاقے کا بھی اضافہ نہ ہو سکا اور انگریزوں سے افغانوں کی گہری اور تلخ نفرت کی بنیاد پڑ گئی جو آج تک جاری ہے، لیکن انگریزوں کی خواہش ہو یا نہ ہو جنگ کے کچھ پہلو ضرور ایسے تھے جو "عظیم مقابلہ" کے لئے سازگار تھے۔ اس کی وجہ سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ روس کے ایک ہم عصر واقعہ کی طرف ایک لمحہ کے لئے توجہ دی جائے۔

۱۸۴۰ء میں جب انگریز ابھی کابل میں محفوظ تھے ۵ ہزار آدمیوں کی ایک روسی مہم بمعہ بائیس بڑی قبیلوں اور ۱۰ ہزار اونٹ اور بزرگوں سے روانہ ہوئی تاکہ خیوا کے انکھوں کے قبضے سے روسی غلاموں کو آزاد کرایا جاسکے۔ اور پیرگ اس وقت شاہی روسی حکومت کی مشرقی ترین چوکی تھا۔ خیوا سے اس کا فاصلہ قریباً وہی تھا جو کراچی کا کابل سے ہے (قریباً ایک ہزار میل)۔

ہر ایک جانتا تھا کہ ازبک خزانین قیدیوں سے کیسا سلوک کرتے ہیں اور انگریز بھی یہ ماننے کے لئے تیار تھے کہ مہم کا جواز موجود تھا لیکن یہ خیال بھی ناگزیر تھا کہ یہ شاید مقابلے کی چوٹ تھی اور انگریز کابل میں بے حد خوفزدہ ہو گئے۔ منصوبہ بنایا گیا کہ انکھوں کو

www.freepdfpost.blogspot.com

”عظیم مقابلہ“ کے نقطہ نظر سے ۴۱-۱۸۳۹ء کے عسکری جوڑ توڑ کی اہمیت یہ تھی کہ برطانیہ نے دودفعہ یہ ثابت کر دیا کہ وہ ہندوستان میں اپنے اڈے سے اٹھ کر وسط ایشیا میں سر کے جیتنے کا اہل تھا، جبکہ روسی اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت نہ کر سکے۔ یہ حقیقت کہ انگریز اس مقبوضہ علاقے کو سنبھال نہ سکے۔ مقابلہ کے ابتدائی مرحلے میں آئی اہم نہ تھی۔ یہ ظاہر تھا کہ سلطنت کی ڈیوڑھی بڑھ کر ضرورت پائی جاسکتی ہے۔ دوسری طرف روسیوں نے کابل میں اپنی سفارت کی کامیابی سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ ایک قازق کو بھی بھون کے جنوب میں بھیجے بغیر انگریزوں کو وسط ایشیا میں ورطہ اضطراب میں ڈال سکتے تھے اور انہیں مقامی آبادی کے ساتھ متصادم کر سکتے تھے۔

افغانستان میں طاقت کے اس پہلے مقابلے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگلے بیس سال تک حالات جوؤں کے ٹوں رہے۔ اس عرصے میں روس نے خواف کے خلاف کوئی علانیہ حرکت نہیں کی اور کابل سے بھی پوری احتیاط سے دامن بچاتے رہے۔ ان حالات میں انگریزوں نے بھی کوئی تعرض

(بقیہ حاشیہ)

معاہدہ امن و اتحاد کیا گیا دہلیو۔ کے۔ فریزر ٹیلر۔ افغانستان۔ ۱۷

سٹی آف پولیٹیکل ڈیولپمنٹس ان سترل ایشیا۔ لندن آکسفورڈ یونیورسٹی

پریس، ۱۹۵۲ء، ص ۱۲۱

یہ کیا حالانکہ دوست محمد کابل میں ایک برطانوی سفیر کو قبول کرنے سے
مسلل انکار کرتا رہا، اور اس نے سرحد پر پہاڑی قبائل کے دباؤ کو کم کرنے
کے لئے حکومت ہند سے تعاون کے سلسلے میں اپنی دیرپہ ناراضمانندی
قائم رکھی۔ لارڈ لارنس کے تحت برطانوی پالیسی کو تباہل استادانہ کہا
گیا اور انکسٹن کی کنزرویٹو پارٹی ان الفاظ کو ہمیشہ حقارت کے ساتھ
استعمال کرتی رہی۔

دوسری جنگ افغان!

۱۸۶۸ء میں وسط ایشیائی کشمکش پر مہر سکوت کے ٹوٹنے کے
اثر پیدا ہونے لگے۔ اس سال شاہی روسی حکومت نے لڑائی کے بغیر محرقہ
پر اپنی حاکمیت قائم کر لی جس کا کسی وقت امیر بنارادعویدار تھا۔
دوست محمد ۱۸۶۳ء میں راہی ملک عدم ہو چکا تھا اور حسب معمول
انتشار کا دور دورہ ہوا تھا کہ ۱۸۶۸ء میں اس کے بیٹے شیر علی نے تخت
کابل پر جلوہ افروز ہونے میں کامیابی حاصل کر لی۔

اس وقت تک برطانیہ نے ہندوستان کے اکثر باقی ماندہ آزاد
حقے بھی قبضے لے لئے تھے اور برصغیر اسی جغرافیائی اور انتظامی حالت
میں آچکا تھا جیسا کہ یہ قریب قریب آزادی اور بھوارے کے وقت ۱۹۰۴ء
میں تھا۔

لارڈ لارنس جیسا نرم ترین اور محتاط ترین وائسرائے بھی اپنے

عہد کے آخری سال میں حکومت انگلستان کو یہ سفارتش کرنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ ایک قطعی پالیسی وضع کی جائے اور وسط ایشیا میں روس کے ساتھ ایک باہمی طود پر اطمینان بخش سرحدوں کے سلسلے میں تصفیہ پر توجہ دی جائے۔ انگلستان کی انگریزی سیاست بھی ایک نئے دور میں داخل ہو رہی تھی۔

فروری ۱۸۶۸ء میں ڈسٹر ایبل لارڈ ڈربی کی جگہ وزیر اعظم بنا اور زیادہ سر بھرا لارڈ میولارڈ لارنس کی جگہ واسٹ رائے مقرر کیا گیا جس سے ”سابل اسٹاڈانہ“ کی پالیسی منسوب تھی۔

لیکن بیشتر اس کے کہ قدامت پسند حکومت وسط ایشیا میں مارڈ پالیسی کے نفاذ پر پوری توجہ دیتی یہ دسمبر ۱۸۶۸ء میں گلڈ سٹون کی وزارت سے مغلوب ہو گئی۔ برسر اقتدار آنے کے قریباً جلد ہی بعد لبرل حکومت نے لارنس کی تجویز پر عمل کیا اور سینٹ پیٹرز برگ سے استدعا کی کہ وسط ایشیا میں ایک ایسے غیر جانبدار علاقے پر اتفاق کر لیا جائے جس میں دونوں میں سے کوئی طاقت بھی نفوذ نہ کرے۔

روسی رد عمل خوشگوار تھا اور وزیر خارجہ گورچاکوف نے دئے پیش کی کہ افغانستان ایک مثالی ”آزاد خطہ“ ہو سکتا تھا۔ اس نے ازراہ کم مزید کہا کہ شاہی حکومت افغانستان سے کوئی سروکار نہ رکھنے کا ارادہ رکھتی

تھی کہ ممکن ہے روسی تجویز حکومت لندن کو قابلاً قبول ہوتی کیونکہ اس میں
لا تعلقی کا کھلم کھلا اور غیر مشروط اظہار تھا جو برطانیہ کی افغان پالیسی
کا بنیادی اصول تھا۔ لیکن بظاہر لارڈ میونے اسے حکمت میں ٹھکرایا تاہم ہر کیف
برطانوی وزیر خارجہ لارڈ کلینٹن نے جوابی تجویز پیش کی کہ دریائے آمو
(سیحون) کو ایسا خطہ سمجھا جائے جسے کوئی طاقت کے ساتھ عبور نہ کرے۔
سہ سالہ تبادلہ مراسلات کے دوران انگریزوں نے افغان بفر کے
دور افتادہ سرحد سے پرے ایک غیر جانبدار خطے کا خیال ترک کر
دیا اور ایک ایسا خط تقسیم قبول کر لیا جو کم از کم بفر کے دور افتادہ

۱۔ برٹش اینڈ فارن سٹیٹ پیپر، جلد ۲۷ (۱۸۷۳ تا ۱۸۷۴) (لندن

رجوے، ۱۸۷۹ء) ص ۶۵۹۔

۲۔ سرکاری ذرائع میں میو کے اعترافات کا کوئی ریکارڈ نہیں لیکن روسی تجویز

پرمیو کا اعتراض جویم ہیرٹن کی "انگلوریش ریلیشنز انسٹریٹنگ افغان ۱۸۳۴ء تا

۱۹۰۷ء" الی تو اس سٹڈیز ان سوشل سائنسز، جلد ۲۱، نمبر ۲۴ (آرمینائیونیورسٹی

آف الی تو اس ۱۹۳۷ء میں بیان ہوا ہے، ہیرٹن نے اسے افسانے سے مصوب کیا ہے۔

ایضاً ص ۳۰۹) لیکن افسانے خود بھی اس نقطہ پر واضح ہیں ہے۔ اغلب یہ ہے کہ

کلینٹن کی جوابی تجویز میو کی خواہش کے مطابق تھی یعنی یہ کہ خطہ حاصل بنانا۔

کلینٹن کی تجویز "برٹش اینڈ سٹیٹ پیپر، جلد ۶۳ (۱۸۷۲ء تا ۱۸۷۳ء) ص ۶۱۸

۶۱۹ء پر موجود ہے۔

سرے پر تھا۔ آخر کار ۱۸۴۳ء کا معاہدہ کیا گیا اور سیموں کو افغانستان کی ہنوز بے فیصلہ شمالی سرحد کی بنیاد قرار دیا گیا۔ اس کے اہم نتائج مندرجہ ذیل تھے (۱) افغان اور روسی علاقے کے درمیان دریائے سیموں بطور خط فاصلہ پر اتفاق (۲) روس کے دائرہ اثر کا افغانستان کا رسمی اخراج اور (۳) برطانیہ کا اتفاق کہ روس بالآخر سیموں کے شمال کی تمام خانوں کو جذب کر سکتا ہے جن میں وہ علاقے بھی شامل ہوں گے جو کسی وقت امیر کابل کی حاکمیت میں رہے تھے۔ اس معاہدے میں نہ انگریزوں نہ روسیوں نے امیر سے کوئی مشورہ کیا۔

یہ تھی صورتحال جب ۱۸۴۴ء میں گلڈ سٹون کی لبرل حکومت کا یوریا بستر الپٹاگنا، ڈسرایلی دوبارہ وزیر اعظم بنا۔ لارڈ ڈربن وزیر خارجہ مقرر ہوا اور لارڈ لٹن وائسرائے ہند، نئی ٹیم گلڈ سٹون کی صابانہ سفارتکاری کے درمیانے نتائج سے قطعاً مطمئن نہ تھی۔ اس نے فاروڈ پالیسی سے اپنی عقیدت کو صیغہ راز میں نہیں رکھا اور نہ ہی طاقت کے استعمال کے عزم کو، اگر حصول مقصد اس کا متقاضی ہو۔ اس مقصد کو ایک حمایتی نے یوں بیان کیا، "وسط ایشیا میں اپنی تقدیر کے

۱- ۱۸۴۳ء کا معاہدہ اصل میں صرف آخری تبادلہ مراسلات ہے اکثر خطوط کا تبادلہ برطانیہ سے لارڈ کلیرنڈن اور لارڈ گرین وائیل اور روس سے ہنزادہ گورچاکوف کے درمیان ہوا۔ یہ برٹش ایڈ فارن سٹیسٹ پیپرز، جلد ۶۳، ۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۳ء میں موجود ہے

حصول کے لئے روسی خطرے اور گستاخی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ“^۱۔
لٹن کی ہندوستان میں آمد کے بعد تاؤ تیزی سے بڑھنے لگا۔
روسیوں نے امیر شیر علی سے مراسلت شروع کی۔ لٹن نے افغان امیر کو
۱۸۶۶ء میں پشاور میں ایک کانفرنس پر آمادہ کر لیا لیکن کابل میں ایک
برطانوی مشن بھیجنے پر اس کی رضامندی حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ شیر علی
نے برطانوی اعتراف کیا کہ وہ روسیوں سے خط و کتابت کر رہا تھا اور اس نے
اسے بند کرنے سے انکار کر دیا^۲۔

جب شیر علی ایک سال سے زیادہ برطانوی مطالبے سے سرگردانی کرتا
رہا تو لٹن نے کابل کو مشن بھیجنے کا فیصلہ کر لیا باوجود اس کے کہ افغان امیر
بار بار اعلان کر چکا تھا کہ وہ اسے خوش آمدید کہنے سے انکار کرے گا۔^۳ فینان
سیاہیوں نے ۲۵ اگست ۱۸۶۸ء کو نیپول جیمبر لین کے تحت جانے والے مشن
کو درہ خیبر سے واپس بھیج دیا^۴۔

وسط ایشیا میں بڑھتی ہوئی سرگرمی اصل میں روسوٹرکش جنگ
میں برطانوی مداخلت پر روسی غیظ و غضب کا نتیجہ تھی۔ برطانوی حکومت
میں اس بات پر اختلاف پیدا ہو گیا کہ خیبر کی بسکی کا کیا جائے۔^۵ روسیوں
”سالہری دجوزیر خارجہ بن چکا تھا، ابھی ابھی برلن میں مذاکرات

۱۔ آر۔ ایس۔ جیمس ”ان ماسٹرلی ان اکیٹیوٹی ان سنٹرل ایشیا“ (لندن: آئینسٹن، ۱۸۷۲ء) ص ۱۶

۲۔ پارلیمنٹری پیپر ۱۸۸۱ء، جلد ۹، سنٹرل ایشیا، نمبر ۱

۳۔ وارڈ اور گوبچ، ایضاً جلد ۸، ص ۸۵

سے فارغ ہوئے تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ اگر برطانیہ نے اس وقت وسط ایشیا میں حملہ کیا تو دوس ترکی سے اپنی فوجوں کے جبری انخلاء پر پہلے ہی جلا بٹھا بیٹھا تھا لہذا وہ فوراً شعلہ زن ہو جائے گا۔ اس لئے دوسرائیلی اور سلسبری شیر علی کو بھلانا پھسلانا ہی بہتر سمجھتے تھے۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ لارڈ لٹن جسے دوسرائیلی اور سلسبری نے خاص طور پر اپنی فارورڈ پالیسی پر عملدرآمد کے لئے چنا تھا اور لارڈ گرین برڈک جو سلسبری کی بجائے سیکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا بنا تھا۔ دونوں بندھے تھے کہ شیر علی کو فوراً سبق سکھانا ضروری تھا بالآخر انڈیا آفس کے لوگ جیت گئے۔ کابل کو الٹی میٹم بھیجا گیا کہ فوراً واقعہ خیبر پر معذرت کی جائے اور برطانوی مشن قبول کرنے سے اتفاق کیا جائے ورنہ شیر علی کو دشمن قرار دے دیا جائے گا۔ الٹی میٹم ۲ نومبر ۱۸۷۸ء کو بھیجا گیا اور ۲۰ نومبر کو اس کی میعاد ختم ہو گئی بلا شیر علی نے سلامتی کرنے کی کوشش کی لیکن انگریزوں نے اس کی مساعی کو نظر انداز کر دیا اور دوسری جنگ افغان شروع ہو گئی۔

پہلی جنگ افغان کی طرح برطانوی فوج کثیر تعداد میں تھی۔ اس میں بہت سے خدمت گاروں کے علاوہ قریباً ۲۵ ہزار جنگجو تھے اور یہ تین رستوں میں افغانستان میں داخل ہوئے۔ ایک خیبر سے، ایک کرم سے

اور ایک درّہ بولان سے۔ چالیس سال پہلے کے پیشروؤں کے برعکس یہ صرف برطانوی سپاہیوں پر مشتمل تھی اور ایسے علاقے سے روانہ ہوئی جو براہ راست قبضے میں تھا۔ جلال آباد، قندھار اور پیوڑا کو تل پر چند دنوں میں قبضہ کر لیا گیا۔ شیر علی اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے شمال کی طرف ترکستان کو بھاگ گیا۔ اس کے ساتھ وہی سلوک ہوا۔ اسے کوئی مدد نہ دی گئی اور اسے بہہ دیا گیا کہ وہ واپس گھر جائے اور انگریزوں سے دوستی کر لے۔

در بدر امیر جنوب کی طرف مڑا اور مزار شریف تک آیا لیکن اس کا کبھی پتہ نہ چیل سکے گا کہ کیا وہ دوستی کرنے آیا تھا یا مزاحمت کرنے۔ کیونکہ وہ وہیں ۲۱ فروری ۱۸۴۹ء کو انتقال کر گیا۔ اس کا بیٹا یعقوب خان انگریزوں سے ابوابِ کابل پر ملا اور اس نے تمام برطانوی مطالبات مان لئے۔ لیکن ان میں اہم ترین یہ تھے کہ کابل میں مستقل برطانوی مشن کی قبولیت، تمام افغان امور خارجہ کا برطانوی حکومت کے توسط سے انتظام و انصرام، بیرونی ملکوں سے کسی قسم کا معاہدہ نہ کرنے کی یقین دہانی اور برطانوی مرضی کے بغیر کسی سے جنگ نہ کرنے کا عزم۔ کرم، پشین اور بسی جو جنوب میں آندورفت کے لئے مستقل تھے برطانوی ہند کو دے دیئے گئے اور

۱- ایضاً جلد سوم، ۱۸۴۱ء، جنگ کی مفصل کہانی سٹرنی - ایچ - شیڈلوٹ کی ذریعہ افغان

یکمینیز آف ۱۸۴۱-۴۰ء دو جلدیں (لندن، ایس۔و۔ مارش، سرلہ اور رولنگٹن

۱۸۸۲ء) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

ہمہ جہتی اہم خیر اپنی پوری لمبائی کے ساتھ برطانوی تصرف میں آگیا۔
سر لوئیس کاوگنری کے تحت ایک برطانوی مشن جلد ہی کابل پہنچ گیا۔
شیر علی فوت ہو چکا تھا اور اس دفعہ کوئی معزول امیر شمال میں آتش فتنہ
بھڑکانے کے لئے موجود نہ تھا۔ قندھار اور جلال آباد مکمل طور پر خالی کر دیے
گئے اور کابل میں صرف ایک علامتی فوج رکھی گئی۔ جنگ جو اتنی تیز کامیاب
اور کم خرچ معلوم ہوتی تھی اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔

۳ ستمبر ۱۸۷۹ء کو کاوگنری اور اس کے رفقاء کار باغی افغان
پاہیوں اور ایک ہجوم نے قتل کر دیئے جنہیں یعقوب خان نہ روک سکا
یا جنہیں روکنا نہ چاہتا تھا، برطانوی افواج جو ابھی تک قریباً ویسی
ہی منظم تھیں دوبارہ مغرب کی طرف مڑ گئیں اور حیرت انگیز رفتار
کے ساتھ سارے افغانستان پر مسلط ہو گئیں۔ لارڈ رابرٹس ایک برقی فائر
دستے کو لے کر ۱۲ اکتوبر کو کابل پہنچا اور امارت سے یعقوب
خان کا استعفیٰ قبول کر لیا۔ بد نصیب یعقوب کو ہندوستان جلا وطن کر
دیا گیا اور بقول اس کے وہ ”امیر افغانستان کی بجائے انگریزی سیمپ میں
ایک گھسیارا بننا پسند کرے گا“۔ علی طور پر رابرٹس اس کی بجائے ”آٹا“

۱۔ مجاہدہ گندمک جس پر ۲۶ مئی ۱۸۷۹ء کو دستخط ہوئے، متن کے لئے دیکھئے
پابلیشرز پیپر نہ جلد ۵۶، ۱۸۷۹ء تا ۱۸۸۰ء، افغانستان ص ۵

افغانستان "بن گیا"

انگلستان میں ایک قدامت پسند حکومت برسرِ اقتدار تھی جو ایک مضبوط فارورڈ پالیسی کی علمبردار تھی۔ افغانستان مکمل طور پر برطانوی فوجی قبضہ میں آچکا تھا۔ بہت سے حلقوں میں یہ سوچا جا رہا تھا کہ برطانوی نصف افغانستان کو سائنسی سرحد کے اندر شامل کر کے سلطنت ہند کے کونوں کو برابر کر لے گا جس کے لئے قدامت پسند بہت عرصے سے چلا رہے تھے۔ امراتہ یہ ہے کہ پہلی پالیسی جس کی کوشش کی گئی تقسیم کی تھی۔ کابل، قندھار، ہرات اور دیگر صوبے ہندوستان کے نمونے پر آزاد مقامی ریاستوں میں بدل دیئے جاتے۔ وہ کسی بھی سردار کو دی جا سکتی تھیں جو اتنا مضبوط ہو کہ اپنی ریاست قائم رکھ سکے لیکن اتنا مضبوط بھی نہ ہو کہ دوسروں کو اپنے ساتھ ملا لے۔

دسمبر ۱۸۷۹ء تک رابرٹس کا تخت غیر آرام دہ ہوتا جا رہا تھا۔ ۱۸۸۰ء کے آثار پھر ہویدا ہو رہے تھے۔ کابل کے ارد گرد قبائلی بغاوتیں شروع ہوئیں اور تیزی سے پھیل گئیں۔ چند ہفتوں کے اندر اندر ایک درجن سردار اپنی اپنی جگہ انگریزوں کے خلاف ہمہ جہتی جنگ

۱۔ لیڈی بیٹی بیفورد دی ہسٹری آف لارڈ لٹن نہ انڈین ایڈمنسٹریشن ۱۸۷۶ء تا

۱۸۸۰ء "لنڈن لانگ مین، گریٹر ۱۸۹۹ء ص ۲۶۶ تا ۲۶۹۔ رابرٹس کو

واقعی لارڈ رابرٹس آف قندھار کا خطاب ملا تھا۔

لڑ رہے تھے۔ فروری ۱۸۸۰ء تک وائسرائے لٹن اس خلیفہ سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔ اس نے کابل میں مشن کے نئے سربراہ، پپلی گرن کو لکھا کہ کابل پہنچتے ہی اس کا پہلا کام یہ ہوگا کہ ”اس چوہے دان سے نکلنے کا راستہ بنایا جائے“ اس کے لئے لٹن نے چار اہم نکات تحریر کئے (۱) سابقہ امیر کو بحال نہ کرنا (۲) مغربی افغانستان کو شمال مغربی افغانستان سے مستقل طور پر علیحدہ کر دینا (۳) غالباً ہرات اور کابل کی علیحدگی (۴) مؤخر الذکر کا نہ الحاق نہ اس پر مستقل قبضہ اور (۵) کسی بھی حاکم کو تسلیم نہ لینے پر رضامندی جسے افغان برطانوی افواج کے انخلا پر مذاکرات کا اختیار دیں۔

مارچ کے پہلے ہفتے میں مطلوبہ حکمران کے شخص کا سراغ مل گیا۔ کابل میں خبر آئی کہ شیر علی کا ایک بھتیجا، عبدالرحمان خان جو پچھلے دس سال سے روسی ترکستان میں رہ رہا تھا شمالی افغانستان میں واقع بلخ میں آگیا تھا۔ یہ اقوام دور دور تک پھیل گئی کہ عبدالرحمان کو درپوں نے واپس ملک میں بھیجا تھا تاکہ وہ انگریزوں کی خطرناک صورت حال سے فائدہ اٹھا سکے۔ پھر بھی گرن نے اس کے ساتھ گفت و شنید شروع کی اور چار ماہ بعد ۲۲ جولائی کو عبدالرحمان کو کابل کے دربار میں امیر بنا دیا گیا۔ عبدالرحمان نے لٹن کے اہم نکات سے کوئی سروکار نہ رکھا بلکہ

نویافتہ ملک میں کاروبار سلطنت شروع کرنے سے بھی انکار کر دیا جب تک برطانوی مشن کابل سے نہ چلا جائے۔ لیکن وہ اس پر رضا مند ہو گیا کہ باہمی رضا مندی سے برطانوی حکومت کا کوئی مسلمان ایجنٹ کابل میں تعینات کیا جاسکتا تھا۔ تاکہ رابطہ میں آسانی رہے“ ۱

ایک سال کے اندر اندر عبدالرحمان نے پورا افغانستان اپنی قلمرو میں شامل کر لیا اور ابھی رخصت ہونے والی برطانوی فوج شہر کی دیواروں سے اوجھل بھی نہ ہوئی تھی کہ اس نے قندھار سے سدوزئی حکمران کو نکال باہر کیا۔ معاہدہ گندمک ختم ہو گیا۔ یہی حشر لٹن کے نظریہ کا ہوا جس کے تحت وہ افغانستان کے ٹکڑے کر کے اس پر قابو رکھنا چاہتا تھا۔ ۲

بہت سے انگریزوں نے دوسری جنگ افغان کو بھی پہلی کی طرح ناکام قرار دیا۔ کابل میں اب بھی کوئی تسلی بخش مشن نہ تھا۔ بہت تھوڑے سے علاقہ کا ہی سلطنت میں اضافہ ہوا (جتنا بھی اضافہ ہوا وہ بعد میں قیمتی ثابت ہوا) تخت افغانستان پر ایک آزاد اور مضبوط

۱۔ وارڈ اور گویچ، "یفا"، جلد سوم، ص ۹۰

۲۔ اس انسان کی دلکش سوانح کے لئے جس نے "خوفیہ مہذب" رہتے ہوئے اپنے لوگوں کو مہذب بنایا" دیکھئے میرنشی سلطان محمد خان کی تالیف کردہ "دی لائف

آف امیر عبدالرحمان" ۲، جنڈیس (لنڈن، جے۔ مرے ۱۹۰۰ء)

حکمران بیٹھ گیا۔ برطانوی لشکر نے ایک دفعہ پھر ثابت کر دیا تھا کہ وہ افغانوں کو فتح کر سکتے لیکن قبضہ برقرار رکھنے کے لئے اس کی اہلیت کافی حد تک مشکوک ہو گئی۔

پہلی جنگ افغان کی طرح ۸۰-۱۸۷۸ء کا برطانوی جوڑ لورڈ سینٹ پیٹرز برگ میں تشویش کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ غالباً جوانی مظاہرہ کے طور پر ترکستان کے کانڈرا چیف میجر جنرل ایل۔ این۔ سوبی لیف نے ۸۱-۱۸۸۰ء کی سردی میں ٹکے ترکمانوں کے خلاف ایک مہم چلی کمان کی۔ سوبی لیف ترکمانوں میں ”خونیں چشم“ مشہور تھا اور اس نے ۲۰ ہزار آدمی عورتیں اور بچے مار دیئے اور ترکمان قلعوں کو زیر کر لیا لیکن روسی فوج کو آب و ہوا اور زمینی نوعیت سے بہت نقصان اٹھانا پڑا۔

غالباً جنرل سوبی لیف کی مہم سے کئی گنا اہم تر اس کی سہ جلدی کتاب تھی جس میں اس نے افغانستان میں برطانوی مہم کا تجزیہ کیا۔ یہ جلدیں الگ الگ ۱۸۸۰ء، ۱۸۸۱ء اور ۱۸۸۲ء میں سینٹ پیٹرز برگ سے شائع کی گئیں اور ان میں ہندوستان اور وسط ایشیا میں برطانوی پالیسی اور اس کی کامیابیوں کا مذاق اڑایا گیا۔ تاہم سوبی لیف نے

۱- سوبی لیف کی مہم کے حال کے لئے دیکھئے چارلس مارون ڈوی آئی وٹنس کا ڈسٹ آف

ڈزاسٹرس سوشل نیٹین اگنیٹ ڈی اٹال بکے ترکمانڈنڈن۔ ڈوبلیو، ایم۔ این، ۱۸۸۰ء

دیکھا اور لکھا کہ انگریز دس دنوں کے اندر اندر ۴۶ لاکھ آدمیوں (یہ
ماننا ہو گا کہ ان میں سے ۸۰ فیصد خدمتگار تھے) ۱۵۱۹ لاکھ ٹروں،
۶۲۲۷ بیلوں، ۱۳۸ تلووں اور ۲۰۰ لاکھ ۲۷۳ پائونڈ سامان جنگ
کو حرکت میں لے آئے اور انہیں شمالی ہندوستان میں نقطہ ہائے ارتکاز
پر جمع کر لیا۔

سرخ کے نقطہ نظر سے دوسری جنگ افغان کا اہم ترین نتیجہ وہ
ہائے خیبر کرم اور بولان پر برطانوی قبضہ تھا جسے وہ معاہدہ گندماک
سے بچا لائے تھے۔

پہنچہ ۵ :-

گو دوسری جنگ افغان کے خاتمے کے بعد سے افغانستان
اور برطانوی ہند کے آئندہ تعلقات انتہائی غیر تسلی بخش رہے تاہم
عظیم مقابلہ میں ایک اہم حقیقت واضح طور پر منکشف ہو گئی، جہاں
تک روس کا تعلق تھا برطانیہ بغیر علاقے میں بڑا عنصر رہتا تھا جو
دونوں سلطنتوں کو جدا کرتا تھا۔

مسئلہ اب یہ تھا کہ افغانستان کی حدود کی نشاندہی کر دی جائے

۱- ایل۔ این سو بیف، دی اینگلز افغان سٹریٹ، مترجمہ ڈبلیو۔ ای، گووان د کلکتہ

پرنٹنگ آف گورنمنٹ پریس، ۱۸۸۵ء، ص ۲۸

۱۸۸۴ء میں شاہی روسی فوجوں نے مروجستان پر قبضہ کر لیا جو افغانستان کے جنگی طور پر اہم لیکن غیر واقع شمال مغربی کونے کے عین شمال میں واقع تھا۔ برطانیہ کے پاس روسی کارروائی کے خلاف شکایت کے لئے کوئی ٹھوس بنیاد نہ تھی کیونکہ کسی انگریز مدبر کو نہ کبھی وقت ملا اور نہ اس نے کبھی تکلیف کی کہ وہ مروج کو افغانستان کا حصہ بنائے۔ تاہم سینٹ پیٹرز برگ سے فوراً استدعا کی گئی کہ وہ مروج کے مروجہ روسی حزام کے بارے میں معلومات فراہم کرے جو اب آنے سے پہلے ہی وسط ایشیاء سے نئی خبریں ملیں۔

بتایا گیا کہ روسی مروج سے مغربی افغانستان کے ضلع پنجہ میں اپنے پاؤں پھیل رہے تھے ۱۸۷۳ء کے معاہدہ کے مطابق پنجہ کا علاقہ قطعی طور پر امیر افغانستان کی قلمرو کا حصہ تھا۔ سینٹ پیٹرز برگ کے نام لارڈ گرین وائل کے مراسلات کالب و لہجہ تیز ہوتا گیا۔ برطانیہ کے اصرار پر افغانستان کی شمالی اور مغربی حدود کی نشاندہی کے لئے ایک

۱۔ اسے انگلستان میں بہت خوف و ہراس پھیلا جسے ڈیرک آف آرگائل نے ”مروج نیس یا مروجیت کا شدید مظاہرہ“ قرار دیا۔ دیکھیے جارج ڈگلس کیپٹن ڈیرک آف آرگائل ”دی افغان فرنیئر“ ۲۔ جلدیں، لندن سٹراہان ۱۸۷۹ء جلد دوم، ص ۳۱۰۔

۲۔ پارلیمنٹری بیورو ۱۸۷۵-۱۸۸۴ء جلد ۸، سنٹرل ایشیاء نمبر ۱۹، ص ۱۷۔

باؤنڈری کمیشن قائم کر دیا گیا۔ ۱۸۸۴ء کے آخر میں مشہور سرحدی انتظام کار، سر پیٹر لمسٹن جسے کمیشن میں برطانوی مندوب مقرر کیا گیا تھا، سرخس پہنچ گیا۔ جہاں کمیشن کے اراکین نے مل کر کام نہا تھا۔ لمسٹن نے وہاں کوئی روسی رقیق کار نہ پایا لیکن اسے پچاس میل جنوب میں عین اتھان علاقے کے اندر قازق پکٹیس ضرور ملیں۔ لمسٹن کو ۸۵-۱۸۸۴ء کی سرحد میں سرخس میں طویل انتظار کرنا پڑا جبکہ لندن اور سینٹ پیٹرز برگ کے درمیان مراسلات کا تانتا بندھا رہا۔ صورتحال بہتر نہ ہوئی تو وکٹوریہ نے خور مارچ ۱۸۸۵ء میں ایگزیکٹو نڈر کو تار ارسال کی کہ وسط ایشیا میں مسلح تصادم کو روکا جائے۔

۳۰ مارچ ۱۸۸۵ء کو روسی افواج نے پخندہ پر قبضہ کر لیا اور افغان مدافعت کاروں کو بھگا دیا جن میں سے ۵۰۰ کھیت رہے۔ یہ خبر سینٹ پیٹرز برگ پہنچی تو برطانوی سفیر تھارٹن نے کہا جنگ ناگزیر ہے۔ پارلیمنٹ میں ٹکلیڈ سٹون نے ۱۱ ملین پاؤنڈ کا قرض مانگا جس میں سے ۶۶ ملین براہ راست جنگی تیاریوں کے لئے درکار تھے

۱۔ ایضاً

۲۔ ایضاً نیز بیرٹن، ایضاً، ص ۵۳

۳۔ لارڈ ایڈمنڈ فیرمارس "دی لائف آف گرین وائل" جارج لیونسن گورڈ

سینڈارل آف گریو وائل، ۲ جلدیں لندن جے مرے، ۱۹۰۵ء جلد دوم ص ۱۹۰

جو پنجدہ واقعہ کے بعد ضروری ہو گئی تھیں۔^۱

واقعہ پنجدہ کے وقت امیر عبدالرحمان والسرائے لارڈ ڈفرن کے ساتھ راولپنڈی میں ایک کانفرنس میں شریک تھا۔ امیر اپنے علاقے پر مزید روسی دست درازی سے خوفزدہ تھا اور اپنے علاقے کے شمال مغربی کونے میں صورت حال کو مستحکم کرنے کے لئے آنا ہی مضطرب تھا جتنے انگریز۔ لیکن وہ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ دو بڑی طاقتوں کے درمیان جنگ میں پھنس جائے اور برطانوی افواج کو دوبارہ اپنے ملک میں دیکھے۔ اس نے لارڈ ڈفرن سے کہا کہ پنجدہ روسیوں کے تصرف میں ہمارے دیا جائے بشرطیکہ وہ ذوالفقار جو وسطی افغانستان کی سطوح مرتفع کی حریاتی کلید تھا۔ افغانوں کے ہاتھ میں رہے۔ اس سے سینٹ پیٹرز برگ نے اتفاق کیا اور جنگ کا خطرہ ٹل گیا۔^۲

۱۰ ستمبر ۱۸۸۵ء کو ایک پروٹوکول پر دستخط کئے گئے جس نے علاقہ پنجدہ میں روسی افغان سرحد کی نشاندہی کر دی۔ جولائی ۱۸۸۶ء میں ستمبر کے پروٹوکول کے تحت ایک باؤنڈری کمیشن نے کام شروع کیا

۱۔ وارڈ اور گویچ، ایضاً جلد سوم، ص ۱۹۔

۲۔ عبدالرحمان، ایضاً، جلد اول، ص ۲۸۵۔ پارلیمنٹری پیپر ۱۸۸۶-۸۵

جلد ۸۷، سنٹرل ایشیا، ص ۲۳۹

کمیشن نے جون ۱۸۸۸ء میں اپنا کام پورا کر لیا اور اسی سال ۱۲ جون کو قطعی سرحدات کی تصدیق کر دی گئی۔

سرحد پامیر

اس کے بعد ”عظیم مقابلہ“ کی دھپسی کا مرکز مشرق اور شمال کی طرف منتقل ہو گیا۔ کشمیر، چترال اور گلگت کی ہندوستانی ریاستیں بدخشاں اور واخلان کے افغان صوبے اور بخارا کی زبردست روس حکومت سب عظیم سلسلہ پامیر میں ملتی تھیں۔ اب تک اونچی اونچی چوٹیاں اس علاقے میں کسی اہم سرگرمی کے راستے میں حائل رہی تھیں لیکن یہ سب پرواضح تھا کہ ”مقابلہ“ ختم ہونے سے پہلے انگریزوں کو یہاں روسی جیتی و سستی کا سامنا کرنا ہو گا۔

۱۸۹۱ء کے موسم خزاں میں ایک برطانوی محقق، کیپٹن ینگ، ہینڈ، وادی واخلان میں ایک روسی جماعت سے دوچار ہوا۔ اب واخلان بالائی سیحوں کا ایک معاون ہے اور پامیر عظیم کے عین جنوب اور ہمالیہ کے مشرقی سرے کے شمال میں ایک تنگ وادی سے گزرتا ہے۔ ینگ، ہینڈ کو روسیوں نے وہاں سے نکال دیا اور زور سے کہا کہ وہ اس علاقے کو اپنا سمجھتے تھے۔ عین اس وقت یہ اطلاعات

۱۔ پارلیمنٹری پیپرز ۱۸۸۵ء، جلد ۷۷، سنٹرل ایشیا نمبر ۱ ص ۳۲۳

۲۔ سرفریک ای ینگ، ہینڈ، وی ہارٹ آف اے کانٹیننٹ، لندن، جے مین (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بھی ملیں کہ روسی پارٹیاں چترال اور کشمیر کے نلک بوس پہاڑوں کے گرد بھی پھر رہی تھیں۔ نلک کی ایک فیلی ریاست، ہنزہ کے حکمران نے روس کی حمایت کا اعلان کیا تو ایک برطانوی ہم اس کا دماغ سیدھا کرنے کے لئے اس کے سر پر ہینچ گئی۔

لندن اور سینٹ پیٹرز برگ کے درمیان دوبارہ مذاکرات شروع ہو گئے۔ طرفین کے اخبارات میں ایک لمبی چوڑی جیھس بھیں اور سفارتی سطح پر لین دین کے بعد بالآخر مارچ ۱۸۹۵ء میں روس اور افغانستان کے درمیان سرحد پامیر پر اتفاق ہو گیا۔ افغانستان سرحدات کا آخری حصہ بھی متعین ہو گیا اور دو بڑی سلطنتوں کے درمیان

(بقیہ جاتے)

۱۸۹۶ء ص ۲۷۱ تا ۲۷۴ - معاملہ ہترین و کنڈریائی روایت کے مطابق کیا گیا بقول نلک، سینڈ، ایکب پھوڑے ہوئے ہیں سنے گورکھا محافظ سے روسی افسر کو سلائی دوائی اس کے بعد ہم جہاں سے اور کیشین گزرتے مجھ سے کہا کہ ہم پھر ملیں گے بصورت امن سینڈ پیٹرز برگ میں با بصورت جنگ ہندوستانی سرحد پر اور کوئی بھی صورت ہو میں ایکس پر تپاک استقبال کا یقین رکھ سکتا تھا۔ میں ایک روسی افسر سے اس ملاقات سے بہت لطف اندوز ہوا۔ ہم اور روسی حریف ہیں لیکن مجھے یقین ہے روسی اور انگریز افسر فرداً فرداً ایک دوسرے کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ بجائے ان اقوام کے افراد کے جو ان کے حریف نہیں ہیں ہم دونوں ایک بڑے مقابلے میں شریک ہیں اور ہم اس حقیقت کو چھپا کر ذرا بھر بھی اس سے مختلف نہیں ہو سکتے۔

وسط ایشیائی کشمکش ختم ہو گئی۔

انگریزوں کو اب افغانستان کے خارجی معاملات پر بلا شرکت
غیرے قابو حاصل ہو گیا جو ایک واضح بفر سٹیٹ بن گیا اور جسے روسوں
نے اپنے حلقہ اثر سے باہر قرار دیا۔ باقی سب کچھ روسیوں کا ہو گیا۔
”عظیم مقابلہ“ کا خطرناک ترین مرحلہ گزر گیا۔

صدی کے موڑ پر روسیوں نے آخری کوشش کی۔ یہ اصل میں ایک
پرانے سوال کا اعادہ تھا جو کشمکش کے ابتدائی مراحل میں بہت نمایاں
تھا یعنی افغانستان کے خارجی تعلقات پر خالص برطانوی تصرف اور روسی
۱۹۰۰ء کو جب انگریز افریقہ میں اکٹھے ہوئے تھے۔ روس نے اعلان کیا کہ
”سرحدی نظم و نسق کے معاملات کے بارے میں روس اور افغانستان کے
درمیان تعلقات کی بحالی ناگزیر ہے۔“

ایک لمبی سفارتی جنگ شروع ہو گئی۔ روس نے سیموں کے شمال
میں چھوٹے چھوٹے پیمانے پر فوجی نقل و حرکت کے ذریعے دباؤ ڈالنے
کی کمزور سی کوشش کی۔ حکومت ہند نے واسٹ رائے لارڈ کمرزن کے تحت
نیا صوبہ سرحد قائم کیا اور سرحد میں ایک نئی مختلف ابھرتی فوجی تنظیم

ڈاکٹر گریٹ برٹن، مدیران جی پی گوج اور ہیریٹ ٹیمپل ”برٹش ڈومینٹس اونی
اورینٹل آف دی وار“ ۱۸۹۷ء تا ۱۹۱۴ء ۱۰ جلدیں لندن، ہنز مجسٹریٹری آف

۱۹۲۸ء تا ۱۹۲۸ء جلد اول ص ۳۰۷ -

ظہور پذیر ہو گئی۔

لیکن خارجی دنیا کے واقعات نے اس آخری راؤنڈ کے نتیجہ کا فیصلہ کر دیا۔ افریقہ میں برطانوی فتح کے بعد یہ واقعات انگریزوں کے لئے سازگار بن گئے ۱۹۰۲ء میں اینگلو جاپانی معاہدہ اتحاد پر دستخط ہوئے ۱۹۰۵ء میں معاہدہ میں ترمیم کی گئی جس میں ہندوستان کے صوبہ سرحد کا خصوصی ذکر کیا گیا اور باہمی دفاع کی اصلی دفعہ کی بجائے ”دو یا زائد“ اقوام کے حملے کی صورت میں کارگر تھی۔ یہ دفعہ شامل کی گئی کہ کسی بھی طاقت کے خلاف متحدہ کارروائی کی جائے گی جو شریکان دستخط پر حملہ کرے گی۔

روس مزید انگ تھلگ ہو گیا جب فرانس جو یورپ میں زار کا واحد بڑا اتحادی تھا ۱۹۰۲ء میں برطانیہ کے ساتھ اتحاد تلاش میں شامل ہو گیا۔ ۱۹۰۵ء کی روسی جاپانی جنگ میں شاہی روسی حکومت کا یوواپن روسی وقار کو مزید بے ڈوبا۔

بالآخر ۲۱ اگست ۱۹۰۷ء کو سینٹ پیٹرز برگ میں ”ایران“ افغانستان اور تبت کے متعلق کنونشن“ پر دستخط ہو گئے۔ یہاں بھی برطانیہ نے اپنی مضبوط حیثیت کی بناء پر ذرا سی رعایت دیگر مغز اپنے ہی پاس رکھا۔ کنونشن نے روس کو یہ حق دے دیا کہ وہ مقامی سرحدی معاملات براہ راست افغان سرحدی افسروں کے ساتھ طے کر سکتا تھا۔ نیز اسے تجارتی اور دیگر سہولیات بھی دے دی گئیں۔

دروسی عبارات^۱ لیکن اہم نکتہ واضح طور پر بیان کر دیا گیا جس کا متن گورچ ٹمپیرلی (ایضاً جلد چہارم ص ص ۶۱۸ تا ۶۲۰) میں دیکھا جا سکتا ہے۔ روس پہلی جنگ افغان سے بھی پہلے سے افغانستان میں برطانیہ کی تجارتی اجارہ داری کے متعلق مسلسل شکایت کرتا رہا تھا لیکن دونوں سلطنتوں کو انیسویں صدی کے نصف اول میں وسط ایشیا کی منڈیوں کے متعلق خواہ کتنی بھی غلط فہمیاں کبوں نہ ہوں، ۱۹۰۷ء تک دونوں بخوبی آگاہ ہو چکی تھیں کہ یہ علاقہ تجارتی لحاظ سے بنجر اور غیر امید افزا تھا۔

x - تجویز ہے کہ مصنف اسی باب میں ایک دفعہ پہلے اور یہاں پھر تین اقتباسات خالص روسی زبان میں بلا انگلیزی ترجمہ دے دیئے ہیں اور فٹ نوٹ میں بھی صرف گورچ ٹمپیرلی میں متن کا حوالہ دے دیا۔ ہر کیف مفہوم قدرے روکا قناسا لیکن زیادہ تر فٹ نوٹ سے واضح ہو جاتا ہے جسے اصل ترجمہ میں ہی مثال کر دیا گیا ہے (مترجم)

(۱۱) باب ہفتم

بیسویں صدی میں

برطانوی نظم و نسق

کرزن کا نیا نظام!

۱۸۴۹ء سے صدی کے آخر تک سرحد میں ارباب نظم و نسق حکومت پنجاب کے سامنے جوابدہ تھے سوائے بعض سرحدی معاملات کے، جب وہ حکومت پنجاب کے توسط سے حکومت ہند کے سامنے جوابدہ ہو جاتے تھے۔

لارڈ کرزن وائسرائے نے ۱۹۰۱ء میں سرحد میں جو نیا نظام نافذ کیا اس نے نظم و نسق کو کافی حد تک آسان کر دیا۔ تمام اختیار ایک آدمی کے ہاتھ میں دے دیا گیا جسے صوبہ سرحد کا چیف کمشنر اور ایجنٹ ٹوڈی گورنر جنرل کہا جاتا تھا اس وقت تک ایک سرکاری پرنسپل ایجنٹ ایجنٹ ٹوڈی گورنر جنرل وہ تعالیٰ پولیٹیکل افسران کے ساتھ براہ راست ربط و ضبط کے ذریعے قبال کے ساتھ سیاسی تعلقات کا مہتمم ہے اور بحیثیت چیف کمشنر وہ پنجاب سے لئے گئے مزید انتظامی ضلاع میں

وہ فرائض ادا کرتے تھے جو حکومت پنجاب نے چھوڑے ہیں۔ تنظیم نو کے تحت پنجاب سے اضلاع کو باٹ، بنوں، ڈیرہ اسماعیل خان، ہزارہ اور پشاور علیحدہ کر دیے گئے۔ دائرہ الذکر بعد میں پشاور اور مردان ضلعوں میں تقسیم کر دیا گیا، کرزن ایک ہم آہنگ صوبہ قائم کرنے میں اتنی دیکھی رکھتا تھا کہ ہزارہ جس کی آبادی زیادہ تر غیر پٹھان تھی اس کی اصلی سکیم میں شامل نہ تھا۔ عیسائی خیل کی واحد تحصیل جس میں مخلوط النسل پشتون بولنے والے لوگ آباد تھے۔ ڈیرہ اسماعیل خان کے اوپر کے سندھ پار علاقوں میں سے پنجاب کے ساتھ رہ گئی۔

تنظیم نو نے پانچ سرحد پار مالاکنڈی علاقوں یعنی دیر، سوات اور چترال کے علاوہ خیبر، کرم، ٹوچی اور وانا، جن میں ماسوائے دیگران سرحد کے زیادہ سے زیادہ پٹھان حصے شامل ہوں، کو ایک رسمی شکل بھی دے دی۔ بڑا ب تک قبائلی علاقے کا انتظام ایک کچھڑی تھا۔ دسے کو کھلا رکھنے کے لئے ۱۸۷۸ء میں خیبر کے لئے ایک خصوصی پولیٹیکل ایجنسی قائم کی گئی تھی ۱۸۹۲ء میں ایک ایسی ہی ایجنسی کرم کے

۱۔ گریٹ برٹین، انڈیا آفس، اسٹیمٹ ایگنٹ ٹینک دی مورل اینڈ میٹریل

پرائس اینڈ کنڈیشن آف انڈیا ۲-۱۹۰۱ء، لندن ہنریٹز شینری

آفس، ۱۹۰۲

لئے وجود میں لائی گئی کو اسے ۱۸۷۹ء سے عموماً برطانوی ہند کا ایک حصہ تصور کیا جاتا تھا جب افغانوں نے اسے انگریزوں کے حوالے کیا تھا، مالاکنڈ، وانا اور ٹوچی کی ایجنسیاں ڈیویڈ لاس کی نشاندہی کے سلسلے میں ۹۶ - ۱۸۹۵ء میں قائم کی گئی تھیں۔ عجیب و غریب طور پر مالاکنڈ ایجنسی براہ راست حکومت ہند کے ماتحت تھی جبکہ وانا اور ٹوچی ایجنسیاں حکومت پنجاب کی حکم بردار تھیں۔

پہلا چیف کمشنر اور ایجنٹ ٹو دی گورنر جنرل لینفٹیننٹ کرنل ایچ۔ اے۔ ڈین تھا۔ اس کا عملہ مندرجہ ذیل پر مشتمل تھا (۱) آئی ایس آئی افسران (۲) حکومت ہند اور حکومت پنجاب کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے فوجی افسران (۳) پروانشل سول سرفٹنس (۴) ماتحت سول سروس کے افسران (۵) ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹس پولیس اور (۶) "مکینیکل سامیوں کے لئے خاص طور پر بھرتی شدہ افسران۔ پہلی دونوں قسموں کے لئے جو سامیاں مخصوص کی گئیں وہ یہ تھیں، چیف کمشنر اس کا سیکرٹری، اسسٹنٹ سیکرٹری اور اس کے پرسنل اسسٹنٹ، ریونیو کمشنر اور ریونیو سیکرٹری، ڈپٹی کمشنر اور پولیٹیکل ایجنٹ صاحبان، جوڈیشل کمشنر اور ڈویژنل سیشن اور ڈسٹرکٹ جج صاحبان۔"

۱۔ این ڈیو ایف پی (انڈیا) گورنمنٹ "ایڈمنسٹریشن رپورٹ آف وی این ڈیو ایف

برادرس ۱۹۰۱ء (پیشا ور گورنمنٹ پریس، ۱۹۰۲ء) ص ۱۳

علی میں فوجی آدمیوں کی حسب معمول بھاری فیصدی سے بھی زیادہ
تقریریں اس عام رجحان کا تسلسل تھیں جس کے مطابق آخری عشرے
میں فوج نظم و نسق میں روز افزوں اہم کردار ادا کرنے لگی تھی۔ اس
کو کمزور کرنے کے اس نظریے سے مزید تقویت ملی کہ سرحد ایک بہترین ٹریننگ
گراؤنڈ مہیا کرتا تھا۔ علاوہ ازیں خود پٹھانوں کا جنگجو کردار بھی اس کا
ممد و معاون ہوا۔ پشاور میں نظم و نسق کا قیام کم از کم اس وقت کے
محافظ سے ۳ لاکھ روپے کی درمیانی سی رقم پر ممکن ہوا۔
سیاسی ارتقاء کے لحاظ سے نیا نظام کئی باتوں میں پیچھے کی طرف
ایک قدم تھا۔ پنجاب سے لئے جانے والے پانچوں ضلع ۱۸۷۰ء کے ایک
ایکٹ آف پارلیمنٹ کے تحت ”شیڈولڈ اضلاع“ تھے لہذا وہ ہمیشہ
انتظامی احکامات کا پابند رہا تھا، لیکن پنجاب میں ۱۸۹۷ء سے ایک
قانون ساز کونسل قائم تھی جس کے ذریعے ہلکی سی عوامی نمائندگی
مشمولہ بن شدہ اضلاع ممکن تھی۔ تھیرنے یہ اور اس قسم کے دیگر
فوائد ختم کر دیئے اور سرحدی اضلاع واپس اسی صورتحال میں چلے
گئے جس کا سامنا پورے پنجاب نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے فوراً بعد
کیا تھا۔

ایک ایفٹنٹ گورنر اور کونسل کی بجائے انہیں ایک چیف
کمشنر اور پانچ ڈپٹی کمشنر ملے۔ پنجاب کے چیف کورٹ کے بدلے انہیں
ایک جوڈیشل کمشنر اور ایک ریونیو کمشنر ملا۔ پنجاب قانون ساز کونسل

کے منظور کردہ قوانین کی بجائے ان پر انتظامی احکامات سے حکومت ہونے لگی جنہیں گورنر جنرل یا چیف کمشنر کے اختیار پر جاری کیا جاتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ سیاسی فوائد جو اہل سرحد نے کھودے معمولی تھے اور قبائلی علاقے کے باسیوں پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بہر حال نائنویں حکومت اس وقت ہندوستان میں بہت ابتدائی شکل میں موجود تھی اور پٹھان جنوں نے بھی اپنے آپ کو ہندوستان کا حصہ نہ سمجھا تھا اپنا ایک علیحدہ صوبہ پا کر غالباً متفکر ہونے سے زیادہ ناتواں تھے کیونکہ اس نے ان کے جداگانہ احساس کو تقویت دی تھی اور قانونی شکل دے دی تھی۔

لیکن صوبے کی ہندو آبادی نے اس نئے اقدام کی سخت مخالفت کی اور وہ بعد کے کئی عشروں تک پنجاب کے ساتھ دوبارہ انضمام پر زور دیتے رہے، لیکن کمزوری کی اس سے بھی زیادہ متنازعہ غیر تقسیم بنگال کے برعکس سرحد میں نیا نظام ۱۹۵۵ء میں ہی ختم ہو سکا جب حکومت پاکستان نے سرحد، پنجاب، سندھ، بہاولپور، خیبرپور اور بلوچستان کو

۱۔ نئے صوبہ کے قیام کے قانون کے سیکشن ۱۲۳ میں صرف یہ درج تھا 'صوبہ سرحد کے لئے قانون ساز ادارے صرف دو ہیں گورنر جنرل کی قانون ساز کونسل اور گورنر جنرل ان ایگزیکٹو کونسل، دیکھئے این ڈی ایف پی ایڈمنسٹریشن رپورٹ ۱۹۰۱ء ص ۳۵'

۲۔ گورنمنٹ آف انڈیا رپورٹ آف دی اینڈیو ایف پی انکوائری کمیٹی (۱۹۳۴ء) ص ۲

ایک واحد صوبہ مغربی پاکستان میں ضم کر دیا۔

نیا صوبہ !

اپنے جغرافیائی محل وقوع کے علاوہ نیا صوبہ کئی باتوں میں ہندوستان میں اپنی مثال آپ تھا۔ یہ اقتصادی طور پر خسارے کا علاقہ تھا لیکن ان بہت سے سماجی و اقتصادی اسقام سے پاک تھا جو برطانوی ہند کے نظام دروہستہ کے قدیم تر حصوں کا روگینے ہوئے تھے۔ انیسویں صدی کے برطانوی ہندوہستہ ہائے اراضی نے زمینی ملکیتوں کے روایتی ڈھانچے کو کسی حد تک اٹھل پھیل کر دیا تھا لیکن پھر بھی چھوٹے چھوٹے زمینداروں کی خاصی بڑی تعداد اور بہت سے مستقل مزارعین موجود تھے جن کے حقوق بموجب رواج و قانون محفوظ تھے۔

اس کے ساتھ ہی سرحدیں انگریزوں کو جو گھنیر مسئلہ درپیش تھا وہ تھا تحفظ کا، سیموں اور پامیر کے پیرے سے روسی خطرہ کے خلاف تحفظ اور بہت سے قانون شکن باشندوں اور پہاڑیوں کے وحشیانہ قبائلیوں کے خلاف نئے صوبے کا تحفظ۔

برطانوی ہند کے اکثر دوسرے حصوں میں کسی مخصوص صوبے کا مطالبہ اس میں وقتاً فوقتاً جاری ہونے والی اصلاحات سے کیا جاسکتا ہے، جو ایک ایسی حکومت سے نافذ ہو رہی تھیں جو بادل ناخواستہ لیکن روز بروز بتدریج حکومت خود اختیاری کے عوامی مطالبے کے سامنے جھکتی

جاری تھی لیکن جہاں تک سرحد کا تعلق ہے پورے دور کا قصہ تفرق کے لئے جدوجہد کے گرد گھومتا ہے۔ ایک ایسا تفرق جو کبھی مکمل طور پر قائم نہ ہو سکا اور ایک ایسی جدوجہد جو ۱۹۴۷ء میں انگریزوں کے چھتے ہونے پر ہی ختم ہو سکی۔ اس سیاق و سباق میں برطانوی حکومت کے تحت سرحد کی سیاسی تاریخ اصلاحات کی بجائے کہیں زیادہ انتہائی و استعمالی نگہائے میل سے لٹک رہی ہے۔

فرنٹیر کراٹز ریگولیشنز

فرنٹیر کراٹز ریگولیشنز کا پہلا مجموعہ ۱۸۷۲ء میں نافذ کیا گیا ، ۱۸۸۷ء میں اس پر نظر ثانی کی گئی۔ ۱۹۰۱ء میں پنجاب سے علیحدگی کے بعد سرحد میں تیسرا مجموعہ نافذ ہوا۔ یہ قواعد و ضوابط کرنل نے صوبے اور قبائلی علاقے کے درمیان مخصوص تعلقات کی روشنی میں تیار کروا تھے اور یہ پورے برطانوی دور حکومت میں زیر عمل رہے۔ (سواٹ) چند مختصر اوقات معطلی کے اور آج بھی ترمیم شدہ شکل میں پاکستان میں جاری و ساری ہیں۔

مبجلہ دیگر دفعات کے ۱۹۰۱ء کے فرنٹیر کراٹز ریگولیشنز (نہیں) مندرجہ ذیل پر مشتمل ہیں۔ دیوانی اور فوجداری مقدمات کو ڈپٹی کمشنر کے مقرر کردہ جرم گوں کے سپرد کرنا، سزا کے طور پر قبائل کی ناکہ بندی، اجتماعی جرمائے، بعض حالات میں نئے دیہات کے قیام کی ممانعت

قائم شدہ دیہات کو امن و امان کے تقاضوں کے تحت ختم یا منتقل کرنا،
الساد جرم کے لئے پیشگی قید و بند اور دیہاتی جرموں کو منضبط کرنا۔
قرٹیز کرٹیز گولڈنیز میں شامل دو تصورات (جو نئے ہرگز نہیں
ہیں) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے پہلا مقدمے کی جرگائی سماعت
تھی جسے انگریز عموماً پٹھان روایت کا تسلسل بتاتے تھے لیکن بعض باتوں
میں یہ انگریزوں کی طرف سے اعتراف تھا کہ ان کا انیسویں صدی کا
طرز انصاف ناکافی تھا بالخصوص اس لئے کہ پٹھان اس کا کوئی لحاظ
نہ کرتے تھے۔ جرگہ بلا شک و شبہ ایک پٹھان ادارہ تھا لیکن ایف سی
آر کے تحت جو اس کی شکل تھی وہ اصل کے برعکس تھی۔

اولاً اس کے اراکین ضلع کا ڈپٹی کمشنر مقرر کرتا تھا اور وہ عموماً
اس وقت جب اسے یقین ہوتا تھا کہ وہ عام عدالتوں کے ذریعے اثبات
جرم حاصل نہ کر سکے گا۔ ہنمادت کے عام اصول معطل کر دیئے جاتے تھے
اگر ڈپٹی کمشنر چار یا زیادہ رکنی جرگے کے فیصلے کو پسند نہیں کرتا تھا تو وہ
مزید تفتیش کے رہا نڈ دے دیتا تھا یا ایک دوسرے جرگے کے سپرد کر دیتا
تھا۔ بہر حال جرگے کا فیصلہ بنیادی طور پر ایک سفارش کی صورت میں
ہوتا تھا اور ریت یا سزا دہی اور حکم ڈپٹی کمشنر کی طرف سے ایک ڈگری
کی صورت میں جاری ہوتا تھا۔

ایف سی آر کے تحت اثبات جرم اور سزا کے خلاف اپیل کا
حق نہ تھا گو چیف کمشنر کو اختیار تھا کہ وہ دیوانی اور بعض فوجداری

مقدّمے میں جرگے کے کسی مقرر کردہ رکن پر اعتراض کا حق رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ اسے یہ ضمانت حاصل ہوتی تھی کہ جرم کی نوعیت کا لحاظ کے بغیر زیادہ سے زیادہ سزا چودہ سال قید یا مشقت اور برطانوی ہند میں دوبارہ داخلے پر پابندی تھی۔

عمومی طور پر ایف سی آر صوبے پر بھی لاگو تھا اور قبائلی علاقہ پر بھی۔ لیکن آخر الذکر کا تعلق زیادہ تر اجتماعی ذمہ داری کے تصور کی علی شکل سے تھا جسے کوک اور ایڈورڈز نے نصف صدی پہلے پیش کیا تھا۔

اگر کوئی سرحدی قبیلہ یا اس کا کوئی سیکشن یا ایسے قبیلے کے افراد برطانوی حکومت یا برطانوی ہند کے باشندوں کے خلاف مظالم یا غیر دوستانہ کارروائی کریں تو ایسی صورت میں ڈپٹی کمشنر، کمشنر سے پیشگی منظوری کے بعد ذریعہ تحریر حکم دے سکتا تھا کہ

ا۔ ایسے قبیلے کے تمام یا بعض افراد کو پکڑ لیا جائے خواہ وہ کہیں ملیں اور ان کی تمام یا دستیاب جائیداد پر قبضہ کر لیا جائے۔

ب۔ ایسی جائیداد یا اثنا خاص کو سرکاری تحویل میں رکھا جائے۔

ج۔ ایسی جائیداد کو ضبط کر لیا جائے اور بعینہ منظوری کے

ساتھ اعلان عام کے ذریعے۔

۱۔ دیکھئے باب پنجم سابقہ۔

د۔ قبیلے کے تمام یا بعض افراد کو برطانوی ہند میں آنے سے روک دیا جائے اور

۴۔ برطانوی ہند کی حدود کے اندر رہنے والے تمام یا بعض افراد کو ایسے قبیلے یا اس کے سیکشن یا اس کے بعض افراد سے خط و کتابت یا رابطہ سے منع کر دیا جائے، خواہ وہ کسی عام یا خاص قسم یا قسموں کا ہو۔

یہ قانون متحرک فوجی دستہ یا قائم شدہ چھاؤنی دھڑوں کا انحصار اس بات پر تھا کہ اس وقت سرحدی پالیسی کا کونسا مکتب فکر غالب تھا، کی پشت پناہی کے ساتھ ہندوستان میں باقی ماندہ دور کے لئے برطانوی قبائلی پالیسی کی ریڑھ کی ہڈی تھا۔

۱۹۲۲ء کی مارٹن ویسٹ قرٹیر کمیٹی کے مطابق ”ایف سی آر“ سرحد پار سیکشنوں کو منسوخ کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ سرحد پار تصرف کے ہمارے پورے نظام کو مفلوج کر دیا جائے“^۱

ایف سی آر آج بھی قدرے ترمیم شدہ شکل میں پاکستان میں جاری و ساری ہے۔ اس کی قدر و قیمت ایک غیر منقطع حصے بیض کا موضوع بنی رہی ہے۔ برطانوی اور پاکستانی اہلکار دونوں اپنی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ یہ واحد ذریعہ ہے جس کی وجہ سے ایک قانونی ڈھانچے

۱۔ گورنمنٹ آف انڈیا ”رپورٹ آف دی این ڈبلیو ایف پی انکوائری کمیٹی“ ص ۲۷

کے اندر رہتے ہوئے شورش پسند بیٹاتوں میں کم سے کم مطلوب نظم و ضبط نافذ کیا جاسکتا ہے۔ اس کے برعکس بہت سے تعلیم یافتہ غیر سرکاری پٹھان اور بہت سے گمنام قبائلی جہنیں اس سے زک پہنچی ہے اسے اس بنا پر اڑے ہاتھوں لیتے ہیں کہ یہ نہ جمہوری ہے نہ منصفانہ اور نہ ہی پٹھان۔

آبادی اور مالیات :-

برطانوی دور میں سرحد کی آبادی تیزی سے بڑھتی رہی۔ زیر انتظام ضلعوں کی آبادی پہلی مردم شماری پر ۱۸۵۵ء (۴۲,۴۰۰) اور ۱۸۷۱ء (۱۱۰,۴۱۰) اور ۱۹۳۱ء (۲۵۰,۶۷۰) کے درمیان دو گنا سے زیادہ بڑھی قبائلی علاقے کے اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں

تعداد میں تبدیلی سے زیادہ دلچسپ بات یہ تھی کہ برطانوی نظم و نسق کے استحکام کے دور میں ضلعوں میں آبادی کے بہاؤ کا رخ بھی بدل گیا۔ ابتدائی سالوں کے قطعی اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ پوری انیسویں صدی میں ورود زیادہ تر حب محمول مغرب سے ہوا مثلاً ۱۸۹۱ء میں کل ۱۲۳۶۲۵ لوگ افغانستان اور قبائلی علاقوں سے ضلعوں میں آئے جبکہ اس کا صرف ایک تہائی ہندوستان سے یہاں وارد ہوئے۔ ۱۹۳۱ء تک واردان مغرب صرف ۵۵,۰۰۰ رہ گئے جبکہ نو واردان مشرق ۹۹,۴۸۴ ہو گئے۔ مشرق کے نسبتاً نرم لوگوں کی آمد کے باوجود

۱۔ دیکھئے مثلاً عبدالقیوم ”گولڈ اینڈ گنز آف دی پٹھان فریڈیر“ دیسی، ہند کتاب ۱۹۴۵ء ص ۱۵

۲۔ گورنمنٹ آف انڈیا سٹینس آف انڈیا ۱۹۳۱ء جلد ۱۱، کلکتہ سٹی سنٹر بریخ ۱۹۳۱ء

سرحدی آبادی میں حیرت انگیز جنسی تناسب زیادہ تر جوں کا توں رہا۔
۱۹۳۱ء میں بھی سرحد میں ہر ایک ہزار مردوں کے مقابلے پر ۳۴۸ عورتیں
ہیں۔ قبائلی علاقے میں یہ تناسب لازماً اور بھی شدید تھا۔
بڑھتی ہوئی آبادی کا اثر صوبے کے انتظامی اخراجات پر ہوا۔ اگر
باقاعدہ فوجی یونٹوں (جو سرحد میں تعینات ہوتے تھے) کا خرچ نکال دیا
جائے تو بھی میزانیہ کبھی متوازن نہ ہوتا تھا۔

عام طور پر بجٹ کے اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اچھے
سالوں میں بھی صوبائی انتظام کارآمد و خرچ کو برابر نہ رکھ سکتے تھے
اور ایک واحد صوبے سال جیسے ۳۱ - ۱۹۳۰ء میں ایک نہ بردست
خسارہ ہوا۔ بیسویں صدی کے پورے برطانوی دور میں دفاعی اخراجات
بجٹ پر حاوی رہے۔ تعلیم کا تو برا ہی حال ہوا۔ اضافہ پذیر آبادی
کے باوجود مالیہ اور ایکسائز ٹیکس غاصے مستقل رہے۔ ۱۹۳۰ء کے
حاتی ٹمک مرکزی حکومت کو کھلم کھلا بیچ میں آکر کل آمدنی کا
نصف سے زیادہ مہیا کرنا پڑا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ سیاسی اخراجات
بھی بجٹ سے ہٹا دیے گئے لیکن پھر بھی یہ متوازن نہ ہو سکا۔
(گوشوارہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

قبائلی پالیسی:- جب کرن جنوری ۱۸۸۹ء میں ہندوستان پہنچا

تو اس نے فارورڈ پالیسی کو غائب پایا۔ پانچ مسلح برطانوی انگلیاں،
مالا کنڈ، خیر، کرم، ٹوچی اور وانامیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ ساتھ
۱۸۹۷ء کی عظیم بغاوت کی وجہ سے ۱۰ ہزار سے زیادہ فوجی بکھرے ہوئے

صوبہ سرحد کے محاصل و مصارف

سال	محاصل	مصارف	نقصان
۱۹۰۲-۰۳	۲۳۱۳۸۰۷ روپے	۵۱۸۴۷۰۵ روپے	۱۸۷۰۸۹۸ روپے
۱۹۱۷-۱۸	۹۱۵۴۶۰۸	۹۸۴۹۶۹۴	۶۹۵۰۸۶
۱۹۲۰-۲۱	۶۹۷۴۶۷۹	۱۲۹۰۶۸۱۷	۲۹۹۳۲۱۳۸
۱۹۳۸-۳۹	۱۸۷۰۵۰۰۰	۱۸۶۱۶۸۰۰۰	۶۶۳۰۰۰

۱۹۰۲-۳ کی رقوم میں بعض مقامی فنڈ شامل نہیں ہیں جو ۱۹۱۷-۱۸ اور بعد ازاں

محاصل و مصارف کے چیدہ چیدہ نتائج شامل ہیں

سال	محاصل	مصارف	نقصان
۱۹۲۰-۲۱	۱۸۷۰۵۰۰۰	۱۸۶۱۶۸۰۰۰	۶۶۳۰۰۰
۱۹۳۰-۳۱	۱۸۷۰۵۰۰۰	۱۸۶۱۶۸۰۰۰	۶۶۳۰۰۰
۱۹۳۸-۳۹	۱۸۷۰۵۰۰۰	۱۸۶۱۶۸۰۰۰	۶۶۳۰۰۰
آئینہ	-	-	-
اشامپ و اکسٹنڈ	۲۲۰۰۰۰۰	۱۷۰۰۰۰۰	-
گراؤنٹ اینڈ	-	-	-
(حکومت ہند)	-	-	-

۱- دیکھئے باب چہارم سابقہ

تھے۔ چھوٹے چھوٹے قائم کردہ یونیورسٹیاں اور یونیورسٹیاں کے یونیورسٹیاں پاش پاش ہو چکے تھے اور برطانیہ سرحد پر اپنی گرفت کے لئے صاف طور پر اور محض مسلح طاقت پر منحصر تھا۔

نیا وائسرائے وسط ایشیاء کا بیسٹ علم اور عالمی سیاست میں گہری دلچسپی رکھتا تھا اور قبائلی پالیسی کے متعلق اس کا اپنا نظریہ تھا۔ بنیادی طور پر یہ ایرانی بند سرحد پالیسی کی طرف مراجعت تھی لیکن قبائلی علاقہ کو محتاط طور پر ایک سرحدی سرزمین کی باقاعدہ شکل دے کر۔

مذکورہ ۱۹۰۲-۱۸-۱۹۱۴ء ۱۹۲۰-۲۱ء ۱۹۳۸-۳۹ء
مصارف

پروٹیکٹ ۲۰۹۷۱۰۶ / ۴۶۲۲۶۱۶ / ۳۰۰۲۳۸۲ / —

واپس اینڈ وارڈ - - ۱۵۱۶۱۷۹۹ -

پولیس ۱۰۶۷۱۰۴ ۲۵۷۱۸۸۱ - ۳۳۲۸۰۰۰

اینڈ انٹرف ۵۸۴۰۸۴ ۱۰۳۲۳۲۷ ۱۴۴۲۵۹ ۱۶۹۶۰۰۰

تعلیم ۲۹۹۹۸۷ ۵۹۳۶۸۲ ۲۰۶۳۳۹۹ ۲۲۲۵۰۰

(دونوں جدول کی رقوم اینڈ یو ایف پی اینڈ منسٹریشن رپورٹ ۱۹۰۲ء)

ستمبر ۱۹۲۹ء سے ماخوذ ہیں)

وزیرستان کرم اور خیبر میں نئے ملیشیا منظم کئے گئے، یونیورسٹی

۱۔ پارلیمنٹری پیپر، ۱۹۰۱ء، جلد ۴۹، اینڈ یو ایف، ۴۹۶، ۷۲، نیز دیکھئے

کرزن کے رومانیزیکر آف ۱۹۰۷ء

بھی تنظیم نو کی گئی تاکہ بلیشیا کے ڈھیلے ڈھالے امدادی بازو بن سکیں۔
۱۹۰۴ء تک تمام باقاعدہ فوجی (سوائے زیریں چترال میں دروش پر
متعین ایک چھوٹے سے یونٹ کے) انتظامی سرحد کے عقب میں واپس
بلالے گئے اور قبائلی علاقے کا تحفظ مشہور بلیشیا یونٹوں جیسے خیبر رائفلز
سامانہ رائفلز اور ٹوپچی سکاؤٹس کے سپرد کر دیا گیا۔

وظائف بڑھا دیے گئے اور بلیشیا یونٹوں کے لئے رسل و رسائل
اور محل و نقل کے نظام کے ارتقاغ نے قبائل کے لئے محنت مزدوری کا
سامان پیدا کر دیا۔ پولیٹیکل ایجنٹس کو اپنی اپنی ایجنسی پر قریباً مکمل
ذمہ داری دے دی گئی اور وہ براہ راست ایجنٹ ٹوڈی گورنر جنرل سے
رابطہ رکھنے لگے۔ بلیشیا بھی انہی کی ذمہ داری بن گئی اور باقاعدہ فوجی
یونٹوں کی سرگرمیاں زیر انتظام ضلعوں تک محدود ہو گئیں۔

۱۹۰۱-۲ء میں درہ کوہاٹ سے ایک سڑک مکمل کی گئی جو
پیر شہر آدم خیل آفریدیوں کا گھر تھا اور کوہاٹ تا پشاور کا سفر
صرف چند گھنٹوں میں طے ہونے لگا۔ اگلے دو سالوں کے اندر ریل روڈ
کی شاخیں درگئی دمالا کنڈ میں مقام داخلہ سے نیچے) اور قلعہ جمروہ
دخیبر میں مقام داخلہ سے باہر) تک بڑھا دی گئیں۔ وادی کرم کی
نہر دن بہر واقع تھل کو بھی ایک تنگ پٹری کی لائن کے ذریعے سندھ
سے ملا دیا گیا۔

کمرن کا مقصد یہ تھا کہ قبائلی علاقے کو حتی الامکان اپنے ہی ڈھب

پر چلنے کی اجازت دی جائے بلکہ اس کے لئے حوصلہ افزائی کی جائے۔ وہ سمجھتا تھا کہ فوج کے اشتعال کو ہٹانے سے مقامی شورشوں کے امکانات کم ہو جائیں گے اور باقاعدہ فوج اپنے اصلی فرض پر مرکوز رہ سکے گی، یعنی ڈیورنڈ لائن کے پرے سے حملے کے خلاف دفاع ہند۔ اگر کوئی ایسی قبائلی بغاوت رونما ہو جائے جو ملیشیا کے بس کی نہ ہو تو فوج جس کی یونٹیں ضلعی چھان بینوں میں مرکوز تھیں نئے موصلاتی نظام کے بل بوتے پر مرکز شورش میں جلدی پہنچ کر اسے کچل سکتی تھی۔

ابتدائی طور پر کرنل کا نظام سرحد میں نسبتاً امن و تحفظ کا دور لایا۔ اس نے فوجی سرگرمی پر ہونے والے بے تحاشا خرچ کو بھی بہت کم کر دیا جو عشرہ آخری کے نصف آخر میں کیا جاتا تھا۔ کرنل ہندوستان سے روانگی کے وقت فخریہ یہ کہہ سکا کہ اس نے اپنے سات سالہ دور حکومت میں صرف ۲۸۰۰۰ روپے خرچ کیا تھا جبکہ سابق پانچ سالوں میں یہ ۴۵۸۴۰۰۰ روپے خرچ کیا تھا۔

کرنل پالیسی ۲ - ۱۹۰۱ء کی چھوٹی سی محمود بغاوت اور ۱۹۰۸ء کی زکاخیل آفریدی اور مہمند شورشوں سے کامیابی سے گزر گئی بلکہ پہلی جنگ عالمگیر کو بھی کامیابی سے پار کر گئی۔ غالباً زیادہ تر اس لئے کہ آفریدیوں کے وظائف دو گنا کر دیئے گئے تھے اور افغانستان کے امیر

نور احمد - موجد راجپوت - سی اے چودھری اور کے دتا، "این ایڈوانسڈ ہسٹری

آف انڈیا (ننڈن میکین ۱۹۴۶ء) ص ۹۰۲

حبیب اللہ کارویہ نسبتاً دوستانہ رہا۔ روس کی شکست، سکاٹش میں جرمن افواج اور ایران میں ترک افواج کی پیش قدمی کوئی بغاوت برپا نہ کر سکی حالانکہ کئی ہندوستانی مسلمان جو خلافت عثمانیہ کے خلاف برطانوی جنگ پر براہِ گنجہ تھے، سید احمد کے باقیات سے مل کر قبائلی علاقے میں بل چل پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ جب قبائل نے ساتھ نہ دیا تو یہ عناصر کا بل چلے گئے اور وہاں جرمن اور ترک مشنوں کے ساتھ مل کر ہندوستان میں بغاوت کی ناکام کوشش کرتے رہے۔

تیسری جنگ افغان!

مئی ۱۹۱۹ء میں نئے امیر افغانستان امان اللہ نے متحدہ بھارت (جو کچھ زیادہ باورِ آفریں نہ تھے) و جوہات کی بناء برطانوی ہند کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ اس مقام پر آکر جیسا کہ انگریزوں نے کھلے دل سے اعتراف کیا، کہ زنی نظام بہت سے قدیم تر اور شاندار اداروں کی طرح اس زبردست دباؤ کے تحت ٹوٹ گیا،^x

فوراً ہی دورِ دور تک قبائلی بغاوتیں پھوٹ پڑیں جب افغان کمانڈر جنرل تادر خان (جو بعد میں نادر شاہ بن گیا) غیر متوقع طور پر وادیِ کرم کی گردن پر واقع تھل میں ایک فوج کے ساتھ نمودار

^x - مورل اینڈ میٹریٹل پراگریس آف انڈیا، ۱۹۲۸ء، ص ۲۶۹

ہوا تو یلتیا کا نظا پور سے سرحد میں چٹکا چور ہو گیا ۔ خیبر راٹلز اور
 ٹوچی اور دانا سکاؤٹس کے بڑے حصوں نے بغاوت کر دی اور مغربی
 وزیرستان کا بیشتر حصہ افغانوں کے سپرد کر دیا گیا جنہوں نے مختصر عرصے
 کے لئے دانا پر قبضہ کر لیا۔ مہمند اور آفریدی لشکرہاں نے خیبر بند کر دیا
 اور قبائلوں نے نوٹ مار کی امید پر خوشی سے اپنے وظائف چھوڑ دیئے۔
 قبائل علاتے کا بیس سال سے زیادہ پرانا لیکن کمزور تصرف رات ہی
 رات میں ختم ہو گیا ۔

افغانوں کے ساتھ جنگ تین میں سے واحد جنگ تھی جس میں
 انگریزوں نے بارحانہ حملہ نہیں کیا تھا اور انہیں یقین نہیں تھا کہ وہ واقعی
 روسیوں سے لڑ رہے تھے خاصی آسانی سے فیسندہ پذیر ہو گئی، نادرخان
 کو قتل سے بھگا دیا گیا اور افغانستان پر برطانوی حملے کے خوف کی وجہ
 سے افغان فوج وزیرستان سے واپس چلی گئی۔ رائل ایئر فورس کے
 ایک بھاننے کابل پر ایک بم گرایا تو امان اللہ کو یقین ہو گیا کہ جنگ
 ختم کرنا ہی بہتر تھا، ۸ اگست ۱۹۱۹ء کو معاہدہ راولپنڈی پر دستخط
 ہوئے اور اس کے تحت جنگ بند کر دی گئی اور برطانیہ نے افغان امور
 نارجہ پر اپنی گرفت ختم کر دی۔ دو سال کے مذاکرات کے بعد ۱۹۲۱ء
 کے اینگلوفغان معاہدہ نئے متعلق کو آخری شکل دیدی گئی

۱۔ متن "کرپشن آف رولپنڈی" ایڈمنسٹریٹو رولپنڈی، ٹرانڈیا اینڈ نیٹرنگ کنستریٹ
 (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

لیکن جنگ افغان کی پیدا کردہ قبائلی بغاوت نہ آئی آسانی سے
دبائی جاسکی اور نہ ہی اتنے پُسامن طور پر ۱۹۱۹ء کے موسم خزاں میں
برطانوی رعب داب قبائلی علاقے سے ایسے ہی غائب ہو گیا جیسے
گدھے کے سر سے بینگ۔ دہلی اور لندن سخت مضطرب تھے کہ اسے
دوبارہ قائم کر دیا جائے۔ پیشتر اس کے کہ امان اللہ اپنا تیاں بدل دیا
نیا خوفناک بالشویک روسی خطرہ اس خطہ سے فائدہ اٹھانے کے قابل
ہو جائے معمول کا طریقہ اختیار کیا گیا اور ۲۰-۱۹۱۹ء کی سردی میں
ایک بڑی برطانوی فوج سرش قبائل کے خلاف روانہ کر دی گئی۔
درٹائی کا حال آئندہ باب نہم میں بیان ہوگا۔ اس کارروائی کے
قریباً ساڑھے سڑکیں تعمیر کر کے دانا، رزمک اور میرانشاہ کو ملا دیا
گیا۔ رزمک اور دانا میں بڑے بڑے مستقل کیرٹین تینت کر دیے
گئے اور ملیشیا کے نظام کو از سر نو منظم کیا گیا۔

نئی تحفظاتی افواج! سکاؤٹ، خاصا دار اور فرٹیر کمانڈری
اسی نظم نو کے تحت وجود میں آئیں۔ افواج ہند کی رجمنٹوں کے برطانوی
افسروں کے تحت ایک ایک سکاؤٹ یونٹ ہر ایجنسی کے ساتھ منسلک
(ایقہ حاشیہ)

مؤلف سی۔ یو۔ ایچمین (حکومت سنٹرل پبلی کیشنز برائین ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۳ء جلد ۱۲)
ص ۲۲۲ پر دیکھیے۔ جسے آئندہ ایچی سن کہا جائے گا۔

کر دیا گیا۔ مستقبل میں سر تا پا فرار کو روکنے کے لئے ایک تہائی سے زیادہ سکاؤٹ قبائلی علاقے سے نہ لئے جاسکتے تھے۔ سکاؤٹوں کے اہم فرائض یہ تھے کہ وہ قبائلی علاقے میں برطانوی سیاسی گرفت قائم رکھیں اور وہاں کم سے کم مطلوب نظم و ضبط برقرار رہے تاکہ اضلاع پر چھاپوں کا تدارک ہو سکے۔ ۱۹۲۱ء میں سرحدی ایجنسیوں کے سکاؤٹ یونٹوں کی کل نفری ۶۸۵ تھی۔^۱

بہمنڈیشیا یونٹ سرسمر منتشر کر دیا گیا اور اس کی جگہ فرنٹیر کانسٹیبلری نے لی۔ جو ایک قسم کی صوبائی سیکورٹی پولیس تھی۔ کانسٹیبلری کے فرائض یہ تھے کہ قبائلی علاقوں سے خصلوں پر چھاپوں کو زیر کر لیں۔ اشتہاری مجرموں کو پکڑیں اور سڑکوں اور مواصلات کو زیر گشت و نگاہداشت رکھیں۔ اس کے افسران امپیریل انڈین پولیس سے لئے جاتے تھے جنہیں اپنی سروس سے یہاں منسلک کیا جاتا تھا۔ کانسٹیبلری زیر انتظام اضلاع کے کونوں پر اپنی چڑکیاں بناتی تھی اور اسے ضرورت کے تحت قبائلی علاقے میں بھی کارروائی کا اختیار تھا۔ اس کا حجم بتدریج بڑھتا رہا حتیٰ کہ ۱۹۳۰ء میں یہ ۱۱۲ انفنٹری اور ۳۵ سوار انفنٹری پر مشتمل ہو گئی۔ پُر امن سائون میں بھی کانسٹیبلری مصروف رہتی تھی اور مقتولین و مجرمین کی تعداد کافی ہوتی تھی مثلاً ۱۹۲۷ء

^۱ این ڈی ایف پی ایڈمنسٹریشن رپورٹ ۱۹۲۱ء ص ۱۰

جس میں ۲۹، ۲۸ - ۱۹۲۸ء میں ۱۵۱۲ اور ۳۰ - ۱۹۲۹ء میں ۳۵

مارے گئے مریض ہوئے

و طبقہ خوار قبیلے کے مطالبے پر آدمی مہیا کرنے کا پیرانا، الٹا
طریقہ ایک باقاعدہ خاصہ دار نظام کے ذریعے مضبوط کر دیا گیا جس
کے تحت مقامی ملک کے نامزد کردہ آدمی اس لئے بھرتی کئے جاتے تھے
کہ وہ رٹکوں کی حفاظت کریں، مسافروں کی حفاظت کا ذمہ لیں اور
قبائلی علاقے میں ایسے دیگر فرائض بحال لائیں جو پولیٹیکل ایجنٹ چاہتا
تھا۔ خاصہ دار اپنا اسلحہ خود لاتے تھے اور عام طور پر سکاٹوں یا کاسٹری
سے زیادہ تنخواہیں لیتے تھے تاکہ بہترین آدمی مل سکیں اور وہ نقصان
مایہ کے خوف سے اچھے رویہ کے پابند ہو سکیں۔ ۱۹۲۸ء میں درہ کوٹ
میں ۱۱ اور وزیرستان میں ۳۵ سو خاصہ دار تھے۔

زیر انتظام اضلاع کے بہت سے دیہات میں چغا یعنی تعاقب
پارٹیاں بھی قائم کی گئیں۔ ان کا قانونی فرض تھا کہ یہ گاؤں پر حملہ
کرنے والے چھاپہ ماروں کا مقابلہ کریں اور ان کا پیچھا کریں۔ حکومت
ہر گاؤں کو سائفلوں اور بارود کی ایک خاص تعداد مہیا کر
دیتی تھی۔ دیگر دیہات میں رضا کارانہ پولیس فورس قائم کر دی گئی

۱۔ ایضاً ص ۱۴

۲۔ ایضاً ص ۲

جس کی کان مقامی خوانین کرتے تھے۔ انہیں تربیت یا کارروائی کے دوران اسلحہ اور بارود بھی ملتا تھا اور تنخواہ بھی۔

رزک پالیسی!

نئے نظام کا اہم ترین پہلو دانا اور رزک میں بڑی بڑی چھاؤنیوں کی تعمیر تھا تاکہ وزیرستان بالخصوص محسود علاقہ پر گرفت رہے۔ ترمیم شدہ فارورڈ پالیسی کو جس نے سوزن کی ترمیم شدہ بند سرحد پالیسی کی جگہ لی اکثر و بیشتر رزک پالیسی کہا جاتا تھا۔ نظری طور پر یہ وزیرستان تک محدود تھی اور قبائلی علاقے میں باقاعدہ فوج کے دوبارہ داخلے کا حوالہ یہ پیش کیا جاتا تھا کہ جنوب کے متلون مزاج اور نراج قبائل اپنے علاقے میں کسی قسم کے نظم و ضبط کے اہل نہ تھے لیکن اصل بات یہ تھی کہ برطانوی دست و بازو انتظامی سرحد سے پرے پرے قبائلی علاقہ میں پھیلے رہے اور ۱۹۲۱ء میں پشاور کو قلعہ جبرود سے ملانے والی ریل کی پٹری خیبر کے بیچ میں سے لنڈی کوتل تک بڑھا دی گئی۔

۱۹۲۲ء میں نارمٹھ ویسٹ فرنٹیئر انکوائری کمیٹی نے بھی رزک پالیسی پر مہر تصدیق ثبت کر دی جو حکومت ہند کے نارن سیکرٹری سر ڈینس برے کی صدارت میں کام کر رہی تھی۔ اسے پرامن نفوذ یا ”اندر سے گرفت“ کا نام دیا گیا اور یہ آخر تک برطانوی قبائلی پالیسی کا بنیاد بنی رہی۔

ابتداء میں نئی پالیسی کامیاب رہی۔ پولیٹیکل ایجنٹس و طائف اور سکاوٹوں اور خاصہ داروں کی تقریریں اپنی مٹھیوں میں لئے ہوئے اور قریب ہی باقاعدہ مضبوط اور مجتمع افواج کے بل بوتے پر قبائل سے ایک طاقتور فریق کی حیثیت سے معاملات کر سکتے تھے۔ قبائل میں افغان ریشہ دوانیاں اس لئے کم ہو گئیں کہ نئے بادشاہ امان اللہ نے اپنی توجہات اپنے ملک کو جدید بنانے پر مرکوز کر دیں۔ نیز ۱۹۲۱ء کے معاہدہ کے تحت کسی حد تک ایٹکوا افغان تعاون بھی شروع ہوا کیونکہ اس میں ایک شرط تھی کہ افغانستان اور برطانوی ہندوؤں ایک دوسرے کو ڈیورنڈ لائن کے دونوں طرف کے سرحدی قبائل کے خلاف اہم نوعیت کی فوجی کارروائیوں کی پیشگی اطلاع دیں گے۔

نتیجہ "پیرامن تیسرا عشرہ" کی صورت میں ظاہر ہوا جس کے دوران کوئی بڑی بغاوت نہیں ہوئی اور قبائل میں کچھ ایسے آثار پائے گئے گویا انہوں نے اپنی سرزمین میں سڑکوں اور برطانوی دستوں کے منظر کو قبول کر لیا ہے لیکن اس عرصے میں "دو ایسے واقعات ہوئے جو تاریخ اور لوک ریت میں اپنے مقام کی وجہ سے قابل ذکر ہیں۔

سوات کا استحکام

پہلی جنگ عالمگیر کے بعد کے سالوں میں میاں گل، گل شہزادہ عبدالودود نے وادی سوات میں اپنی طاقت کو مستحکم کرنا شروع کیا۔ وہ انخوند سوات کا پوتا تھا جس نے سید احمد کے حق میں اور خلاف آتا اہم کردار ادا کیا تھا۔ اپنے موروثی تقدس کی بناء پر حیرت انگیز انتظامی اور حربیاتی قابلیت سے کام لیتے ہوئے اس نے دریائے سوات کے مشرقی کنارے کے قبائل کو ایک مضبوط وفاقہ میں منظم کرنا شروع کیا جن میں سے اکثر نواب دیر کے وفادار تھے۔ اس نے وادی سوات کے بالادہست میں قلعوں کا ایک سلسلہ تعمیر کیا اور انہیں ٹیلیفون سے ملا دیا۔

اپریل ۱۹۲۳ء میں میاں گل نے بنیر میں ایک لشکر بھیجا جس پر اٹک کے اوپر دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹی سی ریاست امب کا نواب اپنا مہم ساقی جتاتا تھا۔ نواب نے چیلنج قبول کیا اور اپنے پیروؤں کا ایک لشکر بھیجا۔ ۱۶ اگست کو ایک اچھی خاصی لڑائی ہوئی جس کے دوران برطانوی حکام نے احتیاطاً دوسرا راستہ بند کر دیا اور بنیر میاں گل کے قبضے میں چلا گیا۔ اس کامیابی سے حوصلہ پا کر اس نے امب اور دیر کے دوسرے حصوں پر بھی قبضے کی ٹھانی، لیکن انگریزوں نے نہایت کامیابی سے اس کی توجہ پہلے سے مقبوضہ

علاقہ کی ترقی کی طرف منعطف کرا دی اور ۱۹۲۶ء میں میاں گل کو سید و شریف کے ایک دربار میں باقاعدہ والی بنا دیا گیا جو اس کا چھوٹا سا خوبصورت دارالحکومت تھا۔

والی نے قانون شکنوں کو اپنی ریاست میں پناہ دینے سے انکار کر دیا۔ اپنے شہریوں کے اسلحہ پر قابو رکھا، ایک چھوٹی سی فوج بنالی اور بہت سے سکول قائم کئے۔ وہ قبائلی ذمہ داری کا ایک نمونہ بن گیا اور چوتھے عشرے میں انگریزوں کی شہ پر سرحد کشمیر تک براستہ سندھی کوہستان اپنی حکومت پھیلانے میں کامیاب ہو گیا۔ قیام پاکستان کے تھوڑا عرصہ بعد ضعیف والی رضا کارانہ طور پر دستبردار ہو گیا اور اب ریاست اس کے بیٹے جہانزیب کے تحت ہے اور اب بھی ایک وحشیانہ قبائلی علاقے کے بیچ میں حسن کارکردگی اور ترقی کا ایک عجوبہ ہے۔

ایلیس کیس!

تیسرے عشرے کا مشہور ترین واقعہ ۱۱ اپریل ۱۹۲۳ء کی صبح کو کوہاٹ چھاؤنی سے آفریدیوں کے ہاتھوں ایک نوجوان انگریز لڑکی مولیٰ ایلیس کا اغواء تھا۔ برطانوی نسائیت کی اس توہین نے ہندوستان و انگلستان کے بے شمار انگریزوں کے دلوں میں متشددانہ احساسات پیدا کئے، نئی جارحانہ رزمک پالیسی کے ساتھ ہی ہونے

کی وجہ سے اس انجوائے پٹھانوں اور انگریزوں کے تعلقات میں مناقشتہ اور بد اعتمادی پیدا کر دی جو ۱۹۱۴ء تک جاری رہی لیکن ایلنس کیس دھچپ بھی ہے کیونکہ اس میں یہیچیدہ پٹھان سیاست و توقعات کا اندازہ منعکس ہوتا ہے۔

فروری ۱۹۲۳ء میں کوہاٹ کی برطانوی چھاؤنی سے ۴۶ میل نفیس چہرالی گئیں۔ چوری کا سراغ عجب خان نامی ایک بوستی خیل آفریدی کے دروازے تک پہنچا جس کا گاؤں قبائلی علاقے میں درہ کوہاٹ کے پہلو میں تھا ۵ مارچ کی صبح کو فرنیئر کا ٹیبلر نے سرحد کے ایک مشہور ترین پولیس افسر مسٹر مینڈی سائیڈ کی کمان میں اور باقاعدہ فوجیوں کی رفاقت میں عجب کے گاؤں کا محاصرہ کر لیا۔

تلاشی سے ۲۳ گمشدہ رائفیس، کچھ اور مسروقہ مال اور گاؤں میں چند پناہ یافتہ قانون شکن برآمد کر لئے گئے۔ عجب خان خود چھاپے کے دوران غیر حاضر تھا۔ سرکاری ریکارڈ کے مطابق کارروائی قبائلی احساسات کا پورا لحاظ کرتے ہوئے کی گئی۔ لیکن مشہور یہ ہو گیا اور آج بھی اس کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے کہ کچھ دیہاتی خواتین کی بھی تلاشی لی گئی اور ان کی توہین کی گئی۔

ڈ- این ڈبلیو ایف پی دائریا، رپورٹ آف انڈینسٹریشن آف دی بارڈر آف دی اینڈیمیر ایف پی ۲۳-۱۹۲۲ء وڈ پشاور گورنمنٹ پریس ۱۹۲۸ء ص ۵

عجب چند ہفتے اس توہین پر غور کرتا رہا اور پھر اس نے اپنی مستورات اور رشتہ داروں کے اکسانے پر ۱۲ اپریل کو کوہاٹ پر چھاپہ مارا۔ ایک انگریز افسر کی بیوی، مسٹر ایلس ماروی گئی اور اس کی قریباً ۱۱ سالہ بیٹی مولی اغواء کر لی گئی۔

ایک ناکام تعاقب اور پیچیدہ سلسلہ مذاکرات کے بعد دو بیٹھان پولیٹیکل افسروں، رسالدار مغل باز خان اور خان بہادر قلی خان اور ایک مقامی انگریزی مشن کی مسٹر سٹار کی مساعی کی بدولت ایلس صحیح سالم واپس کر دی گئی۔

اس کے بعد جو کچھ شروع ہوا وہ ان مسائل کی ایک عمدہ مثال تھا جو سرحد پر انصاف کے رستے میں حائل ہیں۔ عجب خان اور اس کے ساتھی مجرم سلطان میر اور گل اکبر جو باپ بیٹا تھے، پہاڑیوں میں سے فرار ہوئے اور دوستانہ قبائلیوں کے ہاں پناہ لیتے رہے۔ ناکہ بندی اور وظائف کی معطلی کی سخت دھمکیوں کی وجہ سے خیبر کے آفریدیوں اور اورکزئیوں نے ۱۲ مئی ۱۹۴۳ء کے جرگہ میں گواہی گروہ کو اپنے علاقہ سے نکلنے پر اتفاق کر لیا۔ مفروضہ سرحد پار افغانستان میں شتواریوں کے ہاں پناہ کے لئے چلے گئے۔

ابتداءً نومبر میں جب ابھی ان کو پکڑنے کی ہر کوشش جاری تھی وہ واپس قبائلی علاقے میں آئے۔ تھوڑے دنوں بعد ایک کیپٹن اور مسنروائٹس وادی کریم کے سر پر واقع پاڑہ چنار میں قتل

کر دیئے گئے۔

ایسے حالات میں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ گھناؤنا جرم کو باٹی
گروہ کی کارستانی تھی، تعاقب تیز کر دیا گیا اور جنوری ۱۹۲۲ء میں
عجب نے اپنے کو افغان گورنر جلال آباد کے حوالے کر دیا۔ وہ اور اس
کا گروہ بمعہ اہل و عیال کابل بھیج دیئے گئے حالانکہ انگریزوں نے ان کی
حوالگی کا مطالبہ کیا تھا اور پشاور کے بعض افسروں نے بین الاقوامی
طریقوں کا سہارا لئے بغیر جلال آباد جا کر اسے واپس لانے پر آمادگی ظاہر
کی تھی۔ افغان حکومت اگر چاہتی بھی تو بھی وہ مفروضہ کورائے عامہ
کے دباؤ کے تحت واپس نہ کر سکتی۔ لہذا اس نے یہ مشہور کر دیا کہ
عجب اور اس کا خاندان ہندوکش سے پرے نظر بند کیا جا رہا تھا اور
اسے فزار شریف کے قریب زمین دے دی گئی۔

مبینہ طور پر سردار میر اور گل اکبر افغان ہدایات کے تحت
خفیہ طور پر سرحد سے واپس آ کر تیرہ میں رہنے لگے ۱۹۲۵ء اور ۱۹۲۶ء
اور ۱۹۲۷ء میں ان کی تلاش جاری رہی۔ بالآخر گل اکبر پکڑا گیا اور
وہ ۲۹ مئی ۱۹۲۸ء کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ سلطان میر تعاقب
سے بچتا رہا اور بالآخر سنٹی اور کنڑیوں میں غائب ہو گیا۔
عجب کے بوسٹی خیل آفریدیوں کو اس واقعہ کی یاداش میں نقلوں

کے علاوہ ۴۲ ہزار روپے جرمانہ کیا گیا اور عجب کی اپنی زمینیں ۸ ہزار روپے مالیت کی ضبط کر لی گئیں۔ اس کے گاؤں کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی اور مقامی روایات کے مطابق اس مقام پر نمک بھرا ہل چلا دیا گیا۔ دولت زئی اور دیگر اور کنزیوں کو ۱۹ ہزار روپے جرمانہ کیا گیا کیونکہ وہ بھروسوں کے تعاقب میں اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے میں ناکام رہے تھے۔

ایس کیس کے فٹ نوٹ کے طور پر یہ ذکر کرنا خالی اندیشہ نہ ہو گا کہ عجب خود ضعیف اور معذور ہو کہ شمالی افغانستان میں ۱۹۶۱ء تک زندہ رہا جہاں اس نے اور اس کے ساتھی پٹھانوں نے مقامی کانون پر کابلی حکومت کا رعب داب قائم رکھنے کے لئے کافی کام کیا۔ قیام پاکستان کے بعد وہ اور اس کا بھائی، شہزادہ تحریک پاکستان میں ملوث ہو گئے دیکھئے آئندہ باب دوازدہم) اور ۱۹۵۲ء کے آخر میں شہزادہ پہلی دفعہ اپنے گاؤں کا محل وقوع دیکھنے کے لئے واپس آیا تاکہ افواج پشتونستان کے پاکستان پر حملے کا راستہ صاف کیا جاسکے۔

پچھتے عشرے کی قبائلی پالیسی!

جن خاص واقعات نے پچھتے عشرے کو سرحد میں برطانوی حکومت کا سب سے پُر فتنہ دور بنا دیا آئندہ ابواب میں ایک بڑے کھل کے اجزاء کے طور پر بیان کئے جائیں گے۔ ان میں سے اہم ترین پشاور کے ارد گرد کے علاقوں میں ۱۹۳۰ء کی بغاوت تھی نیز ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء اور

۱۹۲۸ء میں وزیرستان کے قبائلیوں اور انگریزوں کے درمیان ایک طویل زور آزمائی ہوئی۔

اس پورے ہنگامہ خیز دور میں برطانوی قبائلی پالیسی بنیادی طور پر وہی رہی۔ ۱۹۲۲ء کے دعوے کہ نئی فارورڈ پالیسی کا مقصد پہاڑی قبائل تک اقتصادی پیروی اور تہذیب کی برکات پہنچانا تھا وقتاً فوقتاً دہرائے گئے۔ ۱۹۲۸ء میں حکومت نے یہ نظریہ قائم کیا کہ نئی پالیسی ”بنیادی طور پر مثبت اور تعمیری تھی۔ عسکری فتح کی بجائے تہذیبی تھی۔“ ایک سرکاری رپورٹ کے آخری الفاظ تھے ”اس طرح قبائل میں حکومت خود اختیاری کا جذبہ اور ان کا احساس ذمہ داری زندہ رہتا رہے گا جبکہ برطانوی اثر و رسوخ اور اقتصادی اقدامات آہستہ آہستہ ان اسباب کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے جنہوں نے صدیوں سے ان جیالوں کو قاتل و قزاق بنا رکھا ہے“۔

وزیرستانی شورشوں کے درمیان میں بھی انڈیا آفس ابھی تک مصر تھا کہ سرحد کے متعلق حکومت ہند کی عمومی پالیسی کا مستقل مقصد یہ ہے کہ سرحدی امن برقرار رہے اور قبائل کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کئے جائیں تاکہ ان کی تدریجی تالیفِ قلب، تہذیب اور اقتصادی فلاح و بہبود کا سامان ہو سکے۔“

۱۔ این ڈی بیو ایف پی ایڈمنسٹریشن رپورٹ ۱۹۲۸ء، ص ۲۸۰۔
 ۲۔ پارلیمنٹری میمور ۱۹۳۷ء، ۵۴۹۷ ڈسٹرکٹس ڈسٹریکٹس وزیرستان (زبان حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تاہم قوت اور سرکوبی کی موجود آبد و ہوا تبدیل نہ کی جاسکی۔
 صحت یا تعلیم کی خدمات برائے نام ہی مہیا کی گئیں اور قبائل کا قدیم
 اندازہ حیات سکولوں اور ہسپتالوں سے متاثر نہ ہو سکا جو ہندوستان کے
 دیگر حصوں میں مشمولہ بہ صوبہ سرحد تیری سے پھیل رہے تھے۔ نظم و نسق
 کا عسکری رجحان جو ۱۹۰۱ء کے بعد پہلے سے مضبوط ہو گیا تھا ازہمک پالیسی
 کے تقاضوں کے تحت اور بھی شدید ہو گیا۔ گو حکومت نے اسے رسمی طور
 پر تسلیم نہیں کیا تاہم بیسویں صدی میں مسئلہ سرحد کو عام طور پر ایک سیاسی
 مسئلہ کی بجائے عسکری مسئلہ ہی سمجھا گیا اور فیصلہ کن اثر فوج کا ہی رہا۔
 گو بہت سے پولیٹیکل ایجنٹ اپنے طور پر اپنے لوگوں کی فلاح و بہبود
 کے لئے ایسے وقت ہوئے کہ ان کے فوجی رفقاء کے کارا نہیں شک و شبہ
 کی نگاہ سے دیکھتے تھے تاہم برطانوی نظم و نسق مجموعی طور پر قبائل کے
 معاملات کو اس وقت تک مالتا رہا تھا جب تک قائم شدہ شاہی
 انتظام کے تحفظ کو خطرہ لاحق نہ ہوتا۔ پولیٹیکل افسران مکمل حد تک
 بین القبائلی کش مکش کو عموماً کم کرنے کی کوشش کرتے تھے اور خوئیں
 جھگڑوں کی ہولناکیوں پر اکثر و بیشتر نصیحتیں کرتے رہتے تھے لیکن واقعاً

(بقیہ حاشیہ)

۲۵۔ نومبر ۱۹۳۶ء تا ۱۴ جون ۱۹۳۷ء - ص ۷

۱۔ ڈیویو کے فریئر رور افغانستان "لندن آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۵۳ء" ص ۲۶۸

انہوں نے قبائلی علاقے میں جھپٹش کو مستقل طور پر ختم کرنے کے لئے بہت کم کام کیا۔

بعض اوقات انگریز ایک گروہ کے خلاف دوسرے کی حمایت کرتے تھے جس میں آراء ایف کی بیماری بھی شامل ہوتی تھی جیسا کہ چوتھے عشرے میں مہندوں کی باہمی جنگ میں ہوا جب انگریزوں نے حاجی ترنگز کی وفیقہ علیگری سرحدگی میں بالائی مہندوں کے خلاف زیریں مہندوں کی حمایت کی۔ پہاڑی مہندہ ۱۹۳۰ء سے اپنے معاملات کے لئے ایک علیحدہ پولیٹیکل ایجنٹ کے لئے درخواستیں کرتے رہے لیکن ان کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔

ایسی بین القبائلی کشمکش کے متعلق جس کا براہ راست حکومت پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا سرکاری رویہ ۱۹۳۷-۳۸ء کی بارڈر رپورٹ میں یوں بیان کیا گیا۔ اس باجوڑی لڑائی میں حکومت نے سختی سے غیر جانبداری کا رویہ قائم رکھا ہے جو اس کے خیال میں ایک خاندانی جھگڑا ہے۔ جس سے اس کا براہ راست کوئی تعلق نہیں۔

۱۔ ملوئی وظائف کا نظام۔

سرحد میں برطانوی حکومت کے آخری دنوں پر غور کرنے سے پہلے

۱۔ قبائلی علاقہ کے مہند خیر کے پولیٹیکل ایجنٹ کی ذمہ داری تھی جس کا اثر و پیشروقت

انہی کی طرح شورش انگیز اور خطرناک آفریدیوں پر ہی عرف ہو جاتا تھا۔

۲۔ این ڈیو ایف پی بارڈر ایڈمنسٹریشن رپورٹ ۱۹۳۷-۳۸ء ص ۲

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قبائلی الائنمنٹوں کے نظام پر ایک سرسری سی نظر ڈال لی جائے۔ یہ نظام کسی نہ کسی شکل میں کم از کم متعل دور سے شروع ہوا، انگریزوں نے اسے شروع ہی سے اپنا لیا لیکن چوتھے عشرے میں یہ اپنے جو بن پر آیا اور اس نے ایک ایسا نمونہ قائم کیا جو اب بھی جاری و ساری ہے۔

سب سڈی کی تین واضح قسمیں ہیں۔ گنگی افراد کو دیا جاتا ہے جو عام طور پر ملک یا دیگر بااثر اصحاب ہوتے ہیں۔ یہ عموماً ماہوار، ہفتہ وار یا سالانہ دیا جاتا ہے۔ ادائیگی چند روپے سے کئی سو روپے ماہوار تک ہوتی ہے۔ گنگی کی اہمیت محض اقتصادی نہیں ہے۔ مختصر سا گنگی بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ حکام نے اس کے علاقے کا رہنما تسلیم کر لیا ہے اور اس سے اس کا وقار بڑھتا ہے۔ پچھلے سالوں میں ایک رجحان صاف نظر آتا ہے کہ گنگی کے ساتھ اجناس یا مقررہ قیمتوں پر کپڑا اور آمد کرنے کے لائسنس بھی کبھی کبھار دے دیے جائیں۔ آخر الذکر قبائل کو ایک ایسی اہم چیز مہیا کرتا ہے جو پھاٹیوں میں کم یا ب ہے اور اس کے علاوہ ایک پُر وقار نیک کو دو بارہ فروخت یا سامان کے کسی حصہ میں رد و بدل کر کے فالو آفنی بنانے کا بھی ذریعہ بنتا ہے۔

موا جب وہ الائنمنٹ ہے جو کسی قبیلہ یا محیل کو بطور ایک اکائی دیا جاتا ہے یہ غالباً اہم ترین سب سڈی ہے۔ یہ عام طور پر ایک جرگہ کی موجودگی میں قبیلے کے نمائندہ ملک کے حوالے کیا جاتا ہے قبیلے میں اندرونی تقسیم دینے

رسم کے مطابق ہوتی ہے اور اس پر شاؤنا درہی جھگڑے ہوتے ہیں۔
 خرچہ وہ رقم ہے جو سیاسی حکام کے کہنے کے مطابق خصوصی کام
 نمٹانے کے بدلے دی جاتی ہے۔ یہ کسی ایچی کی خوراک کے لئے ایک دو روپے
 ہو سکتے ہیں یا کسی ملک کے لئے بہت بڑی رقم ہو سکتی ہے جو افغان مداخلت
 کاروں کو بھگادینے کے لئے ایک لشکر اکٹھا کرنے کا معاوضہ ہوتی ہے۔
 نظری طور پر انگریز ان وظائف کو قبائل کا حق گردانتے تھے جزو
 قدیم قبائلی حقوق کے معاوضہ کے طور پر جیسے دروں میں سے گزرنے
 والے مسافروں سے ٹیکس لینا جزو مراعات کے بدلے میں جیسے قبائلی
 زمینوں میں سے سڑکوں اور ریلوے لائن کو گزارنا اور جزدی طور پر ضروری
 خدمات انجام دینے کے بدلے میں جیسے سڑکوں اور ریلوے لائن کی مرمت
 اور حفاظت کرنا۔ لیکن علی طور پر حکام اکثر و بیشتر انہیں ایک اوزار
 کی حیثیت سے استعمال کرتے تھے، جو ناکہ بندی کے ساتھ نہتی ہو کر اتفاقاً
 دباؤ کے ذریعے قبائلیوں کو مطلوبہ کام کرنے پر مجبور کر سکتا تھا۔
 قدرتی طور پر سیاسی حکام کو لاپچہ ہوتا تھا کہ وہ کسی معاون
 ملک کا اثر و رسوخ بڑھانے کے لئے اس کا آلات بڑھا دیں اور اس کے
 اپنے گرد سے بھی بڑے گروہوں کے موجب کے لئے اسے بطور تسط
 استعمال کریں۔ یہ طریقہ جو تھے عشرے میں ہندوؤں کے طویل باہمی جھگڑوں

میں خاص طور پر استعمال کیا گیا۔ یہ تاگزیر طور پر ناکام ہو گیا کیونکہ قبائلی اس سے سخت متنفذ ہو گئے اس لئے کہ یہ ان کے اپنے قائم کردہ اور تسلیم کردہ مراتب اثر و رسوخ سے مستصادم ہو گیا۔

برطانوی دور کے آخری ایام۔

اگرچہ ۱۹۳۶-۳۸ء کی وزیرستانی بغاوت فوجی لحاظ سے دبا دی گئی پھر بھی جنوب میں صبح اور مکمل تقرّف کبھی قائم نہ ہو سکا، گورنر مک اور دانا کی چھاؤنیاں چٹانوں کی طرح کھڑی رہیں اور قبائلی علاقے کے اندر چند گز مزید پھیل گئیں تاہم دستے کبھی آرام سے نہ رہے اور سڑکیں کبھی محفوظ نہ ہو سکیں۔ سفر عموماً پوری طرح مسلح قافلے کی صورت میں ہوتا اور وہ بھی صرف ”سڑک کھلی کے دنوں“ میں شاید ہفتہ میں ایک دفعہ۔ ان دنوں میں ایک پوری بٹالین یا ایک بریگیڈ چھاؤنی سے علی الصبح پکٹ کے لئے چندرجن میل سڑک پر پہنچ دیا جاتا اور آٹانے اور جانے والے قافلے عین مقررہ اوقات پر ایک دوسرے کے پاس سے گزر جاتے تاکہ قریب غروب آفتاب سے پہلے چھاؤنی میں واپس آسکے۔

ہوائی جہاز کی آمد نے روایتی برق رفتار دستے کا متبادل مہیا کر دیا تھا جب بھی حکومت سمجھتی تھی کہ کسی دور افتادہ گاؤں یا قبیلے کو سزا دینا ضروری تھا، دفاع سے عاری قبائلی مہمات پر بمباری کے خلاف انگلستان میں انسان دوست گروہوں کے شور و غوغا

کے باوجود آر۔ اے۔ ایف ڈرائیبل ایئر فورس) دو سال تک ہوائی حملے کرتی رہی اور گوپوٹیکل افسران کے ملازم مجر ہوائی حملے سے ہونیوالی خوفناک تباہی اور بے نقاب ہونے والے مخالفین کی اطلاعات از خود دیتے رہے تاہم ان بالا وقاف بمباریوں سے چند مٹی کے قلعوں کی تباہی کے سوا اور کچھ نہ ہو سکا۔

ہوائی جہاز دیکھ بھال کے مقاصد کے لئے بہت مفید تھے بانھوم افغانستان سرحد پار کرتے ہوئے لشکروں یا قبائلی علاقوں کے اندر نہیں موجہ بندی کرتے ہوئے دیکھتے ہیں لیکن کم بلندی پر وہ نشانہ بازوں کی زمیں آجاتے تھے، اور زمین پر اترنے والے پہلے چند ہوا بازوں کا حشر عبرتناک تھا۔ بعد میں بانغ نظر حکومت نے ہوا باز کی واپسی کے لئے اُو پچا فدیہ مقرر کر دیا جو کسی بھی وجہ سے قبائلی علاقے میں کھو گیا ہوا دریوں یہ سارا عمل ایک کھیل کا رنگ اختیار کر گیا۔

جنگ عالمگیر دوم بھی اپنی پچیس سالہ سابقہ پیشرو کی طرح سرحد میں نسبتاً امن سے گزر گئی کہیں مخالفانہ قوت نے ٹینکوں کے سلسلے کو توڑنے کی کوشش نہیں کی۔ عاجلانہ طور پر جو خیر اور کریم میں اکٹھے کر دیئے گئے تھے۔ افغانستان جرمنی کے ساتھ دوستانہ تعلقات کے

باوجود پوری جنگ میں غیر جانبدار رہا۔ قبائلی علاقے اور سرحد کے ساتھ ساتھ دستوں کو کاملاً ہٹانا تو کبھی محفوظ نہ سمجھا گیا تاہم ان کی کافی تعداد برما کے جنگی جہاز پر منتقل کر دی گئی۔

کابل کے اطالوی اور جرمن ایجنٹ فیکر ایپی سے رابطہ قائم کرتے ہوئے اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے جو ۱۹۳۹ء تک سرحد کا خوفناک ترین دشمن بن چکا تھا۔ ۱۹۴۱ء میں فیکر ایپی کو محوری طاقتوں سے چند لاکھ افغانی روپے ملے جو اس وعدے کا بدلہ تھا جو اس نے اپنے لشکر کو مناسب وقت پر انگریزوں کے خلاف استعمال کرنے کے سلسلے میں کیا تھا لیکن اس منصوبے کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

جنگ عالمگیر دوم کے خاتمہ اور انگریزوں کے خیمہ بادل کھنے کا درمیانی وقفہ سرحد میں قریباً خیریت سے گزرا۔ کوئی بڑی شورش نہیں ہوئی۔ گو ایک قبائلی گاؤں پر بمباری کبھی کبھار اب بھی ضروری سمجھی جاتی تھی، اور قبائلی علاقے میں سفر ”ٹرک کھلی کے دونوں“ کے مطابق ہی اختیار کرنا ضروری تھا۔ روسی خطرہ بھی اُفتی پر دوبارہ نمودار ہوا لیکن حکمرانوں کی توجہ جدوجہد آزادی پر مرکوز تھی جو ہندوستان

۱۰۔ ایپی کے ابتدائی کارناموں کے لئے دیکھئے آئندہ باب نہم

۱۱۔ کہا جاتا ہے کہ مستعد فقیر محوری ایجنٹوں کو اپنی صلاحیتوں اور توقعات کا ایک گوشوارہ دیا یعنی (۱) بالاد قاف چھوٹے چھوٹے معرکوں کو جاری رکھتے اور انہیں تیز کرنے کے لئے ۳ لاکھ روپے سالانہ فتنہ بک (۲) دوسرے میدانوں میں انہیں پھیلانے کے لئے ۶ لاکھ روپے سالانہ (۳) مکمل سرحدی بغاوت کے لئے ۱۰ لاکھ روپے

سے ان حصوں میں جاری تھی جو عموماً سرحد سے کہیں زیادہ اطاعت پذیر
تھے۔ جب آزادی اور تقسیم کا فیصلہ ہوا تو سرحدی انتظام کاروں نے
استصواب کروایا اور پھر قریباً ایک صدی کی حکومت کے بعد رخصت
ہو گئے۔

ایک ممتاز افسر ڈبلیو۔ کے۔ فریزر ٹیلر جس نے سرحد اور افغانستان
دونوں میں خدمات انجام دی تھیں اعتراف کرتا ہے کہ انہوں نے سرحد
کا مسئلہ حل نہیں کیا تھا، اور اگست ۱۹۴۷ء میں انگریزوں نے پاکستان
کو ایک ڈھلے مشکل اور مستقبل کے لئے خطروں سے بھرپور صورتحال
منتقل کر دی تھی۔

سرحد ہندوستان کے ایک حصہ

کی حیثیت سے

تعارف !

تاریخ ایشیا کے بہت سے بڑے بڑے فاتحین نے دریائے سندھ کے دونوں طرف حکومت کی ہے۔ لیکن انگریزوں کی آمد تک ان میں سے کسی نے سرحد کو ہندوستان کا ایک حصہ نہیں سمجھا۔ پٹھانوں نے بھی کبھی ایسا نہیں سوچا۔ چودھویں اور پندرہویں صدی میں دہلی کے افغان سلاطین ایک شعوری طور پر غیر قوم کی حیثیت سے حکومت کرتے رہے۔ خوشمال خان خٹک نے ہندوستان میں اپنی جلاوطنی کے دوران جو نظریں لکھی ہیں وہ بھی اس ملک اور اس کے لوگوں، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان کے خلاف نفرت و حقارت سے بھری ہوئی ہیں۔ کیلنگ نے ۱۸۸۹ء میں لکھی گئی "بادشاہ کے رحم و کرم کی داستان" کے مطلع میں یہ سادے انداز میں کہا تھا۔ "ہندوستان کے ایک شکاری کتے نے ایک

یوسفزئی کو کاٹا تھا اور انہوں نے اس کے منہ پر تھوکا اور مرنے کے لئے اسے باہر نکال دیا۔ یہ الفاظ انیسویں صدی کے اخیر میں لنگ و سندھ کے باشندوں کے متعلق پٹھانوں کے رویہ کے غمانہ ہیں۔

یہ قریباً ناممکن ہے کہ پوری انیسویں صدی میں ہمیں پٹھانوں اور برطانوی ہندوستانی سلطنت کی دیگر رعایا کے درمیان اشتراک مفاد کا کوئی احساس ملے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت ہندو راجوں، مسلمان نوابوں اور مختلف نسلوں، ذاتوں اور مذہبوں کے سپاہیوں کا ایک متفرق مجموعہ سامنے لائی لیکن وہ پٹھان نہیں تھے۔ سید احمد کے پیرو بھی قبائلوں کے ساتھ عارضی ترین اتحاد کے سوا کچھ حاصل نہ کر سکے۔ ۱۸۹۷ء کی عظیم پٹھان بغاوت اس وقت ہوئی جب انگریزوں اور ہندوستان کی دیگر محکوم اقوام کے درمیان تعلقات دوستی کی انتہاؤں کو چھو رہے تھے۔

انگریز ہند پارلیمان کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے پر بضد ہے لیکن وہ اس کی انفرادیت کو تسلیم کرتے رہے بلکہ انہوں نے کئی طریقوں سے اس کے الگ تھلگ پن کو تقویت دی۔ شاید ان میں سے اہم ترین یہ تھا کہ کرن تے سندھ پاراضلاع کو پنجاب سے الگ کیا اور قبائلی علاقہ قائم کیا۔

پورے برطانوی دور حکومت میں حکومت کا سرحد میں مقصد تحفظ تھا نہ کہ مالیہ یا ترقی۔ ۱۹۰۹ء کی مارلے منڈا اصلاحات اور ۱۹۱۹ء کی

مائیکروچیمس فورڈ اصلاحات سرحد میں قریباً محروم توجہ رہیں جو ویسے بھی ان کے فوائد سے محروم رکھا گیا تھا۔ یہاں تک کہ چیف کمشنر کی بجائے گورنر بھی ۱۹۲۲ء میں مقرر کیا گیا تاکہ صوبہ سرحد کو کم از کم نظری لحاظ سے ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے برابر لایا جاسکے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ناگزیر طور پر برطانوی ہندوستانی نظم و نسق کے کثیرالاعداد نچلے درجے کے اہلکاروں نے ضلع اور تحصیل کی سطح پر زیادہ سے زیادہ اپنا لوہا منوایا اور پٹھان رواج کو صوبے میں بتدریج ہندوستان کے دیگر حصوں میں تجربات کی بنا پر قائم شدہ مالیاتی، پولیس اور عدالتی نظام کے تقاضوں کے ماتحت کر دیا۔ اس کا نتیجہ جگ ٹالگیر اول کے بعد کے سالوں میں روز افزوں بنیادیں اور بے چینی کی صورت میں ظاہر ہوا اور پٹھانوں کو یہ احساس ہونے لگا کہ وہ برطانوی حکومت کے مطالبوں میں تو شریک تھے لیکن اس کے فوائد میں نہیں جیسا کہ سر ولیم ہارٹن نے بعد میں اعتراف کیا۔ ”پٹھان قبائلی نظام کو بائیس برطانوی ہند کے انتظامی ڈھانچے میں لانے کی پالیسی کافی حد تک انگریزوں کی ناکامی کی ذمہ دار ہے کہ وہ پٹھانوں کو ہندوستانی سیاسی نظام میں کیوں نہ جذب کر سکے“۔

ہندوستان کا سیاسی اثر

اس کے باوجود پہلی جنگ عالمگیر کے بعد ہندوستان بھر میں سیاسی جمیٹی کی تیروند ہوئیں چلنے لگیں اور انہوں نے سرحد کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سرحد کے مشہور ترین آتش بیان مقرر خان عبدالغفار خان نام پہلی دفعہ ۱۹۱۹ء میں منظر عام پر آیا جب اتمانزئی کے اس نوجوان زمیندار نے رولٹ ایکٹ کے خلاف تحریک کی رہنمائی کی جس کے تحت ہندوستان میں سیاسی سرگرمیوں پر سخت زد پڑتی تھی۔ ترکی کی حمایت میں تحریک خلافت کو دوران جنگ بہت بڑھ گئی، جب مشہور و معروف علی برادران نے تحریک کو کانگریس سے ملادیا تاکہ ان سخت شرائط صلح کے خلاف جدوجہد کی جاسکے۔ جو انگریز اور فرانسیسی شکست خوردہ ترکی پر مقبوظ رہے تھے۔ تحریک ہجرت نے یہ سکھایا کہ تمام مسلمان دارالحرب کو چھوڑ کر دارالاسلام میں چلے جائیں تو بہت سے پٹھان بھی اس سے بے حد متاثر ہوئے اور اگست ۱۹۲۰ء میں ۱۸ ہزار نے اپنی زمینیں، گھر اور دکانیں بیچ دیں اور کابل روانہ ہو گئے جہاں مہاجرین کا شکر افغان

۱۔ تحریک خلافت دوران جنگ نہیں بلکہ بعد از جنگ شروع ہوئی (مستم)

۲۔ "مورل اینڈ میٹریسل پراگریس ان انڈیا" ۱۹۲۰ء، ص ۵۳

امیر کے لئے آنا تکلیف دہ ثابت ہوا کہ اس نے انہیں واپس ہندوستان بھیجنے کے لئے انگریزوں سے تعاون کیا۔

۱۹۲۲ء میں مارچ ویٹ فرنیئر انکوائری کمیٹی نے رورافروڈ

بے چینی پر غور کیا اور اس کی رپورٹ نے تسلیم کیا کہ صوبہ سرحد کے باشندے "یقیناً ذہانت یا اپنے معاملات کو سنبھالنے کی صلاحیت میں باقی ہندوستان سے پیچھے نہیں تھے۔ رپورٹ میں مزید کہا گیا: "اصلاحات کی آرزوئیں اب پوری طرح بیدار ہو چکی ہیں اور کسی صورت میں دیگر مقامات میں رائج اصلاحات سے کم پر مطمئن نہ ہوں گی" کمیٹی نے مائیکو چیمفورڈ اصلاحات کی مجوزہ قسم کی قانون ساز کونسل کی سفارش کی جس کے سامنے فیصد ممبر منتخب ہوں، نیز ایک مقامی وزیر کی تقرری کی بھی سفارش کی جو پنجاب کے نمونے پر منتقلہ امور کا سربراہ ہوگا۔

یہ سفارش دس سال تک سرحد خانے میں پڑی رہی۔ وریں آنا رزمک پالیسی پر عملدرآمد شروع کیا اور گوتیاہلی علاقے سلگتے رہے تاہم صوبہ سرحد مائل بہ سکون رہا۔ اصلاحات کو التواء میں رکھنے کے لئے صوبے اور قبائلی علاقہ کے گہرے باہمی تعلق اور تحفظ کے مقدم تقاضوں کے حوالے دیئے گئے۔ علاوہ ازیں کچھ زیادہ طباع پٹھانوں نے اپنی تو نامیوں کے نکاس کے لئے نئے اور غیر معتز تہ راسے تلاش کر لئے لہذا ۲۵-۱۹۲۲

۱۔ این ڈیوایف انکوائری رپورٹ، ص ۲۲

۲۔ منتقلہ امرتعلیم، صحت، زراعت، تعمیر آبکاری مقامی خود اختیاری اور ادارہ باہمی وغیرہ پر مشتمل تھے۔ (مترجم)

کی بارڈر رپورٹ میں اس سال کا اہم مسئلہ یوں بیان ہوا "عورتوں کی وسیع پیمانے پر اور نفع بخش تجارت سوات یا ضلع پشاور سے اغوا کی ہوئی یا بھلائی پھسل گئی ہوئی، آفریدی سرحد کے پار لے جا کر اور بالآخر سندھ میں فروخت کے لئے برآمد کردہ، تیسرے عشرے کے آخر تک یہ روز بروز واضح ہوتا چلا گیا کہ سرحد ہندوستان کے دیگر حصوں میں رونما ہونے والے واقعات سے لا تعلق نہیں رہا تھا۔ "رنگیلا رسول" کے مشہور مقدمہ میں جس میں آنحضورؐ کی توہین کے مرتکب مصنف کو ضلع ہزارہ کے ایک مسلمان نے بھری عدالت میں موت کے گھاٹ اتار دیا قبائلی علاقہ اور زیر انتظام اضلاع میں بھی اضطراب کی ایک زبردست لہر دوڑ گئی جب کراچی میں قاتل کو تختہ دار پر لٹکا یا گیا تو سرحد میں کمیونٹی یا فرقہ وارانہ جذبہ پیدا ہوا اور بہت سے ہندو دکاندار اور متوسلین پٹان دیہات سے نکال دیئے گئے۔

۱۹۲۸ء میں سائنس کمیشن نے سفارش کی کہ مانیکوٹ جیسفورد اصلات

۱۔ این ڈبلیو ایف پی بارڈر ایڈمنسٹریشن ۲۵-۱۹۲۴ء ص ۵

۲۔ ہندو پاکستان کے برصغیر میں کمیونٹی عام طور پر مذہبی کامترادف ہے۔ یہ ہر اس چیز پر سادق آتا ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے رسم و رواج، ان کی سرگرمیوں اور ان کے باہمی روابط سے تعلق رکھتی ہو۔

ایک محدود شکل میں صوبہ سرحد میں بھی نافذ کی جائیں لیکن اس لیے چینی کم کرنے کی بجائے مجوزہ اصلاحات کی محدود نوعیت کی وجہ سے اضطراب کی ایک نئی لہر کو پیدا کر دیا۔

عبد الغفار خان اور خدائی خدمتگار

اب تک عبد الغفار خان اور اس کے بھائی، ڈاکٹر خان صاحب نے جو انڈین میڈیکل سروس کا ایک افسر تھا گاندھی اور انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ رابطہ قائم کر لیا تھا۔ خان برادران نے جنہیں رولٹ ایکٹ کے خلاف ایجنسی ٹرین کے بعد قید کر دیا گیا تھا قبائلی منہرین سے بھی تعلقات قائم کر لئے تھے، بالخصوص مہمندوں کے ساتھ جن کے سب سے زیادہ شورش پسند لیڈر، حاجی ترنگرئی کے ساتھ ان کا رشتہ نااطفہ بھی تھا۔

۱۹۲۹ء میں عبد الغفار خان خدائی خدمت گاروں کی بنیاد ڈالی جن کی وردی مقامی اینٹوں کے رنگ سے امتیازی طور پر سرخ رنگی جاتی تھی۔ برطانوی سرکاری دستاویزات میں تنظیم کو فوراً ہی ”سرخپوش“ کا نام دے دیا گیا اور حواس باختہ انتظام کاراسمیں اور سرخ خطرے کے درمیان ایک خفیہ تعلق دیکھنے لگے جو ہندوکش سے پرے دریافت ہوا تھا جبکہ ابھی نزار کا خطرہ بھی شاید دفن نہیں ہوا تھا۔

خدائی خدمت گار بہت جلدی پشاو را اور اس کے ارد گرد وہاں
 میں مقبول ہو گئے، اور عبدالغفار خان ہندوستانی سیاسی سرگرمیوں میں ایک
 اہم شخصیت بن گیا۔ خدائی خدمت گار جرگے ضلع پشاور کے اکثر دیہات
 میں قائم کئے گئے اور انہیں ہمسایہ قبائلی اور ضلعی جرگوں سے ملا دیا گیا
 سب سے اوپر صوبائی جرگہ تھا جس میں خدائی خدمت گاروں کی اعلیٰ
 کان شامل تھی۔ تمام جرگہ ممبر منتخب کیے جاتے تھے اور یہ نظام ایک
 قسم کا متوازی نظم و نسق بن کر ابھرنے لگا۔ جو برطانوی حکومت سے
 کوئی سروکار نہ رکھتا تھا۔ خدائی خدمت گار جرگوں کے پہلو بہ پہلو ضلعی
 کی ایک تنظیم بھی تھی جو اعلیٰ کان کی تعین کردہ پالیسی پر سختی سے عمل کرنے
 اور اسے نافذ کرنے کا حلف اٹھاتی تھی۔ عبدالغفار خان بذاتِ خود ماتحت
 افسروں کو مقرر کرتا تھا بلکہ

۳۱۔ ۱۹۳۰ء کی ایچیٹیشن

۲۳ اپریل ۱۹۳۰ء کو عبدالغفار خان اور اس کے ساتھی بے چینی
 پیدا کرنے کے الزام پر گرفتار کر لئے گئے۔ جب اس کی گرفتاری کی خبر
 پشاور میں پھیلی تو شہر میں بلوہ پھوٹ پڑا۔ ہزاروں لوگوں نے سرخ قمیص
 پہن لیں اور جو کچھ بھی ہاتھ لگا اسے سرخ رنگتے گئے۔ شہر میں فوج بلا

۱۔ قیوم، ایضاً، ص ۵۰، فریو

لی گئی اور ٹینک ننگ بکلیوں میں گشت کرنے لگے۔ رائل گروہ وال رائفلز کی دو پلٹنوں کو قصہ خوانی بازار کے ہجوم پر گولی چلانے کا حکم دیا گیا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ ان سے ہتھیار چھین لئے گئے اور انہیں برطانوی سپاہیوں کی حفاظت میں ہٹا دیا گیا۔ اس کے بعد برطانوی سپاہیوں نے ہجوم پر گولی چلائی اور بہت سے لوگ مارے گئے۔ کرنیو رگ دیا گیا اور ایک سخت فوجی حکومت کے تحت امن و امان تدریجاً بحال کر دیا گیا۔

شورش کے پہلے ہی اشارے پر مخاٹھانہ لشکر پہاڑیوں میں اکٹھے ہونے لگے۔ حاجی ترنگزئی ۲ ہزار آدمیوں کے ساتھ ضلع پشاور کے سنارے پر منڈلاتا رہا۔ ۱۱ مئی کو کم ہزار مدائیل اور خضر خیل وزیریک سخت دادی ٹوچی کی دتا خیل چوکی کے سامنے نمودار ہوئے اور اس پر حملہ کر دیا۔ اسی دن بارہ سو دوروں نے ایک اور قلعہ پر حملہ کیا ۲۵ مئی کو مردان میں بلوہ شروع ہوا اور ایک برطانوی اسٹنٹ سپرینڈ پولیس ایک ہجوم کے ہاتھوں تخت بھائی کے قریب ٹکڑے کر دیا گیا۔ اس کے بعد ہجوم پر گولی چلائی گئی جس سے کافی لوگ مارے گئے اور زخمی ہوئے۔ مئی کے آخری ہفتے میں ایک اتان خیل لشکر شب قدر کے قریب نمودار ہوا۔ آخری ہفتوں سے خیبر میں کارروائیاں کر رہے تھے اور جون کے اوائل میں ۵ ہزار کا ایک لشکر قلعہ جہرود کے قریب اکٹھا ہو گیا۔ چارپانچ جون کی رات کو اس میں سے ۲ ہزار نیچے اترے اور پشاور چھاؤنی پر براہ راست "ماروا اور بھاگ جاؤ"

حملہ کیا جو سرحد میں اسی سالہ برطانوی حکومت کی علامت تھی۔
 آفریدی چھاپے جو کبھی کبھار فرنیٹیئر کانسٹیبلری کے بھیس میں ہوتے
 تھے پورے جون اور جولائی میں ضلع پشاور پر جاری رہے۔ نو دس ہون
 کو ایک مخالف لشکر ہزارہ میں ظاہر ہوا۔ ۷ جولائی کو محسودوں نے سرگود
 اور اجمعی تنگی کی پولیس چوکیوں پر حملے کئے۔ دیر اور بنیر میں بھی شورش تھی
 اور وہاں کے بہت سے قبائلی حاجی ترنگزئی سے آئے۔ اگست کے پہلے ہفتے
 میں ۵ ہزار کا ایک اور آفریدی لشکر پشاور کے مضافات میں پہنچ گیا جہاں
 مقامی دیہاتیوں نے اسے خوش آمدید کہا اور اس کی حمایت کی۔

بالآخر ۱۵ اگست کو پورے سرحد میں مارشل لاء لگا دیا گیا اور فوج
 نے پنجاب اور ہندوستان کے دیگر حصوں سے جلدی جلدی جمع کی گئی یونٹوں
 کی کمک کے ساتھ برطانوی کنزٹول کو دوبارہ قائم کرنا شروع کیا۔ مہمند
 اور آفریدی لشکروں کو مباری سے تتر بتر کیا گیا اور ان کے ایک
 مضبوط دستہ حرکت میں آیا اور کچھری میدان پر قابض ہو گیا جو تیراہ
 کا دروازہ ہے اور آفریدیوں کی پسندیدہ چراگاہ بھی۔ قبائلی الاؤنس
 بند کر دیئے گئے اور ناکہ بندی کر دی گئی۔ ایف سی آر کے تحت
 خصوصی جرگے قائم کئے گئے تاکہ ہنگاموں میں شریک ہونے والوں
 پر مقدمات چلائے جاسکیں اور خدائی خدمت گار تنظیم کو توڑنے پھوڑنے
 کا ایک مربوط کوشش کی گئی۔

ان اقدامات سے تحفظ نو لبی حد تک حاصل ہو گیا لیکن

سے نہ توبہ چینی ختم ہوئی اور نہ ہی نظم و نسق اپنے اعتدال پر واپس آسکا
۱۹۳۱ء کے اوائل میں دیہی علاقہ ابھی تک اتنا بے امن تھا کہ ضلع مردان
میں لگان اندازی قریباً ختم ہو سہ رہ گئی تھی اور سرکاری افسر صرف
بھاری حفاظت میں ہی ادھر اُدھر حرکت کر سکتے تھے۔

آخر کار برطانوی حکومت حرکت میں آئی تاکہ ہندوستان کی سیاسی
جماعتوں کے نمائندوں، حکومت بند اور انڈیا آفس کے درمیان لندن
میں ایک گول میز کانفرنس کے ذریعے ہندوستان بھر میں پھیلی ہوئی بے چینی
اور ہل چل کا مداوا کیا جاسکے۔ مارچ ۱۹۳۱ء میں وائسرائے لارڈ ارون
اور گاندھی اس بات پر متفق ہو گئے کہ لندن کانفرنس کے دوران
کھلبلی معطل رہے گی۔

گاندھی ارون پیکٹ کے نتیجہ میں عبدالغفار خان کو بھی دیگر
سیاسی قیدیوں کی طرح جیل سے رہا کر دیا گیا۔ اس مقام پر غفار خان کا
گاندھی کے ساتھ تعلق بالکل واضح نہیں ہے کیونکہ خدائی خدمتگارا بھی
تک رسمی طور پر انڈین نیشنل کانگریس سے وابستہ نہیں ہوئے تھے۔ بہر کیف
غفار خان نے گاندھی کے وعدے کو نظر انداز کر دیا اور خدائی خدمتگاردوں
نے سرحد میں پہلے سے بھی زیادہ بڑے پیمانے پر اپنی ایجنسی ٹینشن دوبارہ
شروع کر دی۔ نئے تربیت یافتہ مراکز کھولے گئے اور قبائلی علاقے سے
زنگر وٹ مشمولہ بہ کثیرالاعداد محسود اور بھٹانی آنے لگے۔ غفار خان
نے مبینہ طور پر ملکا فضل دین کے ساتھ رابطہ قائم کر لیا جو مشہور اور

محمود آتش بیان پونہ ملا کا بیٹا تھا۔ خدائی خدمتگار لیڈر مہمند جرجوں کا بھی ایک محترم مقرر بن گیا اور اس قبیلے میں بھی خدائی خدمت گاریوں قائم ہو گئے۔ سب اصلاح میں پولیس کے اختیارات کو نظر انداز کیا جانے لگا۔ اور برطانوی ڈاک برداروں پر حملے عام ہو گئے جسے برطانوی انتظامیہ اپنے اہم ترین مواصلاتی نظام پر ایک مربوط حملہ سمجھنے لگی۔ کوہاٹ اور بنوں کے ضلعوں میں پبلک اجتماعات پر پابندی تحریک کو مدہم نہ کر سکی، اور عموماً پرامن ڈیرہ اسماعیل خان میں بھی فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔

۱۹۳۱ء کے آخر گرما میں عشروں سے برطانیہ کے وفادار خوانین بھی مالیہ کی ادائیگی روکنے لگے اور ان پرانوں میں سے بعض تو خدائی خدمتگاروں کے اجلاس میں بھی جانے لگے۔ اس بدعہدی کو روکنے کے لئے عبید اللہ خان ابن ڈاکٹر خان صاحب کو گر فائر کر لیا گیا اور لینڈ رینو ایکٹ کے تحت اسے ایک نادہندہ کی حیثیت سے سزا دی گئی۔ اس سے کچھ متاثر نہ ہوئے خوانین سوئے قطار واپس آ گئے لیکن کسان خدائی خدمتگار جھنڈے تلے ہی اکٹھے ہوتے رہے۔

چیف کمشنر نے ۲۲ دسمبر کو ایک خصوصی دربار منعقد کرنے کا اعلان کیا جس میں برے اور سائمن کمشنن کی سفارش کردہ اصلاحات کے نفاذ کا اعلان کرنا مقصود تھا۔ عبدالغفار خان اور خان صاحب نے دکھاؤ کے طور پر دربار میں شرکت سے انکار کر دیا اور خدائی خدمت گاروں

مے اعلان کر دیا کہ مکمل حکومت خود اختیاری کے سوا کوئی اصلاح قابل قبول نہ ہوگی۔ انہوں نے یکم جنوری ۱۹۳۲ء کو خان برادران کے وطنی گاؤں اتمانزئی میں ایک عوامی جلسہ بلا لیا۔

دیں اثناء راؤ منڈیل کانفرنس ناکام ہو گئی اور گاندھی ارون پیکٹ منسوخ ہو گیا ۲۶ دسمبر ۱۹۳۱ء کو حکومت نے خدائی خدمت گاروں پر پابندی لگا دی اور غفار خان، خان صاحب اور ان کے بیٹے سعد اللہ اور ایک وکیل عطاء اللہ کو گرفتار کر لیا۔ فوج نے ضلعی پولیس اور قریئر کانٹریبلری کی مدد سے اکثر خدائی خدمتگار مراکز تباہ کر دیئے اور تحریک کے قریباً ایک ہزار مقامی رہنماؤں کو حراست میں لے لیا۔ کوہاٹ میں فوج نے خدائی خدمتگاروں کے ایک بڑے جیش پر گولی چلا دی۔ جو حکومت کے اقدام پر احتجاج کے لئے اکٹھے ہوئے تھے اور چودہ مارے گئے اور تیس زخمی ہوئے۔

تھوڑے عرصہ بعد گاندھی کو گرفتار کر لیا گیا اور کانگریس پارٹی پر پابندی لگا دی گئی۔ اس کے بعد مسلم لیگ نے تحریک شروع کر دی۔ مسلمانوں سے خریدو، ہم سرحد میں پھیل گئی اور بہت سے ہندو دکاندار اور ساہوکار جو سرحد کی اقتصادی رگوں کا خون تھے بدسلوکی اور غریبی کی تذر ہو گئے۔ مسلمان جنگجو تنظیمیں جیسے انصار اور خاکسار سرحد میں پھیل گئیں اور اس وار کی ہندوستانی سیاست کے عام فرقہ وارانہ عنصر نے پٹھان اور ہندو کے درمیان منافرت کو مزید تیز کر دیا۔

۳۲ - ۱۹۳۰ء کی شورشوں کا اہم ترین پہلو یہ تھا کہ ایک سرحدی بغاوت کو پہلی دفعہ افغانستان یا خود سرحد کی بجائے ہندوستان سے ترغیب و تشویق ملی تھی۔ انگریز اپنی حساس ترین سرحد کے اسلئے فائدہ کی دھماکہ خیز نوعیت سے بخوبی واقف تھے اور وہ بعینہ تھے کہ ہر کیس میں فتنہ و فساد کی جڑ کا نگرانی پارٹی تھی بغالباً یہ ایک مبالغہ تھا لیکن اس میں کوئی شک و شبہ نہ تھا کہ اس سرزمین میں ایک نئی روح کارفرما تھی اور سرحد کی وہ روایتی لا تعلقی ختم ہو چکی تھی جو وہ باقی ماندہ ہندوستان کے معاملات سے محسوس کیا کرتا تھا۔

عبدالعقار خان یا بادشاہ خان ایک چھ فٹ چھ انچ لمبا پٹھان تھا۔ وہ بہت جلد سرحدی گاندھی بن گیا اور وہ مسئلہ طور پر و معنائی انداز میں مہاتما گاندھی کا مداح تھا اور کانگریس پارٹی کے اصول و ہمساکا قائل۔ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء میں پیشہ ور کانگریسی تحریک بان سرحد میں بہت زیادہ تھے، اور کانگریس انگریزوں کو اقل پھیل کرنے کے لئے اپنی کارروائیوں کے اس نئے علاقے کی امکانات سے خوب آگاہ تھی۔ ایک دوسرے سے دور افتادہ قبائل اور دیہات کی طرف سے ایک ہی جیسے مطالبات و شکایات کسی ایسی مرکزی رہنمائی کا بہتہ دیتے تھے جو سرحد سے نہ بھڑکتی تھی۔ آفریدیوں نے صلح صفائی کے

نذاکرت کے دوران جو مطالبات پیش کئے ان میں نہ صرف عبدالغفار
خان بلکہ گاندھی کی جیل سے رہائی کا مطالبہ بھی شامل تھا۔

تاہم اس کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ پٹھان یا انھیں قبائلی علاقہ
میں رہنے والے بھی اکثر کانگریسیوں کی طرح اپنے کو ایک ایسی عوامی تحریک
کا حصہ سمجھنے لگے تھے جو ایک آزاد اور متحدہ ہندوستان کے لئے جدوجہد
کے رہے تھے۔ خدائی خدمت گاروں کی بیشتر کامیابی اس میں مضمر تھی کہ
تنظیم روایتی پٹھان انداز و اطوار کی حامل و عامل تھی۔ رزمک پالیسی
کے جابرانہ نفاذ اور سرحد کی سخت گیر اور مطلق العنان انتظامیہ کے
خلاف جو بے چینی پیدا ہو رہی تھی تنظیم اس کے اظہار کا ذریعہ بنی۔
ایک لحاظ سے اس نے غالباً سرحد میں امن کا راستہ ہموار کیا کیونکہ اس
نے سیاسی عمل کی راہیں مہیا کیں، جبکہ اس سے پہلے متشددانہ عمل ہی واحد
طریقہ تھا۔ اس کے علاوہ اس میں سماجی و اقتصادی بہتری کے کچھ
ابتدائی نئے خیالات بھی تھے، لیکن سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ ایک
پٹھان پارٹی تھی اور اس ابتدائی مرحلے میں کانگریس کے کنٹرول سے
خاصی آزاد تھی۔

لن۔ گورنمنٹ آف انڈیا "انڈیا" ۱۹۳۱ء دہلی: سنٹرل پبلیکیشنز برانچ، ۱۹۳۱ء

۵۶۵ (۱۹۲۹ء) سے مورل اینڈ میٹریٹل پراگریس رپورٹوں کی بجائے انڈیا پریسال

رپورٹیں شائع کی جانے لگی تھیں

خدائی خدمت گاروں اور کانگریس کو ایک ہی وسیع بغاوت
پندانہ سازش کے حصے سمجھ کر برطانوی ارباب نظم و نسق نے سرحدی تنظیم
کو کانگریس کے قریب لانے میں مدد کی جس کا مظاہرہ چوتھے عشرے کے
آغاز اور وسط میں ہوا۔ خدائی خدمت گار بالآخر اگست ۱۹۲۱ء میں
رسمی طور پر کانگریس سے منسک ہو گئے جبکہ تحریک کافی چل چکی تھی۔
لیکن کانگریس نے گاندھی کی پُرکار قیادت کے تحت خدائی خدمت
گاروں کو شروع سے ایسی کامیابی کے ساتھ اپنا لیا کہ چھ سال بعد
جب عبدالغفار خان اور اس کے ساتھیوں نے پہلے انتخابات میں صوبہ
سرحد پر گرفت حاصل کر لی تو خدائی خدمت گاروں نے کانگریس مشین
کے پیہڑوں کی حیثیت سے کام کیا۔

خدائی خدمت گار تحریک کے محرکات کچھ بھی ہوں سرحد
کے برطانوی انتظام گاروں کے پاس چوتھے عشرے کے اوائل میں
متفکر ہونے کی کافی وجوہات تھیں۔ پہلی واقعہ پورے ہندوستان
میں برطانوی اقتدار کو سیاسی ہل چل کے ڈرینے لگا رہا تھا۔
یہ تحریک ملک کے اکثر حصوں میں غیر متشدد تھی لیکن سرحد میں یہ پُر تشدد
اور براہ راست تھی اور جو جس جوں یہ آگے بڑھ رہی تھی اس میں
مزید تشدد کے آثار نمایاں ہوتے جا رہے تھے۔

اصلاحات! ۱۹۲۱ء کی سرکاری بارڈر رپورٹ میں حکومت

کے لئے نئے اختیارات کا مطالبہ کیا گیا تاکہ سرحد میں ”سیاسی پرائیگنڈ“ کی وسعت اور جہت دونوں کی قطعی حدود مقرر کی جاسکیں نہ لیکن جو طوفان ہندوستان کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے تھا یہاں بھی روکا نہیں جاسکتا تھا اور ۱۹۴۲ء میں صوبہ سرحد میں بھی درمیانی قسم کی سیاسی اصلاحات نافذ کر دی گئیں۔ ”اُسے گورنری صوبہ“ کا درجہ دے دیا گیا یعنی چیف کمشنر کی جگہ ایک گورنر نے لے لی اور قدرے حکومت خود اختیاری دے دی گئی۔ ایک ریٹائرڈ، غیر سیاسی سول سرفنٹ سر عبدالقیوم صوبے کا پہلا وزیر بنا۔ ۱۹۱۹ء کی مائیکو جیمس فورڈ اصلاحات کے مطابق اصل اختیار گورنر اور اس کی ایگزیکٹو کونسل کے پاس تھا۔ لیکن بعض امور جیسے صحت، حفظان صحت اور تعمیرات عامہ وزارت کو ”مقتل“ کر دیئے گئے۔ لیکن ان معاملات میں بھی آخری اختیار گورنر کے پاس ہی تھا۔

امید تھی کہ یہ انتظام فرقہ وارانہ نمائندگی پر اتفاق سے مل کر (یعنی نمائندہ اداروں میں مسلمانوں، ہندوؤں اور عیسائیوں کے لئے علیحدہ علیحدہ مخصوص نشستیں اور حلقہ نمائندگی نیابت جو لندن کی گول میز کانفرنسوں کا ایک غرہ تھا) مسلم احساسات کو مطمئن کر دے گا اور سرحد میں ہل چل کم ہو سکے گی۔

لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اپنی خاصی قابلیت اور بلند پایہ فائزیت
 داری کے باوجود سر عبد القیوم مقبول نہ ہو سکا کیونکہ اس کے پاس اختیار
 نہ تھا اور ثانیاً برطانوی انتظامیہ میں اس کی طویل ملازمت اور سیاسی
 ردابط کا فقدان اسے برطانوی کٹھ پتلی کے الزام سے نہ بچا سکے۔
 سر عبد القیوم کے دور منصب کو فرقہ وارانہ نوعیت کے دو
 واقعات نے اور بھی مشکل بنا دیا اور انہوں نے صوبے اور قبائلی
 علاقے کے اندر جذبات برانگیختہ کر دیئے۔ ۱۹۳۵ء کے اواخر میں
 بنوں کے ایک پھان استاد نے مبینہ طور پر ایک ہندو لڑکی کو اغواء کر
 لیا اور اسے مسلمان بنا کر اس کا نام اسلام بی بی رکھا اور اس سے شادی
 کر لی۔ لڑکی کے والدین نے اس کی بازیابی کے لئے عدالت سے رجوع
 کیا۔ عدالت نے اس کی واپسی کا حکم دیا اور سرحد کے طول و عرض میں
 فرقہ وارانہ فسادات رونما ہوئے۔ اپریل ۱۹۳۶ء میں ایک چھوٹی
 سی تاریخی مسجد مسجد شہید گنج جولاہور کے ایک سکھ گوردوارہ کی
 زمین پر مٹی سرکاری حکام کی منظوری سے مسمار کر دی گئی اور سرحد میں
 ہل چل کی ایک اور ہراٹھی۔

دونوں واقعات سے غفار خان اور خدائی خدمت گاروں نے
 ہندو زدہ کانگریس پارٹی سے تعلق کے باوجود خوب فائدہ اٹھایا۔ ان کا
 موقف یہ تھا کہ ایسے واقعات ایک بدیشی اور کافرانہ حکومت سے
 ہی سرزد ہو سکتے تھے اور انہوں نے سر عبد القیوم کو بھی نشانہ تنقید

بنایا کہ وہ ان واقعات پر احتجاج کرتے ہیں ناکام رہا۔ نیز ایک جنونی وزیر ملا فقیر ایپی نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر وزیرستان میں نئی گڑ بڑ پھیلادی۔

غفار خان کو امن عامہ ایکٹ کے تحت سرحد بدر کر دیا گیا اور خدائی خدمت گاروں پر پابندی برقرار رہی، لیکن تحریک زیر زمین چلی گئی اور بادشاہ خان کی مقبولیت بڑھ گئی، کیونکہ اسے شہید سمجھا جانے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ۲ اگست ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا کے تحت ہندوستان میں ایک نیا دستور نافذ کیا گیا تو خدائی خدمتگار پہلے سے کئی گنا زیادہ طاقتور ہو کر نکلیے۔

۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا کی پیچیدگیوں کا قصہ یہاں مناسب نہیں ہے لیکن اسے ۱۹۳۴ء میں ہی نافذ کیا جاسکا۔ یہ کہہ دینا ہی کافی ہے کہ ایکٹ نے حاصی حد تک حقیقی نمائندگی مہیا کی اور صوبہ سرحد کو پہلی دفعہ کسی اصلاح کا پورا فائدہ بلا کر بعض روایتی پابندیاں بھی برقرار رکھی گئیں جو سرحد کے لئے مخصوص تھیں بالخصوص قبائلی علاقہ اور صوبہ کے روابط کے معاملات میں۔

ایکٹ کے نفاذ پر ہونے والے انتخابات میں سرحد کانگریس پارٹی نے جو زیادہ تر خدائی خدمتگار عنصر پر مشتمل تھی مقننہ میں پچاس میں آئیس نشستیں جیت لیں جو ایک ٹھوس تعداد تھی۔ لیکن دوسرے صوبوں میں کانگریس اکثریتوں کے ساتھ مل کر فاتحین نے اس

وقت تک حکومت بنانے سے انکار کر دیا جب تک گورنریہ وعدہ نہ
 کرے کہ وہ منتخب وزارتوں کی سرگرمیوں کو محدود کرنے کے لئے اپنے
 خصوصی اختیارات استعمال نہ کرے گا۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں
 کی طرح سرحد کے گورنر نے بھی اقلیتی گروہوں کو حکومت بنانے کے
 لئے کہا اور سر عبد القیوم آزاد مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کی
 نیم دلانہ حمایت پر ایک دفعہ پھر وزیر اعلیٰ بن گیا۔ اسی مرحلے پر مردان
 کو پشاور سے علیحدہ کر کے ایک الگ ضلع بنا دیا گیا جس کا ایک جزوی
 مقصد یہ تھا کہ خدائی خدمتگار طاقت کے مرکز کو توڑا جائے۔

اگست ۱۹۳۷ء میں وائسرائے نے ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے
 تحت گورنروں کے اختیارات پر ایک مصلحانہ بیان دیا جس کے
 بعد کانگریس نے حکومت کی ذمہ داری قبول کرنے کا فیصلہ کیا اور سر
 عبد القیوم کو ایک تحریک عدم اعتماد کے ذریعے (جو نو دوڑوں سے
 جیت گئی) موقوف کر دیا گیا۔ ڈاکٹر خان صاحب وزیر اعلیٰ بنا
 اور حزب مخالف جو سر عبد القیوم کے حامیوں اور چند آزاد مسلمانوں
 مشتمل تھا محمد علی جناح کی مسلم لیگ کے جھنڈے تلے چلا گیا۔

اگلے سال سریسیما ہندوستان کا ایک جزو لاینفک بنا رہا۔
 جنگجو مسلمان خاکساروں کا رہنما، عنایت اللہ خان، کانگریس پارٹی
 کا اہم مسلمان رکن، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا شوکت علی
 سب صوبے میں آئے۔ گاندھی خود بھی دودھ پھان آیا اور اس

کے سرگرمیاں سالانہ انتظامی رپورٹ میں یوں نہایت اختصار سے بیان کی گئیں۔ ”سٹرگانڈھی سکیم“ کو پشاور آیا اور رکھ دیا گیا، سٹرگانڈھی کی روانگی سے ایک دن پہلے پشاور کے شاہی باغ میں ایک سیاسی کانفرنس ہوئی۔ باغیانہ قسم کی قراردادیں منظور کی گئیں“۔

۱۹۳۹ء میں جنگ عالمگیر دوم شروع ہونے کے مقورے عرصہ بعد ہی کانگریس نے فیصلہ کیا کہ وہ جنگی مصالحت میں برطانوی حکومت کے ساتھ تعاون نہیں کرے گی۔ ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت بھی دیگر کانگریسی ہندوستانی وزارتوں کی طرح مستعفی ہو گئی ۱۹۴۲ء میں جب گاندھی کی تحریک عدم تعاون اپنے جوہن پر تھی تو سرحد میں سرخپوں کی زیر سرکردگی وسیع پیمانے پر گڑ بڑ ہوئی۔ ۱۹۴۳ء میں محمد علی جناح نے اتفاق کر لیا کہ جہاں ممکن ہو وہ مسلم لیگ کی وزارتیں قائم کر لیں گے اور سردار اورنگ زیب خان صوبہ سرحد کے مسلم لیگی وزیر اعلیٰ بن گئے۔ قانون ساز اسمبلی میں کانگریسی اکثریت نے اجلاس کا مقاطعہ کیا اور لیگ بعض آزاد ارکان کی مدد سے خاتمہ جنگ تک حکومت چلاتی رہی جب کانگریس دوبارہ نمودار ہوئی اور حکومت سنبھال لی۔ جنوری ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں خدائی خدمت گاروں نے پھر اپنی قوت کا مظاہرہ کیا اور کانگریس نے

ایسی آرام دہ اکثریت حاصل کر لی کہ ڈاکٹر خان صاحب کی حکومت چلتی رہی۔

اس حکومت کا خاتمہ ایک آئندہ باب میں زیر بحث آئے گا لیکن یہ حقیقت کہ جنگجو مسلمان پٹھان سرحد آزادی سے پہلے عشرہ میں کانگرس کا ایک گمڑھ بنارہا، ہندوستانی سیاسی تاریخ کا ایک بڑا معتمہ بنا ہوا ہے۔ عبدالغفار خان کی ذاتی مفاہطیت ہر اس شخص پر فوراً عیاں ہو جاتی ہے جس نے کبھی اس سے ایک لمحہ بھی گفتگو کی ہو۔ علاوہ انہیں اتما نژدی کے ایک قدیم معزز خاندان کا فرد ہونے کی حیثیت سے اس کا مرتبہ اور مہمنڈ لیڈر حاجی ترنگزئی کے ساتھ اس کا رشتہ ناظم اس بابت کے منظر تھے کہ وہ پٹھانوں کی خاصی تعداد کی قیادت کا حق رکھتا تھا۔ مزید برآں اس نے خدائی خدمت گاروں کو ایک خالص پٹھان پارٹی رکھا جس کے مقاصد مقامی تھے اور یوں اس نے اسے پٹھانوں کے مبہم قومی احساسات کا ایک دلکش ذریعہ اظہار بنا دیا۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ غفار خان ایک عوامی رہنما تھا۔ اس نے غریبوں کے لئے ایک طویل اور سخت جدوجہد کی اور ان کے لئے نہ صرف انگہ نیروں بلکہ ان کے اپنے اراکین و خواتین کے غلبے کے خلاف بھی لڑا۔ اس نے خدائی خدمت گاروں کا ایک جداگانہ وجود قائم رکھا جو عام پٹھان کے مفادات کے لئے وقف تھا۔ اس نے انہیں

ان کی زیر کاشت زمینوں کی ملکیت اور ان کے زمینداروں کے مکانات کا قبضہ دلوانے کا وعدہ کیا تھا۔ بدریج خوانین اپنی حیثیت کو بچانے کے لئے مسلم لیگ کی طرف متوجہ ہوئے۔ علاوہ انہیں انگریزوں نے انہیں چھوڑ کر نئے نظام کے لئے کانگریس سے جو ساز باز شروع کی تھی اس کا انتقام لینا بھی اسی طرح ممکن تھا۔

غفار خان کا گاندھی اور کانگریس سے تعلق اور منحنی بے گجراتی بنیئے کے لئے قوی ہیکل پٹھان کا احترام آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا۔ اس میں شک نہیں کہ غفار خان گاندھی کے بعض سماجی و اقتصادی اصولوں کا قائل تھا لیکن شروع میں ہی خدائی خدمت گاروں کو کانگریس سے ملانے کا اس کا مقصد اپنی تنظیم کو بچانا اور اس کے لئے قومی پشت پناہی حاصل کرنا تھا۔ آہستہ آہستہ خدائی خدمت گار کانگریس کے ساتھ یک جان دو قالب ہو گئے۔ چوتھے عشرے میں غفار خان کے ذہن میں یہ قدیم اصول مسلسل موجزن رہا۔ ”میرے دشمن کا دشمن میرا دوست ہے۔“ غفار خان کا دشمن انگلہ نہ تھا اور انگلہ نہ پر کوئی اور ایسی موثر چوٹ نہیں لگا رہا تھا جیسی مہاتما۔

یہ غیر قدرتی اتحاد انگریزی حکومت کے حاتمہ تک جاری رہا اور اکثر خدائی خدمت گاروں نے ۱۹۴۷ء کے ریفرنڈم میں ہندوستان کی بجائے پاکستان کے حق میں ووٹ دینا بھی گوارا نہ کیا لیکن ایک دفعہ جب فیصلہ ہو گیا اور سرحد نے پاکستان کا انتخاب کر لیا تو

خدائی خدمت گارتیری سے منتشر ہونے لگے۔ مسلمان مملکت کی قبولیت
میں بلا شک و شبہ ۱۹۴۷ء کے موسم خزاں کے فرقہ وارانہ کشت و خون
اور جلد ہی بعد کشمیر کے جہا دنے اہم کردار ادا کیا۔ جلد ہی غفار خان ایک
آزاد پٹھان ریاست کے مؤقف میں قریباً اکیلے رہ گیا۔ یہ اور بٹوارے
کے پُرجوش دنوں کے دیگر واقعات آئندہ باب دہم میں زیر بحث
آئیں گے۔

(۱۳) باب نہم

قبائلی بغاوت

تعارف:

پٹھانوں کی عسکری اور سیاسی تاریخ دیگر ہر بات سے زیادہ بغاوت کی ایک کہانی ہے۔ انہوں نے مغلوں، اپنے ہم نسل خاندانوں اور سکھوں کے خلاف بغاوتیں کیں۔ سب سے زیادہ انہوں نے برطانوی ہند کے خلاف بغاوت کی۔ بغاوت، اس کا نظریہ، اس کا عمل اور اس کے ثمرات ہی ہندوستان کے شمال مغربی کونے میں برطانوی حکومت کی تاریخ میں پٹھانوں کے اہم کردار کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس بغاوت کے متعلق پٹھانوں کے مرتب کردہ اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں اور برطانوی اعداد و شمار بھی ادھورے ہیں۔ بیسویں صدی کی چھوٹی چھوٹی مہمات کے مفصل حالات اب بھی نہیں ملتے۔ لیکن جتنے اعداد و شمار ملتے ہیں وہ متاثر کن ضرور ہیں۔

امپیریل گزٹیر آف انڈیا کے مطابق ۱۸۴۹ء سے ۱۹۰۲ء تک سرحدی

قبائل کے خلاف چوٹن (۴۵) مہات بھیجی گئیں۔ ۱۹۰۲ء سے ۱۹۴۷ء تک مہات کی متناسب تعداد قائم رہی

انیسویں صدی کی مہات میں برسرکار فوجی ۲۸۰ اتمان خیل کے خلاف ۱۸۷۸ء میں) سے لے کر ۴۰ ہزار (آفریدیوں اور اورکزئیوں کے خلاف ۱۸۹۷ء میں) تک رہے۔ پٹان جنگ و جدل کی روایت کے مطابق مقتولین و مجروحین عموماً کم رہے یعنی دو فیصد سے بھی کم گو ۱۸۶۳ء میں سید احمد کے پیروؤں کے خلاف ہم میں برطانوی افواج کو دس فیصد تک جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ بیسویں صدی میں جب قبائلی اسلحہ بہتر ہو گیا اور جدوجہد زیادہ تلخ ہو گئی تو یہ شرحیں بڑھ گئیں۔ پورے دور میں بغاوتیں باقاعدہ ہوتی رہیں۔ صرف ایک یا دو دفعہ ہی پانچ سال کا عرصہ بلاہم گزر سکا۔ پندرہ فتنہ ایام میں پانچ مہات سالانہ بھی عام تھیں۔

برطانوی حکومت کے ابتدائی سالوں میں بغاوت :-

مہات کی تعداد اور حجم سے زیادہ اہم ان بغاوتوں کا مزاج اور محرکات تھے۔ ابتداء میں انگریزوں اور پٹانوں کے درمیان اکثر معرکے سیدھے سادے اور غیر سیاسی تھے۔ نئے ارباب نظم و نسق اپنی موجودگی کا ثبوت دے رہے تھے اور قبائلی جو نئی حکومت کو زیادہ

۱۔ دی امپیریل گزیٹیٹر آف انڈیا، جلد ۱۹، ص ۲۰۸-۲۱۰

سنبھالنے کی سہ نہیں لیتے تھے اپنی آزادی کا ثبوت دے رہے تھے، ۱۸۵۷ء میں انتظامی سرحد کے اندر کے تمام قبائل میں سے صرف چند یوہڑی، دیہات میں بغاوت ہوئی اور پٹانوں کی عظیم بغاوت جس نے پشاور کے برطانوی انتظام کاروں کو حواس باختہ کر رکھا تھا۔ قبائل سے قریباً ہزار تعاض گزرتی۔ ۶۰-۱۸۵۹ء میں ایک طرف برطانیہ اور دوسری طرف کابل خیل وزیروں اور محسودوں کے درمیان وزیرستان کے مواصلاتی راستوں پر کنٹرول کے سلسلہ میں رستہ کشی شروع ہوئی تو اس سے بالاقاف لڑائی شروع ہو گئی اور محسودوں نے ٹانک تباہ کرنے کی کوشش کی۔ محسود علاقے پر حملے کی ایک برطانوی کوشش ناکام ہو گئی اور قریباً بارہ سال تک محسودوں اور انتظامیہ کے درمیان رابطہ منقطع رہا۔ کیونکہ انگریزوں نے ایک غیر مسلسل ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ ۸۰-۱۸۷۸ء کے دوران آفریدیوں، مہمندوں، تمشتوں، بھٹانیوں اور کابل خیل وزیروں کے خلاف چھوٹی چھوٹی مہمات کا ایک سلسلہ ضروری ہو گیا تاکہ دوسری جنگ افغان کے دوران برطانوی وقار اور مواصلات کو محفوظ رکھا جاسکے۔

لیکن ۱۸۷۹ء اور ۱۸۹۰ء کے درمیان سرحد میں بے چینی کا بڑا سبب میر احمد کے پیروکار تھے جو قبائلی علاقے کے دوران فساد اور ناقابل رسائی حصوں میں مسلسل موجود تھے۔ قبائل سید کے پیروکاروں کا زیادہ طویل اوقات تک تو کبھی ساتھ نہ دے سکے لیکن یہ پیروکار

کبھی کبھار قبائل کو مذہبی جنون کے بل پر اکسا دیتے تھے۔ اس کا نتیجہ کافروں کے خلاف ایک اور جہاد کی صورت میں نکلتا جنکی موجودگی اب جیسے جیسے پھیلتی جا رہی تھی ویسے ویسے ہی دل آزار ہوتی جا رہی تھی۔

سید کے پیروکاروں اور ان کے قبائلی اتحادیوں کے خلاف بڑی مہم ۱۸۶۳ء میں لڑی گئی اسے امبیلہ مہم کہا جاتا ہے کیونکہ زیادہ تر لڑائی اسی اہم درہ امبیلہ کے قریب ہوئی۔ گزشتہ سال سید کے پیروکاروں نے انگریزوں کے خلاف اپنے میعادِ جہاد کا اعلان کیا تھا۔ شمالی یوسفپور علاقے کا بیشتر حصہ سرحدی چھاپوں کے سواب میں انگریزوں نے زیرِ ناکہ بندی رکھا ہوا تھا لہذا قبائلیوں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سید کے پیروکاروں سے گھٹے جوڑ کر لیا۔ بنیر وال بھی آئے اور اتمان خیل اور مہندوں کے ٹانٹھے اور دیر، سوات اور باجوڑ کے فحلوٹ گروہ بھی شریک ہو گئے۔ ۹ ہزار سے زیادہ برطانوی فوجی درہ امبیلہ کی چوٹی پر جمع ہو گئے تھے۔ ان کا محاصرہ کر لیا گیا اور انہیں بری طرح بیرونی دنیا سے کاٹ دیا گیا۔ ایک ماہ سے زیادہ تک وہ ادھر ادھر نہ ہل سکے۔ دریں اثناء قبائل مذہبی گروہ سے بھی لڑ پڑے اور آپس میں بھی اور ان کا حملہ اپنی منطقی انتہا تک نہ پہنچ سکا۔ لڑائی کے نتائج فیصلہ کن نہ تھے لیکن سید کا گروہ مزید شمال کی طرف بنیر میں دھکیل دیا گیا۔

۱۸۶۸ء میں ۱۵ ہزار برطانوی سپاہی دریائے سندھ کے

مشرقی طرف کوہ سیام کے ساتھ ساتھ مارچ کرتے ہوئے نہایت طرآن سے گزرے۔ اس کا مقصد زیادہ تر برطانوی قوت کا مظاہرہ کرنا اور سید کے باقیات کو ڈرانا تھا جو وہاں بھاگ گئے تھے۔ اس کے علاوہ اس کا کوئی خاص جنگی مقصد نہ تھا۔

آٹھویں اور نویں عشرے میں مزید بغاوتیں اور مہمات ہوئیں لیکن ان کے پیچھے نہ کوئی جامع پالیسی تھی نہ مقصد اور پہاڑیوں میں انگریز راج اور پٹھان طاقت کے درمیان کوئی فیصلہ کن معرکہ آزمائی نہ ہو سکی۔ شاید ہی کوئی ایسا انگریز ہو جو امن اور ترقی کی آمد آمد کا متوقع ہو، البتہ یہ اغلب معلوم ہوتا تھا کہ تالیف قلب اور برداشت تدبیر کی طور پر بالآخر، پٹھانوں اور انگریزوں دونوں کو ایک قابل قبول سطح تعلق پر لے آئیں گے۔

فارورڈ پالیسی کے خلاف بغاوت ہر

لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ آخری عشرے میں نو مستحکم فارورڈ پالیسی کے دباؤ کے تحت سرحدی جنگ اور سیاسیات کی آب و ہوا بدلنے لگی۔ برطانوی قوت کا زیادہ سے زیادہ مظاہر ہو رہا تھا اور اس کے نیچے پہاڑیوں پر دست درازی کہہ رہے تھے سندھ میں کی گئی ایک پیش قدمی نے بعض جنوبی قبائل کے بلارک ٹوک افغانستان آنے جانے کے راستے کاٹ دیے تھے اور وزیروں اور

محمودوں میں دوبارہ بدامنی شروع ہو گئی تھی۔ قبائلی علاقے کے مقابل
سرے پر سرکھ سیاہ کے قبائل اس پر براہِ نگیختہ تھے کہ انگریزوں نے
پہاڑ کی چوٹی پر سے ایک مہم بھیج کر ۱۸۶۸ء کا کارنامہ دہرانے کی
کوشش کی تھی چنانچہ اکتوبر ۱۸۹۰ء میں قبائل نے فوج کو پہاڑ سے
واپس دھکیل دیا۔ ۱۸۹۱ء کے اوائل میں ایک برطانوی دستہ جو کہ
سامانہ کی رفعتوں کے ساتھ ساتھ پکٹ تعمیر کرنے کی کوشش کر رہا
تھا اور کنوئیں کے چلے کی زد میں آ گیا اور اسے پیا ہونا پڑا۔ (کہو
سامانہ کرم کو تیراہ سے الگ کرتا ہے)۔

۱۸۹۲ء میں انگریزوں نے وزیرستان اور افغانستان کے درمیان
ڈیورنڈ لائن کی حد بندی کی کوشش کی تو پونہ ملا کے تحت محمودوں
کی ایک بہت بڑی بغاوت ہوئی۔ اس کا نقطہٴ معراج وانا میں
برٹش باؤنڈری کمیشن کے کیمپ کی تباہی تھا۔ اس کے بعد انگریز
ٹوچی وادی پر براہِ راست قائم کرنے کے لئے بڑھے جو کھرور اور
رضامندوروں کا علاقہ تھا۔ کوہاٹ سے پٹانی نمک اہل کوہ کی
اضلاع سے بہت بڑی درآمد تھی لیکن انگریزوں نے اس پر ٹیکس
آٹھ آنے سے بڑھا کر دو روپے فی من (قریباً اسی پاؤنڈ) کر دیا تو
۱۸۹۷ء کے موسم گرما تک پورا سرحد سلگنے لگا۔

برطانوی فوجی قوت میں اضافہ، اضلاع میں انتظامیہ کی
سخت گیری اور ان دونوں کی پہاڑیوں میں توسیع سے اکثر قبائلیوں

نے یہ سمجھا کہ ان کی پہاڑیاں عنقریب پورے طور پر برطانوی ہند کے
 ڈھانچے میں ضم کر دی جائیں گی۔ اسے انہوں نے صحیح طور پر زندگی اور
 موت کا سوال سمجھا۔ یونانی تہ کی جنگ کے مبالغہ آمیز بیانات نے
 جلتی پر تیل کا کام کیا کیونکہ اس سے اسلام کے خلاف ایک لمبے چوڑے
 لیکن ناکام عیسائی جہاد کا پتہ چلتا تھا۔ آخری سنسنی برطانیہ کے
 قابل فہم انکار نے پیدا کر دی جو بعض قیدی عورتوں کو آفریدیوں کو
 واپس کرنے سے متعلق تھا جو قبائلیوں سے بھاگ کر زیر انتظام
 ضلعوں میں پناہ گزین ہوئی تھیں۔

وقت آپہنچا تھا کہ پٹھانوں اور انگریزوں کے درمیان واقعی
 قوت کا پہلا مظاہرہ و مقابلہ ہو۔ غالباً دونوں کم از کم کسی حد تک
 سمجھتے تھے کہ کیا ہو رہا تھا۔

۱۸۹۷ء کی بغاوت

۱۰ جون ۱۸۹۷ء کو ٹوپچی کا ایک پولیٹیکل افسر، مسٹر گی،
 مینزار میں پہنچا جو ٹوپچی وادی کے بالائی حصہ میں چھوٹے چھوٹے
 دیہات کا ایک جھرمٹ تھا اور مدائیل وزیر اس میں آباد
 تھے۔ گی کا فوری مقصد یہ تھا کہ قرب وجوار میں ایک چھوٹا سا
 قلعہ بنانے کے لئے جگہ کا انتخاب کر سکے۔ مینزار دیہات پچھلے سال
 ایک ہندو کو مارنے پر سرکار کے زیر عتاب تھے اور انہوں نے عائد کردہ

جرمانہ ابھی ادا نہ کیا تھا۔ گی کی غیر متوقع آمد اور اس کے ساتھ ایک غیر معمولی حفاظتی دستے نے انہیں ڈرا دیا۔ قبائلیوں نے اپنے ہی ضابطہ اخلاق یا پختون ولی کی بہت جبری طرح خلاف ورزی کی جو اس قبیل کی شاذ و نادر سرگرمیوں میں سے ایک تھی۔ گی اور اس کے رفقاء کو خوش آمدید کہہ کر اور انہیں کھانا کھلا کر انہوں نے بلا تینہ انگریزوں پر حملہ کر دیا۔ اکثر برطانوی فوجی افسر مارے گئے لیکن گی اور دستے کا کچھ حصہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

میزار محلے کی خبر سرحد کے طول و عرض میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ سوات میں ایک بنیر وال سید اللہ نامی المعروف بر ملا مستون (جسے انگریز دیوانہ ملا کہتے تھے) نے جہاد کا اعلان کر دیا۔ جولائی کے آخر میں اس نے اپنے ارد گرد چند لڑکے اور جوان اکٹھے کر لئے جن میں سے ایک کو اس نے شاہِ دہلی بنا دیا اور وہ جنوب میں درہ مالاکند کی طرف چل پڑے۔ چند دنوں میں ۲۰ ہزار قبائلی اس کے گرد جمع ہو گئے جنہوں نے چک درہ اور خود رے میں برطانوی چوکیوں پر ایک ہی وقت چلے کر دیئے۔ ایک ہفتے کی لڑائی میں ملا کی طرف ۳ ہزار اور انگریزوں کی طرف چند سو کے جانی نقصانات کے بعد لشکرِ شتابی اور پراسراریت سے جمع ہوئے تھے اسی سے وہ تیز تر ہو گئے۔

اگلے مہینے مہمندوں کی باری آ گئی۔ ۱۰ اگست کو ۵ ہزار کا

ایک لشکر جس میں قریباً ہر مہمند خیل کے عناصر تھے۔ اڈا ملک بنجیم الدین کی زیر سرکردگی ضلع پشاور کے سرے پر شبنم درہ میں نمودار ہوا۔ قبائلوں نے ایک قریبی گاؤں کو تباہ کر دیا جس میں کافی ہندو بھی رہتے تھے اور پشاور سے بہ عجلت تمام بھیجے گئے ایک فوجی دستے سے لڑے بغیر ہاٹیوں میں واپس چلے گئے۔

ایک ہفتہ بعد اور سنہ ۱۹۰۱ء میں سا مانہ چوٹی پر قائم کردہ چند برطانوی چوکیوں پر چوری چھپے گولیاں چلانا شروع کر دیں اور ان کا رابطہ منقطع کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ خیبر میں بھی اسی قسم کی مہم مٹا سید اکبر کے تحت چلی اور مہینے کے آخری ہفتے تک پورا درہ آفریدیوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ خیبر بلتستان کے بعض یونٹ جو درے میں مقیم تھے فرار ہو گئے لیکن بعض نے مقابلہ کیا اور مغلوب ہو گئے۔ حالانکہ ان کے برطانوی افسر شروع میں ہی واپس بلا لئے گئے تھے۔ دمو خاندان کو اقوام نے بھی برطانوی معیار رویہ کے لئے قبائلی احترام میں کوئی اضافہ نہ کیا، ستمبر کے آغاز میں ۱۵ ہزار سے زیادہ پر مشتمل آفریدی اور اورکزئی لشکر ہاٹیوں کے کناروں پر پھرتے پھرتے رہے اور ہانگوں کے قبضے کو خطرہ لاحق ہو گیا۔ وسط ماہ تک پشاور اور کوہاٹ سے کمک یافتہ برطانوی دستے پکٹے لگے تو لشکر واپس تیراہ کی وادیوں میں چلے گئے۔

اس پر بغاوت کا جنگی مرحلہ تو ختم ہوا لیکن انگریزوں

نے تالیف و تالیف کو ضروری سمجھا اور اس پر تین سال سے زیادہ لگے اور کل ۱۵ ہزار سے بھی زیادہ سیاہی حرکت میں رہے۔ مہمذوں، اور کنوینٹوں، آفریدیوں اور وزیروں کے خلاف اور سوات میں مہمات بھیجی گئیں۔ صرف تیراہ پر حملے میں ۱۸۹۸ء میں ۴۰ ہزار سے زیادہ فوجی سرگرم عمل رہے۔ ۱۰ ہزار کی مالاکٹڈ فیلڈ فورس رجواب اپنے ایک غیر اہم ترین رکن، ایک نوجوان سب آلٹرن، ونسٹن چرچیل نامی کی وجہ سے بے حد مشہور ہے (بھاری مزاحمت کے باوجود سوات اور بنیر میں نفوذ کر گئی۔

بھاری جرمانے عائد کئے گئے، بے شمار رائفلس ضبط کر لی گئیں۔ مارچ کے راستوں پر پکٹیں بنائی گئیں اور باجرا کٹھکے بھر گئے۔ امن و امان کے وعدے لئے گئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حالات اپنی اصلی کیفیت پر لوٹ گئے۔

تعجب خیز بات یہ ہے کہ محسودوں نے جو معمولی سے اشتعال پر ہی جنگ پر اتر آتے ہیں ۱۸۹۷ء کی بغاوت میں کوئی حصہ نہیں لیا لیکن وہ پوندہ ملا کے زیر قیادت لگے تین سال کے لئے مخالفت اور جارحیت کا ارتکاب کرتے رہے اور بالآخر ان کے مجموعی جیروٹنڈو پر انہیں ایک لاکھ روپے جرمانہ کیا گیا۔ انکا پرورد ستمبر ۱۹۰۰ء میں ان کی ناکہ بندی کر دی گئی جو اب محسودوں نے قبائلی علاقے کی پولیس اور ملیشیا چورکیوں پر حملے کئے اور ضلع بنوں کے کافی اندر کئی چھاپے مارے۔ برطانیہ

نے جوابی کارروائی کے طور پر ۱۲ ہزار سے زیادہ فوجیوں کو محسود علاقے میں بھیجا جو شورش پسند قبائلیوں کو تو مغلوب نہ کر سکے لیکن چند سالوں کے لئے قدرے امن و امان ضرور قائم ہو گیا۔

کہ زن نے فوجوں کو واپس انتظامی سرحد کے اندر بلانے کا جو عمل شروع کیا تھا وہ ۱۹۰۲ء میں مکمل ہوا اور اس سے نائٹوکانی کم ہو گیا اور ایک غیر معمولی نسبتاً پُر امن طویل دور شروع ہوا۔ لیکن یہ قابل غور ہے کہ آخر سرحد پہلے کیوں پھٹ پڑا تھا؟

۱۸۹۷ء کی بغاوت کے محرکات:

۱۸۹۷ء کی بغاوت کے اسباب پر ہم عصر برطانوی آراء مختلف اور منقسم تھیں۔ بعض افسروں کو یقین تھا کہ سرحد بھڑے شورش علاقے سے انگلیزیوں کو نکلنے کے لئے ایک بڑی سوچی سمجھی اور مربوط کوشش تھی۔ دوسروں کا خیال تھا کہ واقعات اضطراری اور غیر مربوط تھے۔ بعض انہیں مذہبی جنون سے منسوب کرتے تھے۔ زیادہ دور اندیش انہیں برطانوی پیش قدمی کے خلاف ایک ردِ عمل سمجھتے تھے جو چوتھے عشرے میں قبائلی علاقہ میں دیکھنے میں آ رہی تھی۔

گو معلومات جزواً جزواً ہیں مابہم ایسی کوئی شہادت موجود نہیں کہ حملوں میں ملوث قبائل میں کوئی مشترکہ منصوبہ بندی ہوئی تھی۔ حقیقت

یہ ہے کہ کوئی قبیلہ بھی یا تنظیم تھیں تھا اور نہ ہی کوئی ایسا رہنما تھا جو مذاکرہ کا اہل ثابت ہو سکے۔ لہذا اکثر متعلقہ برطانوی افسر آخر کار اس نتیجہ پر پہنچے کہ شورشیوں الگ الگ بلا ارادہ اور اتفاقی طور پر ہم وقت تھیں، مربوط منصوبہ بندی کے فقدان کا ثبوت تو یہیں مل جاتا ہے کہ محسوس وقت اس وقت اٹھے جب باقی تمام قبائل واپس آ گئے تھے یا پیا ہو چکے تھے۔ انگریزوں پر حملوں کے اوقات و مقامات کا تعین زیادہ تر اس وقت برطانوی افواج و عمال کی تعیناتی سے مطابق کیا گیا جب مختلف قبائل نے میدان میں کودنے کا فیصلہ کیا۔ جہاد کی دعوت کسی ایک رہنما نے نہیں دی بلکہ درجنوں مقامی رہنماؤں نے اپنے اپنے طور پر دی، گوان میں سے بعض، خاص طور پر زیادہ تر ملائیک دوسرے، ہندوستان میں اپنے محترم رفقاء اور شاہد ترکی میں اپنے رفقاء سے تعلق رکھتے تھے، بغاوتوں میں مذہبی جنوں نے یقیناً ایک اہم کردار ادا کیا۔ سوات کے ملا مستون کے متعلق مشہور تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے سراماتی طاقت دی تھی۔ محمودوں کی بغاوت عین محرم کے قریب ہوئی جو اتھائی مذہبی جذبہ کا دور ہوتا ہے اور یہ غالباً سراسر اتفاقی نہیں تھی۔

کیسی جیسا کہ ڈیولیس نے ۱۸۹۷ء کی بغاوت کا محتاط اور مفصل مطالعہ کرنے کے بعد نتیجہ نکالا ہے کہ اس کا بڑا سبب غالباً فارورڈ پالیسی تھا۔ وہ لکھتا ہے ”سرحدی پٹھان کے لئے ایک مہیب پنجمہ فرولا دی نمودار ہوا جس کی انگلیاں آخری عشرے میں اس کو اپنی گرفت میں لیتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ برطانوی افواج سے معمور الگ تھلگ قلعے اس کے علاقے میں سے گزرتے ہوئے تجارتی راستوں پر نظر پڑ جاتے ہوئے تھے یا اس کے ولایتی گاؤں یا بلند و بالا کھیتوں کو کھورتے تھے۔ چمکدار سفید سڑکیں سانپوں کی طرح بل کھاتی ہوئی اس کے پہاڑی قلعوں کو گھیرتی ہوئی معلوم ہوتیں۔ حد بندی کمشن کے نقش قدامت پر سفید سرحدی برہوں کی لمبی لمبی قطاریں ابھرائی تھیں جو اس کے علاقے کو گھیر رہی تھیں اور اس کی آزادی کو مخدوش کر رہی تھیں جو اس کا سرمایہ اختیار تھی“۔

سوات سے وزیرستان تک اس پر پٹھان کا ردِ عمل جانے بوجھے تشدد کی بجائے جیلی تھا۔

زرکاخیل !

۱۹۰۸ء میں زرکاخیل آفریدیوں کے خلاف برطانوی مہم ادا کر

صدی کی شورشوں پر ایک قسم کا فٹ توٹ یا حاشیہ ہے۔ سرحد میں
بیسویں صدی کے پہلے عشرے کی ہریز کی مانند یہ ۱۸۹۷ء کی بغاوت
سے متعلق تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کا ایک اپنا تاثر بھی تھا جو
اس مشہور ترین آفریدی طلٹے سے مخصوص تھا۔

زکاخیل پیدائشی قزاق تھے اور وہ اس پرنازاں تھے۔ وہ
افغانوں، انگیزیروں، ہر قومیت کے راہگیروں، دیگر آفریدی خیلوں
حتیٰ کہ ایک دوسرے کو بھی ٹوٹتے تھے۔ سب سے زیادہ وہ میدانوں
کے امیر ہندوؤں کو ٹوٹنا پسند کرتے تھے۔ وہ افغانان اور سرحد
کے دوسرے حصوں کے چوروں کے گروہوں کی مدد کرتے اور
انہیں پناہ دیتے تھے، ۱۸۹۷ء کے واقعات کے بعد ”امن بے امن“
کے دور میں زکاخیل علاقہ خیبر کے بالائی حصوں میں چوروں کا
ایک چاق و چوبند گروہ بن گیا۔

ستمبر ۱۹۰۴ء میں ایک زکاخیل گروہ نے ضلع کوہاٹ کے
ایک امیر ہندو سوداگر کو اس کے گھر میں ٹوٹا اور قتل کر دیا اور
تغائب کنندگان میں سے پانچ کو مار دیا اور چھ کو زخمی کر دیا۔ یکے
بعد دیگرے پشاور کے مضافات میں مزید چھاپے مارے گئے۔
دولت ملنے کے ساتھ ساتھ چھاپہ ماروں کا اسلحہ بھی بہتر ہو گیا
اور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک زکاخیل اور ان کے ہم پیشہ افراد
نے سرحدی علاقے اور اضلاع کوہاٹ و پشاور میں دہشت پھیلا

وہی۔ رائفلیس بڑی تعداد میں خلیج فارس سے براستہ افغانستان و بلوچستان ناچانہ طور پر درآمد کی گئیں اور زکاخیل قانون شکنوں کے گمروہ دیہات پر حملے کرتے۔ پولیس پارٹیوں کی گھات لگانے اور باقاعدہ فوجیوں سے ٹکرا لینے میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے لگے۔ ایک موقع پر زکاخیل نے پشاور کے ایک ای اے سی کو بھی اغواء کرنے کی کوشش کی ۲۸ جنوری ۱۹۰۸ء کو ایک زکاخیل گمروہ نے پشاور شہر کے اندر ایک امیر ہندو ساہوکار چیلارام کے گھر کا محاصرہ کر لیا اور ایک لاکھ روپے کی لوٹ مار کر کے رفوچکے ہو گیا۔

زکاخیل بائٹہ طور پر بہت عرصے سے اپنے وظائف سے محروم ہو چکے تھے اور ۱۹۰۸ء تک ان پر اتنے جرمانے ہو چکے تھے کہ وہ نہ صرف ضبط شدہ وظائف بلکہ مزید تین سالوں کے وظائف کی رقومات کے برابر تھے۔ نتیجتاً ان کے خلاف ایک مہم بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ برطانوی افسروں کے درمیان اس مسئلہ پر کافی بحث مباحثہ کے بعد کہ آیا زکاخیل علاقہ مستقل نظم و نسق کے تحت لایا جائے یا نہ لایا جائے یا اس پر محض ایک حملہ کیا جائے۔ بالآخر ایک دستہ روانہ ہوا جسے غالباً پہلی دفعہ دیگر آفریدی خیلوں کا کسی قدر

تعاون حاصل تھا۔

کچھ معمولی لڑائی کے بعد بدنام ترین ڈاکو گروہ سرحد پار بھاگ گیا۔ زکاخیل ملوک نے پشیمانی کا اظہار کیا اور دیگر آفریدی طاقتوں نے زکاخیل کے اچھے رویہ کی ذمہ داری قبول کر لی اور یوں برطانوی راج کے خلاف زکاخیل کی ذاتی بغاوت کا سب سے اندوہناک مرحلہ ختم ہوا۔

وزیرستان ۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۰ء

۱۹۱۹ء میں وزیرستان میں جوہل چل شروع ہوئی وہ ۱۸۹۷ء کی بغاوت کے مقابلے پر اتنی بے ارادہ نہ تھی۔ تیسری جنگ افغان اور کابل سے ایک باقاعدہ تحریک سے متاثر، ۱۹۱۹ء کی بغاوت اس وقت رونما ہوئی جب قبائلی علاقے پر برطانوی دباؤ نبٹنا ہلکا تھا لیکن اس نے جلد ہی ایسے رخ اختیار کر لئے جو برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے لڑائی کے ہو سکتے تھے اور یہ ۱۸ گستاخ ۱۹۱۹ء کے اینگلوا فغان معاہدہ راولپنڈی کے بعد دیر تک جاری رہی جس نے افغانستان اور برطانوی ہند کے درمیان رسمی جنگ کو ختم کر دیا تھا۔

۱۸۹۷ء کے بعد کے دو عشروں میں جنگ و جدل طریقوں کی نوعیت میں بہت فرق پیدا ہو چکا تھا۔ ۱۹۱۹ء تک بہت سے

قبائلیوں نے یونیر، ملیشا یا افواج ہند میں رہ کر کچھ فوجی تربیت اور جنگی تجربہ حاصل کر لیا تھا مثلاً ۱۹۲۰ء میں صرف وزیروں اور محسودوں میں ہی اندازاً ۳۰ ہزار سابقہ فوجی تھے۔ اس کے علاوہ قبائلی علاقے میں اندازاً ۴۰ ہزار لاکھ جدید رائفلیں اور ان گنت توپے دار بندو قیں، چھاتی بندو قیں اور دیگر دلیبی آلات تھے۔ وزیروں کے پاس اپنے قریباً ۲۳ ہزار جنگ بازوں کے لئے اندازاً ۱۱ ہزار جدید رائفلیں تھیں۔ محسود غریب ترین اور الگ تھلگ ترین قبیلہ ہونے کے باوجود اپنے ۱۶ ہزار جنگ آزماؤں میں سے ۲ ہزار کو موثر آلات سے مسلح کر سکتے تھے۔ بعض حالات میں قبائلی اسلحہ پولیس اور ملیشا کے اسلحہ سے بہتر تھا کیونکہ ان میں سے بعض ابھی تک دقیانوسی این فیلڈ اور سائیڈ رائفلوں سے ہی مسلح تھے۔ ۲

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا تھا اور وانا کے خلاف افغان کارروائیوں کے بعد ملیشا میں سے بڑے پیمانے پر لوگ مفروضہ ہو گئے اور غدر

۱۔ گورنمنٹ آف انڈیا، جنرل سٹاف اور آپریشن ان دزیرستان، ۲۰ - ۱۹۱۹ء

(کلکتہ، سنٹرل پبلی کیشنز برانچ، ۱۹۲۱ء) ص ۵

۲۔ مورل اینڈ میٹریل پراگریس آف انڈیا، ۲۹ - ۱۹۲۸ء، ص ۲۶

بھی ہوا ۱۸۹۷ء کی طرح انگریزوں نے جلد ہی اپنا عملہ واپس بلا لیا اور وفادار یونٹوں کو نکال لیا۔ یہ ٹوچی اور ٹانک زم سے آتے ہوئے بری طرح کھٹے رہے اور ان کے گودام اور بارود کا بیشتر حصہ بھی ضائع ہو گیا ۲۶ مئی ۱۹۱۹ء کو میران شاہ کے ۲۰۰ ملیشیا سپاہیوں نے بغاوت کردی اور انہوں نے ڈوگرہ یونٹوں کو پیا کر دیا جو انہیں ڈرانے کے لئے بھیجے گئے تھے۔ اسی دن وانا میں متعین وزیر اور آفریدی ملیشیا نے بھی بغاوت کردی اور بارود کے ۶ لاکھ رائونڈ قبضہ لئے۔

جون کے اوائل تک ٹوچی اور ٹانک زم سے لے کر جنوب میں جنڈولہ تک سارا علاقہ برطانوی گرفت سے آزاد ہو گیا۔ جب افغانوں کے ساتھ صلح ہو گئی اور صورتحال کچھ مستحکم ہوئی تو انگریزوں نے وزیرستان میں قبائلی کو شرائط اطاعت بھجوائیں (شمال میں بغاوت شروع میں ہی ناکام ہو گئی تھی) ٹوچی وزیروں نے شرائط قبول کر لیں اور ان کی وادی پر گرفت خاصی جلدی دوبارہ قائم ہو گئی۔ وانا کے وزیروں اور محسودوں نے امن قائم کرنے سے انکار کر دیا اور ۱۹۱۹ء کی ابتداء میں ایک بڑا دستہ جنوبی وزیرستان میں حرکت میں آیا۔ اس کا ہدف محسودوں کا الگ تھلگ دارالحکومت کنی گورم تھا۔

کنی مہینوں کی سخت لڑائی کے دوران ہم کنی گورم پہنچی اور

اس نے اسے اور ارد گرد کے دیہات کو خوب لوٹا۔ انتقامی دسے کو یہ
 قیمت ادا کرنا پڑی ۱۹۵۵ء اور ۲۰ فروری ۱۹۲۰ء کو ماکن کے قریب
 معرکے میں مقتولین و مجروحین کی تعداد سے بخوبی ظاہر ہو جاتی ہے۔
 انگریزوں کی طرف سے ساٹھ مارے گئے اور اکانوے زخمی ہو گئے۔
 محمود بائیس مارے گئے اور اڑتالیس زخمی ہو گئے۔ مزید کئی ہفتوں
 کی جلاؤ اور فرار ہو جاؤ، سکھار روائی کے بعد دستہ مئی ۱۹۲۰ء
 میں محمود علاقے سے واپس آ گیا۔ محمودوں نے کبھی رسماً صلح قبول نہیں
 کی اور نہ ہی ان سے مطلوبہ رانفلیں اور تادان جنگ موصول
 ہوا۔ ادھر ادھر مزاحمت ۱۹۲۱ء تک جاری رہی جس کی قیادت
 حاجی عبدالرزاق اور ملّا بشیر کر رہے تھے جو سید احمد کی جماعت سے
 محمودوں کو بھڑکانے آئے تھے۔ پوری مہم میں لڑائی بہت سخت
 رہی اور محمود لشکروں نے جو بعض اوقات ۴ ہزار تک ہوتے
 تھے میدان جنگ میں برطانوی فوجیوں کے برابر کی چوٹ ثابت
 ہوئے۔ ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق محمود ایسے لڑے جیسے وہ
 پہلے کبھی نہ لڑے تھے۔ ان کے حملے بہت منظم اور گولہ باری اور سالوں
 کے دھاروں کی ہم وقتی اعلیٰ پائے کی تھی۔

۱۔ ایضاً، ص ۱۳۵ تا ۱۳۶

۲۔ مورل اینڈ میٹریبل پرائگریس آف انڈیا، ۱۹۲۱ء، ص ۸

۳۔ ایضاً، ۱۹۲۰ء، ص ۷

محمودوں کے خلاف ۲۰ - ۱۹۱۹ء کی برطانوی ہند کی مہم پر
 کی خرچ اندازاً دس لاکھ پونڈ سے زیادہ آیا جو افغانستان کے ساتھ
 باقاعدہ جنگ پر خرچ سے کئی گنا زیادہ تھا، ۸۰ ہزار سے زیادہ
 فوجی دشمولہ بہ قریباً ۴۰ ہزار غیر متحارب، ۱۰ ہزار بیکار رہے ۵ ہزار
 سے زیادہ نفوس ہیضہ اور دیگر بیماریوں کی نذر ہوئے۔ انتقامی مہم
 کے دوران قریباً ۵۰۰ مارے گئے اور ۲ ہزار زخمی ہوئے؛

۲۰ - ۱۹۱۹ء کی مہم کی ناکامی انگریزوں پر بھی اتنی ہی عیاں تھی
 جتنی قبائلیوں پر جب دستے کو سوار کیا گیا تھا تو اس بنیاد پر پی گوم
 کا مستقل قبضہ مقصود تھا کہ غیر ذمہ دار اور نراج پسند محمودوں میں
 نہ ایسے رہنا تھے نہ گروہ جن پر امن قائم رکھنے کے سلسلے میں بھروسہ
 کیا جاسکتا تھا، اگر امن پر اتفاق ہو بھی جاتا، اسی کے پیش نظر
 انگریزوں نے شروع میں دیہات اور فصلوں کو تباہ کرنے کا نہ سہارا
 تھا کیونکہ یہ قابضی فوج کی ضروریات کے لئے مطلوب ہوتے، لیکن
 براتی کرنزی پالیسی جو انتظامی سرحد سے پرے کسی مستقل عملہ کو شجر
 ممنوعہ سمجھتی تھی اب بھی جاری و ساری تھی لہذا اس خیال کو جلاؤ

نور-سی۔ ای۔ بردس "وزیرستان ۳۷ - ۱۹۲۶ء" ڈاکٹر شوٹ! گیل اینڈ

پولیٹن ۱۹۳۸ء، ص ۲۷، ص ۱۷۲ تا ۱۷۳

اور فرار ہو جاؤ،“ کے طریقے میں بدل دیا گیا۔ اس کے توہین آمیز نتائج نے ایک اور پٹختی دی اور رزمک پالیسی کے ظہور کا سانسہ ہمارا ہو گیا جس پر پہلے ہی باب ہفتم میں بحث ہو چکی ہے۔

۳۱-۱۹۳۰ء کی شورشیں پہلے ہی قدرے تفصیل کے ساتھ باب

ہشتم میں بیان کی جا چکی ہیں۔ وہ قبائلی بغاوتوں کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں لیکن ہندوستان کے دیگر حصوں میں ہونے والے واقعات سے ان کے تعلق نے انہیں ہندوستان کے ساتھ سرحد کے تعلقات کے سیاق و سباق میں ایک بڑی معنویت دے دی ہے جو محض سرحد پر قابو کے لئے پٹھان انگریز کشمکش کا حصہ ہونے کی حیثیت سے نہیں حاصل نہ ہوتی۔ مزید برآں آفریدی بغاوت میں ڈکیتی کے بھی بعض عناصر تھے۔ نسبتاً بڑائی کم، ہونی اور آخری فیصلہ عسکری سے زیادہ سیاسی تھا۔

وزیرستان ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۸ء۔

پٹھانوں اور انگریزوں کے درمیان اگلا بڑا مقابلہ قوت ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ منظر پھر وہی وزیرستان تھا۔ بڑا اداکار حاجی مرزا علی خان فقیر اپنی تھا جو اتانہ نئی وزیروں کا ایک توری خیل ملا تھا اور وہ ۱۹۴۰ء میں اپنی موت تک سرحد کا بدنام ترین دشمن بنا رہا۔

وزیر ستانی قبائل چوتھے عشر کے وسط میں کئی وجوہات کی بناء پر بیخ پاتھے۔ وانا اور رزمک کے مضبوط دستوں نے ان کی سرگرمیوں پر جو پابندیاں عائد کر دی تھیں وہ ۱۹۳۱ء میں منظر عام پر آگئی تھیں۔ مختلف طاقتوں کے اندر اور ان کے درمیان خاصی کھینچا تانی تھی۔ مثلاً توری خیل وزیر اپنے قبائلی وظیفہ کی اندرونی تقسیم پر نالاں تھے۔ بوڑھے ملوک جنہوں نے ۲۰ - ۱۹۱۹ء کی لڑائی میں نام پیدا کیا تھا اور جن میں سے بہت سے اب برطانوی دستوں کی نفع بخش رسد رسانی کے ٹھیکے دار تھے اپنا اثر و رسوخ کھو رہے تھے۔ نوجوان نسل ایک اور جہاد کے لئے بے قرار تھی تاکہ دادِ شجاعت دے سکے اور وہ آتش بیاں ملاؤں جیسے اپنی کے عقیدت مند حاضرین بن گئے تھے۔

ہندوستانی سیاسیات سرحد پر زیادہ سے زیادہ اثر انداز ہو رہی تھی۔ اسلام بی بی اور مسجد شہید گنج کے واقعات نے مذہبی جنون کو ہوا دی تھی۔ ۱۹۳۶ء میں فقیر اپنی نے جو ابھی تک نسبتاً گمنام تھا دُوروں کا ایک لشکر تیار کیا جن میں وہ وادی ٹوچی میں رہتا تھا اور بنوں کو خطرہ لاحق ہو گیا کیونکہ مطالبہ کیا گیا کہ اسلام بی بی اس کے شوہر کو واپس کی جائے۔ توری خیل ملوک نے اپنی کے پر پیچ لینے سے معذوری کا اظہار کیا جب تک انگلیز قبیلے کے سرپھروں کے خلاف ان کی مضبوط حمایت کا مظاہرہ نہ

نہ کہیں۔

انگریزوں نے ایسا کرنے کے لئے ایک پرانے منصوبے کو زندہ کیا جس کے تحت ٹوچی کی تنگ بگلی وادی میں سڑک بنانا تھی اور جہاں اپنی اور اس کے پیرو جاگزیں ہو چکے تھے۔ ۲۵ نومبر ۱۹۳۶ء کو دو بریگیڈ مختلف سمتوں سے وادی میں داخل ہوئے تاکہ تعمیر سڑک کے لئے علاقے کو صاف کیا جاسکے۔ دونوں دستے قریباً ایک ہی وقت بھاری گولہ باری کی زد میں آ گئے اور دونوں کی لڑائی نہیں انیس مارے گئے اور ۱۰۰ سے زیادہ زخمی ہوئے۔ ایک نئی اور بڑی مہم کو سوار کرایا گیا اور یہ وادی میں بلا مزاحمت گھسستی چلی گئی۔ مقامی ملوک کے ساتھ ایک قسم کا معاہدہ ہو گیا لیکن اپنی محسود علاقے میں بھاگ گیا جہاں وہ وادی ٹسکٹو میں ارسل کوٹ کے مقام پر جاگزیں ہو گیا۔

اب فقیر کی شہرت ہندوستان بھر میں پھیل گئی۔ اس نے صدر مقام سے اس نے توری خیل اور محسود نوجوانوں کے متعدد چھوٹے چھوٹے گروہ منظم کئے اور انہیں ایک وسیع علاقے میں برطانوی عملے اور تنصیبات پر حملے کے لئے بھیجنے لگا۔ ۶ فروری ۱۹۳۷ء کو محسودوں نے جنوبی وزیرستان کے سکاوٹس کے ایک برطانوی کیپٹن کو مار دیا۔ اگلے دن وادی ٹوچی میں ایک انگریز اسسٹنٹ پولیٹیکل افسر کو مار دیا گیا جو خاصہ داروں کی

تختواہ ادا کرتے جا رہا تھا۔

ان واقعات کے بعد زیر انتظام اضلاع میں چھاپوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا جن میں ہندوؤں کو بہت نقصان اٹھانا پڑا، ۳۱ اغواء کئے گئے، ۱۰ مارے گئے اور ۶۰ کے مکان لوٹے اور جلانے گئے۔ ۹ اپریل کو دانا سے آنے والے ایک کانوائے پر شہر تنگی میں ایک لشکر نے کمین گاہ سے حملہ کیا جو ایک جلال خان محسود، خونیا خان کے تحت تھا اور کئی انگریز افسر مارے گئے۔

جواباً ایک بڑی برطانوی مہم ۲۳ اپریل کو روانہ ہوئی تاکہ مخالفوں اور ان کے محافظوں کو منرا دی جاسکے اور ایپی کو واپس لایا جاسکے۔ دو ماہ کی معرکہ آرائی کے دوران ۲ ہزار باقاعدہ فوجی اور ۵ ہزار سکاؤٹ مصروف کار رہے۔ سخت لڑائی کے بعد جس میں ۱۰۰ فوجی مرے یا زخمی ہوئے اور سل کوٹ پر قبضہ کر لیا گیا۔ اپنی مزید جنوب کی طرف بھٹانیوں کے ہاں پناہ گزین ہوا جہاں اس نے نیا لشکر اکٹھا کرنا شروع کیا۔ برطانوی مہم پر کل خرچ ۱۲ تا ۱۵ لاکھ پونڈ تھا۔ موسم گرما کے آخر تک محسود توری خیل اور بھٹانی عناصر

کے ساتھ ایک قسم کا معاہدہ امن ہوا۔ یہ زیادہ عرصہ قائم نہ رہا۔ ایپی کے ایک بڑے نائب، محمود ملا شیر علی نے ایک چھوٹا سا لشکر اکٹھا کیا جو زیادہ تر پیشہ ور قانون شکنوں اور تخریب کاروں پر مشتمل تھا اور ۱۹۳۷ء کے پورے موسم خزاں اور سرما میں بڑا ٹوٹی موٹا علاقائی لائنوں پر حملے کرتا رہا۔ ایک مرحلے پر قریباً ۱۰ ہزار فوجوں کو محض مواصلات کی حفاظت کے لئے متعین کرنا پڑا۔

ذہین و فطین اور ہر جگہ حاضر فقیر انگریزوں کی گرفت سے بچتا رہا یا وجود اس کے کہ اس کی بدلتی ہوئی کمین گاہوں پر بمباری بھی کی گئی اور اسے زندہ یا مردہ پکڑنے پر گمراہ ہوا انعامات بھی پیش کئے گئے۔

۱۹۳۸ء کے موسم بہار میں جنوبی وزیرستان کے سکاوٹوں کا ایک دستہ قریباً یلست و نابود کر دیا گیا اور ان کا انگریز کمپین شیر علی کے آدمیوں نے سپلی ٹوٹی پر مار دیا۔ تھوڑے عرصہ بعد ٹوچی میں وٹاخیل چوکی محصور کر لی گئی۔ لڑائی میں ایپی کے آدمیوں نے چند توپیں بھی استعمال کیں جن کا ماحذنا معلوم تھا ۲۳ جولائی کو ۴۰۰ کے ایک لشکر نے ایپی کے ایک نائب اور خٹک قانون شکن، خلیفہ مہر دل کے تحت بنوں شہر پر حملہ کیا جس نے ۱۳ ہندو مار دیئے اور ۲۰ زخمی کر دیئے اور ایک لاکھ روپے کی لوٹ مار کر کے فرار ہو گئے۔

اس وقت تک ایپی رزمک کے مغرب میں گور وینجت کی
چٹان میں غار بہ غار چھپتا پھرتا رہا جو قریباً افغان سرحد پر تھی پٹ
دو بریکٹڈ اس جگہ پہنچنے میں ناکام رہے جس کی وجہ مزاحمت سے
زیادہ انتہائی اونچا نیچا علاقہ تھا جس سے انہیں سابقہ پڑا۔ بعد میں
گور وینجت پر ہوائی حملے بھی کچھ نہ کر سکے اور اپنی اپنی بقیہ زندگی
اسی سرحدی صدر مقام میں رہا۔ مزاحمت کا جو ڈھب اس نے
اختیار کیا تھا وہ ہندوستان میں باقی ماندہ برطانوی حکومت
تک جاری رہا۔

امن و امان کا مسئلہ :-

برطانوی راج کے خلاف پٹھان بغاوت دقتاً فوقتاً عوامی
شوشوں تک ہی محدود نہ تھی، لیکن شاید برطانوی پہلو کا کانٹا
زیر انتظام ضلعوں اور قبائلی علاقہ دونوں میں روزمرہ کی قانون

۱۹۵۴ء میں ایک مغربی صحافی موسم گرما میں اس سے ملا۔ دیکھتے کر سٹو فرمینڈ
"اور فارمننگ کار سپانڈنٹس فرام دی سویٹ ٹو دی پٹر" دی نیویارکر فروری
۱۹۵۵ء، ص ۱۰۰ تا ۱۱۵، اس کے بہت سے نامیہ نے اسے چھوڑ کر
پاکستان سے صلح کر لیا۔ ان میں خلیفہ مہر دل بھی شامل ہے جس نے ۱۹۵۴ء میں
ہتھیار ڈال دیے۔

شکنتی تھا۔

انگریزوں کے لئے امن قائم رکھنے کا کام خاص طور پر اس لئے مشکل ہو گیا کہ پٹانوں کے پاس بہت بھاری و قراواں اسلحہ تھا جو بیسویں صدی میں حیرت انگیز طور پر بڑھ گیا۔ ۱۹۰۵ء میں اندازہ لگایا گیا تھا کہ قبائلی علاقہ میں ۲۹ ہزار توڑے دار بند و قبیلہ تھیں۔ ۱۹۲۱ء تک یہ ایک لاکھ ہو گئی تھیں اور ۱۰ سال بعد ۲۰۲۶ لاکھ۔ آج کل یہ اس سے بھی کئی گنا زیادہ ہیں۔ صنعتوں میں لائسنس کے ذریعے اسلحہ کو محدود کرنے کی بہت عرصے سے کوششیں کی گئیں لیکن قواعد و ضوابط کا احترام ان کو ماننے سے زیادہ توڑ کمر ہی کیا جاتا تھا اور چوتھے عشرے کے آخر میں کم از کم ۵۰ ہزار مزید رائفلیں پانچوں صنعتوں میں غالباً عام لوگوں کے قبضے میں تھیں۔ برصغیر تدارک ان اعداد و شمار میں بے شمار پستول، ریواور اور کافی خود کار ہتھیار شامل نہیں ہیں جو کسی نہ کسی طرح قبائلی ہاتھوں میں پہنچ گئے ہیں۔ آخر میں یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ ہر پٹان کے پاس کم از کم ایک خنجر تو لازماً ہوتا ہے۔

۱۔ این ڈیو ایف انکوارٹری رپورٹ، ص ۱۵

۲۔ مورل اینڈ میٹریٹل پراگریس آف انڈیا، ۳۰-۱۹۲۹ء ص ۲۶ انڈیا

۳۱-۱۹۳۰ء ص ۱۲ -

صوبہ سرحد میں امن و امان کے ذمہ دار حکام کا اہم ترین اور
مشکل ترین کام ہمیشہ وکٹوریائی زبان میں "وائچ اینڈ وارڈ" (نگرانی
اور بچاؤ) رہا۔ پورے برطانوی دور میں زیر انتظام ضلع پہاڑی
چھاپوں کی زد میں رہے۔ گو بعد کے سالوں میں چھاپوں کی تعداد
قدرے کم ہو گئی تاہم ان کی وسعت و شدت اسی نسبت سے
بڑھ گئی۔

ان چھاپوں کا مقصد عموماً ایک یا تین کام متراج ہوتا تھا۔
مقبول ترین محض لوٹ مار تھا۔ اس کا ہدف ایک خوشحال ہندو
سوداگر یا گاؤں یا برطانوی رسد پویا کانوائے ہوتا تھا جس سے
رائے فیس مل سکتی تھیں۔ غالباً دوسرا محرک زیر انتظام علاقے میں کسی
دشمن یا اس کے محافظ سے عمومی یا خصوصی انتقام ہوتا تھا۔ مثلاً
بہت سے چھاپے برطانوی راج کی مخالفت کے لئے مارے جاتے
تھے۔ برطانوی ہند پر سرحد پار عناصر کے چھاپوں کا جدول
۱۹۲۰ء تا ۱۹۳۸ء حسب ذیل ہے۔

سال	چھاپے	سال	چھاپے	سال	چھاپے
۱۹۲۰-۲۱ء	۳۹۱	۱۹۲۱-۲۲ء	۱۹۴	۱۹۲۲-۲۳ء	۱۳۱
۱۹۲۳-۲۴ء	۶۹	۱۹۲۴-۲۵ء	۳۹	۱۹۲۵-۲۶ء	۳۰

سال چھاپے سال چھاپے سال چھاپے سال چھاپے

۱۰ ۱۹۲۸-۲۹ ۱۸ ۱۹۲۷-۲۸ ۱۹ ۱۹۲۶-۲۷

۲۱ ۱۹۲۱-۲۲ ۱۷ ۱۹۲۰-۲۱ ۴ ۱۹۲۹-۳۰

۲۱ ۱۹۳۴-۳۵ ۸ ۱۹۳۳-۳۴ ۱۷ ۱۹۳۲-۳۳

۷۴ ۱۹۳۷-۳۸ ۳۷ ۱۹۳۶-۳۷ ۲۸ ۱۹۳۵-۳۶

(بارڈر ایڈمنسٹریشن رپورٹیں ۱۹۲۰ء تا ۱۹۳۸ء سے ماخوذ)

چھاپوں میں بھاری نقصان ہوتا تھا مثلاً ۱۹۱۹ء میں صرف

ڈیرہ اسماعیل خان میں نقصانات مندرجہ ذیل تھے۔

مسلمان ۱۰۷، اغواء ہوئے ۴، مارے گئے ۵۱، زخمی ہوئے

اور ۳۳،۲۳۱۵ روپے کا سامان لوٹا گیا۔

ہندو ۱۸، اغواء ہوئے ۸، مارے گئے ۱۰، زخمی ہوئے اور

۲۶، ۳۸ روپے کا سامان لوٹا گیا بجز مزید برآں ۳۰ سے زیادہ

حلقے رانقل چوری کے لئے فوجی ملازموں اور عملوں پر کئے گئے۔

اسی سال پورے صوبہ سرحد پر داسوائے ہزارہ، کل ۶۱۱،

چھاپے مارے گئے جن میں ۲۹۸، مارے گئے ۶۳، اغواء ہوئے

۳۹۲، زخمی ہوئے اور ۳۰ لاکھ روپے کی منقولہ جائیداد چرائی گئی

امن وامان کی تنظیمات صرف اہم چھاپوں کو پسپا کر سکیں اور کل قبائلی

نقدانات ۱۱۹، اموات، ۸۰، زخمیوں اور ۴۰ گر فٹاروں پر مشتمل تھے۔

ضلعوں کے اندر سے امن و امان کے لئے خطرہ کا سدباب بھی اہم مسئلہ تھا۔ مثلاً ۱۹۱۰ء میں صوبے میں ۴۴ قتل کی وارداتیں ہوئیں۔

ان کے محرکات کا ذکر بھی مالی ازدبچسپ نہیں، ان میں سے ۱۴۹

مردوں عورتوں کے ناجائز تعلقات، ۹۶، ڈکیتی، ۵۸، خونیں

انتقام، ۳۶۰، زمینی تنازعات اور باقی ۱۳۵، متفرق وجوہات کی

بنیاد پر سرزد ہوئے ۱۹۳۸ء تک قتل کی وارداتیں سالانہ ۷۰۲

تک پہنچ گئیں اور جرائم اپنی انتہا تک پہنچ گئے جب صوبائی

پولیس کو کل ۱۱۲۲۵ مقدمات نمٹانے پڑے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرکاری طور پر اعلان کردہ اشتہاری

مجرموں کی تعداد بڑھتی گئی مثلاً ۳۰ - ۱۹۲۹ء میں ضلعی ڈپٹی

کمشنروں کے پاس اشتہاری مجرموں کی فہرست یوں تھی ہزار ۶۲،

پشاور ۵، کوہاٹ ۲۳، بنوں ۸۵ اور ڈیرہ اسماعیل خان

۱۸، جب کسی کو قانون شکن قرار دیا جاتا تھا تو پھر ضلعوں کے دہانوں

اور قبائلی علاقے کے قبائلیوں پر لازم تھا کہ وہ اسے مار دیں۔

۱۔ مورل اینڈ میٹریکل پرائگریس آف انڈیا، ۱۹۲۰ء ص ۱۱ تا ۱۲

۲۔ اینڈمیو ایف پی ایڈمنسٹریشن رپورٹیں ۲۰ - ۱۹۱۹ء ص ۳۹ - ۱۹۳۸ء ص ۱

۳۔ اینڈمیو ایف پی ایڈمنسٹریشن رپورٹ ۳۰ - ۱۹۲۹ء ص ۸

یا پکڑ لیں، اور اگر موقعہ کے باوجود وہ اس سے فائدہ نہ اٹھاتا تھا تو اسے اس کا کافی پر سزا دی جا سکتی تھی۔ لیکن اکثر قانون شکن قبائلی علاقے میں جہاگ جاتے تھے جہاں وہ اہم ملوک کے ہمسائے بن جاتے تھے۔ آخر الذکر کہہ کہ اپنے ”مہمانوں“ پر مطلوب افراد کی حیثیت سے گرفت حاصل ہوتی تھی۔ قانون شکنوں کو ضلعوں کی واقعیت بھی ہوتی تھی اور وہاں روابط بھی ہوتے تھے لہذا ڈکیتیاں بڑھ جاتی تھیں بلکہ اگر تعاقب بہت سرگرم ہوتا تو قانون دشمن سرحد پار افغانستان جہاگ جاتے۔ دوسری جنگ عالمگیر کے آغاز پر کم و بیش ایک ہزار اشتہاری سز یافتہ مجرم افغانستان کے مشرقی صوبوں میں مستقل طور پر رہائش پذیر ہو چکے تھے۔

یہ بہت افسوس ناک ہے کہ برطانوی راج کے آخری ۱۰ سالوں میں سرحد میں امن و امان کی حالت اتنی ناگفتہ بہ تھی کہ پوری صدی میں نہ تھی ۳۸-۱۹۳۷ء کے وزیرستانی فتنہ و فساد کے بعد وسیع پیمانے پر امن شکنی تو نہ تھی لیکن پشاور ڈوی آئی خان روڈ پر ٹریفک صرف صبح کے وقت چند گھنٹے کے لئے کھولی جاتی

۱۔ ایک ایسے ہی شخص کی کہانی ایتھوپیائی جے بیو نے، ”وی سٹری آف زارک خان“ (لندن جیرالڈ، ۱۹۵۰ء) میں بہت خوب لکھی ہے۔ اس ناول پر مبنی ریم میں ایک خراب سی فلم بھی بنائی گئی تھی۔

تھی جب سڑک پر بھاری پکنٹنگ ہوتی۔ پشاور اور نوشہرہ کے درمیان جرنیلی سڑک غروب آفتاب کے بعد بند کر دی جاتی تھی۔ کوہاٹ، بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خان کے ضلعوں میں لوگوں کو باقاعدگی سے اغواء کر لیا جاتا تھا۔ پی ڈبلیو ڈی سڑکوں کا علمہ صرف زیر حفاظت ہی سڑکوں پر کام کرتا تھا، اور وہ بھی محدود گھنٹوں کے لئے۔ ایجنسیوں میں افسروں کی ہر قسم کی نقل و حرکت بھاری حفاظتی دستوں کے ساتھ ہی ہوتی تھی اور پوری احتیاط کی جاتی تھی کہ ان کے راستہ سفر کا کسی کو پیشگی پتہ نہ چلے۔ بنوں چھاؤنی میں فوج کے لئے ضروری ہو گیا تھا کہ وہ چوٹی کے فوجی افسروں اور ڈپٹی کمشنر کے گھروں کے باہر ایک اندرونی حلقہ قائم رکھیں تاکہ ان کلیدی افسروں کی حفاظت کی جاسکے اور حملے کی صورت میں مورچہ بنایا جاسکے۔

بغاوت کی بنیاد

یہ بتانا عام طور پر آسان نہیں ہے کہ پٹانوں نے سرحدیں برطانوی قانون اور اس کے علمبرداروں کی موجودگی کو قبول کرنے سے ہمیشہ انکار کیوں کیا؟ ۱۸۹۷ء، ۱۹۱۹ء، ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۶ء کی بغاوتوں سے کوئی سیدھا سا دباخا کہ نہیں اُبھرتا، لیکن یہ قابل ذکر ہے کہ یہ سب بڑی بغاوتیں برطانوی راج کی صدی کے نصف

دوم میں ہوئیں۔ ۱۸۹۰ء سے پہلے واحد زبردست تصادم ۱۸۹۳ء کی امبیلہ مہم تھی جو ایک مخصوص اور اچھوتی بنائے اضطراب یعنی بستی سید احمد کے خلاف بھیجی گئی تھی۔ انیسویں صدی کے آخری عشرے سے پہلے ایک وسیع بغاوت کے فقدان کی وجہ یہ تھی کہ انگریزوں نے ابھی تک سرحد میں پوری طرح قدم نہ جمائے تھے۔ روس کے ساتھ ”عظیم مقابلہ“ ابھی جاری تھا اور پٹھان اس سے بخوبی آگاہ ہونے کے باوجود اپنے کو ایک تیسرا فریق سمجھتے تھے جس کی مقابلے میں شرکت اس کی اپنی پسند کی شرائط اور اوقات پر ہی ہو سکتی تھی۔

آخری عشرے میں انگریزوں نے ”عظیم مقابلہ“ کا پہلا مرحلہ جیت لیا اور وہ سرحد میں مضبوطی سے جم گئے۔ پٹھانوں نے خواہ مخواہ اپنے آپ کو برطانوی ہندوستانی سلطنت کا ایک حصہ یا وہ اسے پسند نہیں کرتے تھے، اور اس کے لئے انہوں نے اپنے آقاؤں سے جو قیمت وصول کی وہ اتنی زیادہ تھی کہ انگریزوں کو اپنے باقی ماندہ دور حکومت میں محض فوجی قوت کے بل پر اس علاقے میں اپنا اختیار قائم رکھنا پڑا۔ کبھی کبھار اس کا رباؤٹا ہوا ہو جاتا تھا جیسے کہ زن کی بند سرحد یا ایسی کے نفاذ کے بعد اور کبھی یہ بڑھ جاتا تھا جیسے رزمک یا ایسی اور ہندوستانی یا سیہل چل سے سرحدیں پیسلے کے بعد۔ لیکن یہ ختم بھی نہ ہوا اور ان

ہندوستان کے ساتھ سرحد کے انضمام کو ناممکن بنا تا رہا۔

انتہائی حقیقت پسندانہ الفاظ میں یہ صورتحال امریکی برطانیہ کے مفادات کے منافی نہیں تھی۔ ہندوستان کی سرحدات محفوظ رہیں۔ برطانوی ہند کا بھاری بھرکم سول اور فوجی نظام اس بوجھ کو برداشت کر گیا جو پٹھان انتہاب اس پر ڈالتا رہا۔

پٹھان قومیت کے حساس موضوع پر زیادہ تفصیل کے ساتھ کسی اور جگہ تبصرہ کیا گیا ہے (ابواب چہارم اور دوازدہم) یقیناً اسے ہمیشہ ایک مٹھوس ثقافتی بنیاد حاصل رہی ہے لیکن چوتھے عشرے تک اس کے کوئی سیاسی مضمرات نہ تھے اور یہ انگریزوں کے خلاف مزاحمت میں ایک بڑا عامل نہ تھا، ۱۹۷۱ء میں بھی جب انگریز چلے گئے اور ”پنجتوں“ کا مسئلہ ایک زندہ مسئلہ بن گیا تو بھی قومیت کی ہر بہت ہلکی رہی۔ بہر حال یہ انگریزوں کے خلاف مزاحمت کی کبھی بنیاد نہیں بنا تھا۔

ابتداء سے ہی حساس تہہ برطانوی انتظام کار سرحد کے مخصوص مسئلہ سے بخوبی آگاہ تھے لیکن وہ پٹھان آرزوؤں سے ذاتی طور پر کتنی بھی ہمدردی کیوں نہ رکھتے ہوں۔ امن وامان ان کا ہمہ گیر مقصد تھا اور اس کے اور مستحق سیاسی ترقی کے درمیان آویزش کی صورت میں فیصلہ لازماً امن وامان کے ہی حق میں ہوتا تھا۔ فرزند رٹلر کو یقین ہے کہ اگر انگریز ٹھہرتے تو وہ بالآخر

افغانستان کے تعاون کے ساتھ یہ مسئلہ حل کر لیتے اور سرحد کے دونوں
اطراف سے سرایت کرتی ہوئی ہتھیار کا ہموار دباؤ ”سرحدی
قبائل کی اقتصادی حالت اور حکمرانی نظام کو اس طرح بدل دیتا کہ
وہ ایک زیادہ مطمئن اور پیرامن طرز زندگی کے بدلے اپنے آلات
جنگ، خونیں جھگڑے اور قبائلی رسم و رواج ”چھوڑ دیتے پڑے

بارٹن نے انگریزوں کے رخصت ہونے سے قریباً دس سال پہلے
جو کچھ لکھا وہ کم امید افزاء تھا۔ اس نے کہا ”قبائلی علاقے کی مکمل تکیں
ایک بڑی سلطنت کے لئے واحد منطقی راستہ تو ہو سکتی ہے لیکن یہ علمی
سیاسیات سے بعید ہونے کی وجہ سے خارج از امکان ہے، بارٹن کے
خیال میں اکثر پٹھانوں اور انگریزوں کے درمیان جو بعد القیام پیدا
ہوا ہے اس کی بڑی وجہ چھاؤنیوں اور سرکاری دفاتر کی الگ
تھلک، بدیشی اور خود مرکز فضا تھی جسے نہایت مضبوطی سے
تھام رکھا گیا۔ نیز انگریز قبائلیوں کی نہ تو دوستی جیت سکے نہ توقیر۔
ایک آزاد مبصر کے لئے اس نقطے پر بارٹن فریئر ٹکمر کی
نسبت حقیقت کے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے۔ اکثر قبائلی رہنما
اب بھی انگریزوں (اور حال ہی میں کبھی کبھار پاکستانیوں) کے

۱۔ فریئر ٹکمر، ایضاً، ص ۲۷۰

۲۔ بارٹن، ایضاً، ص ۵۸

سلوک اور افغانوں مشمولہ یہ کابل کے ارکان شاہی خاندان کے
سلوک کے فرق سے بہت تلخی سے آگاہ ہیں۔ وہ پنجابیوں، سندھیوں
بنگالیوں اور دیگر ہندوستانی نسلوں کی عادات و اطوار کے مقابلے
پر ان کی وسط ایشیائی عادات و اطوار کو برداشت کرنے کی
کوئی خواہش نہ رکھتے تھے۔

مذہب جس کے لطیف نکات وہ شاذ و نادر ہی سمجھتے ہیں
ان کی زندگیوں میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے اور گوان عقیدت
مندوں کے بہت سے مکالمات اور متعصب تھے جن کی عادات
عام ڈاکوؤں سے مختلف نہ تھیں تاہم مکالمات جنہیں انگریزوں نے
عام شہرے سمجھ کر نظر انداز کر دیا واقعی اپنے معاشرے کے
بہترین عالم و فاضل تھے۔ مثلاً حاجی تہ نگزنی پشتو کا ایک نامور
شاعر تھا جس نے بہت سے سکول کھولے جہاں اسلامی علوم اور
پٹان تاریخ و ثقافت پڑھائے جاتے تھے۔ تیرسیا سی بغاوت بھی
سکھائی جاتی تھی۔

پٹانوں کی مسلسل شورش انگریزی سے تنگ آکر امن امان
کے ذمہ دار برطانوی حکام بلا تامل خلاف ورزی کرنے والوں کو
جو قانون دشمن قرار دے دیتے تھے اور پھر ان کے خلاف ایڑی
چوٹی کا زور لگا دیتے تھے تو شاید انہیں زیادہ مورد الزام نہیں
ٹھہرایا جاسکتا لیکن اس طریقہ کار سے پہاڑیوں میں ایسے لوگ

بڑھتے گئے جن کے سامنے صرف یہی راستہ تھا کہ وہ حتیٰ الوسع دائرہ قانون سے باہر رہیں اور اپنے دلوں میں ہر انگلی نیری چیز کے لئے سمر بھر کی نفرت سلگائے رکھیں۔

تیسرے عشرے میں ”پرامن نفوذ“ کی جو پالیسی زندہ کی گئی تھی وہ قیامیوں کو کوئی اقتصادی یا سماجی بہتری نہ دے سکی۔ وظائف جو فوراً بند کئے جاسکتے تھے اور ناکہ بندی جو آسانی سے عائد کی جاسکتی تھی شبانی اور زرعی طریقوں کو بہتر بنانے کے بالکل ابتدائی اقدامات کا بھی نعم البدل نہ ہو سکتے تھے کیونکہ اول الذکر اہل کوہ کے لئے معیشت کو کچھ نہ کچھ تو بہتر بناتے۔ قیامیوں کو تعلیم دینے کی کوشش نہ کی گئی اور ہندوستان میں برطانوی راج کے آخری سال ۱۹۴۷ء میں بھی قبائلی علاقے کا تعلیمی بجٹ صرف ۱۷ ہزار روپے تھا۔

سرمحد آج بھی بالخصوص قبائلی علاقہ بغاوت کے لئے منماباً امکانی طور پر اتنا ہی خطرناک ہے جتنا یہ ہمیشہ رہا ہے تاہم وہ سرگرم رقابت قریباً مکمل طور پر غائب ہے جو برطانوی دور میں نمایاں تھی۔ ضلعوں کے اندر شرح جرائم اب بھی ویسے ہی غیر معمولی طور پر زیادہ ہے لیکن قیام پاکستان کے بعد زیادہ سے زیادہ تین چار واقعات سالانہ ایسے ہوتے ہیں جنہیں قبائلی علاقے چھاپے کہا جاسکتا ہے۔ پہاڑی قبائل بے قابو ہیں لیکن ان کے اور حکومت

کے درمیان جو نفسیاتی رکاوٹ موجود تھی وہ دور ہو چکی ہے۔ جہاں
کشمیر میں جو بٹوارے کے فوراً بعد ہوا قبائلیوں کا پہلی دفعہ حکومت
کے اہلکاروں کے ساتھ گہرا اور دوستانہ ربط قائم ہوا۔ ان دنوں
کی باہمی خوش اعتمادی اور خیر سگالی آج بھی کافی حد تک قائم
ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ سال با سال کے بہت سے مخالفین امن و چین
سے زندگی گزار رہے ہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمام مسائل ختم ہو گئے ہیں۔ انگلیز باقاعدہ
سے رزک آجاسکتے تھے، خواہ کھلی سڑک کے دنوں میں ہی سہی۔ پاکستانی
افسروں کا شاذ و نادر ہی جاتے ہیں اور وہ بھی وزیروں اور محسودوں
کی دعوت پر جو چھاؤنی کے اندر یا ارد گرد رہتے ہیں۔ اسپاکی کے
قلعہ پر قبضہ کرنے کے معاملے میں پاکستانی انگلیزوں سے زیادہ
کامیاب نہیں ہو سکے۔ ایک سے زیادہ غیر مطمئن ملک تحریک پختونستان
میں شامل ہو گئے ہیں یا کسی پاکستانی افسر کے ہاتھوں واقعی یا مفروضہ
توہین کے جواب میں کابل چلے گئے ہیں۔

قبائلیوں کو احساس ہے کہ ۱۹۷۱ء میں قبائلی علاقے سے تمام باقاعدہ
فوج کو واپس بلانے کا اقدام کمزوری کا نتیجہ تھا نہ کہ کمزوری دور میں
طاقت کا (سپاہی ہندوستانی سرحد پر کشمیر میں فوری طور پر درکار تھے
اہل کوہ کو اقتصادی طور پر نقصان ہوا ہے کیونکہ انگلیزی دور کے
سڑکوں اور رسد کے ٹھیکے معدوم ہو گئے ہیں۔ لیکن شاید اہم ترین

بات یہ ہے کہ قبائلی اپنی کارروائیوں کے نقطہ کبیر (موجب اہل برطانیہ) یعنی کمزوری پر حملہ پر عمل کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ لہذا یہ ایک عجیب بات ہے کہ آخری دس سال جن میں سرحد کی انتظامیہ اس صدی میں کمزور ترین رہی ہے۔ ڈیڑھ سو سال کی تاریخ میں سب سے زیادہ بڑھا من رہے ہیں۔

جہاں تک ایک عمومی اصول اخذ کرنا ممکن ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پٹان اپنی طویل بغاوت میں بنیادی طور پر اپنے حق آزادی کے لئے لڑ رہے تھے۔ یہ آرزو بلا شک و شبہ اپنے بعض مظاہرات میں اتنی قابل رشک نہ تھی۔ اس میں کام کرنے کا ایسا حق بھی شامل تھا جسے جاری نہیں رکھا جاسکتا۔ اگر کسی معاشرے نے دورِ حاضر میں ایک لمبی، غیر معینہ مدت کے لئے باقی رہنا ہو۔ پٹان مقصد انتہائی انفرادی اور خود غرضانہ ہے جس کا ایسے مہذبانہ تصورات سے دور کا بھی تعلق نہیں جیسے اقوام و ملل کا حق خود اراد یا مساوات انسانی۔

لیکن مستقبل کے لئے اس کے جو بھی امکانات اور اخلاقی قدر قیمت ہو پٹانوں کی مخصوص آزادی برطانوی ہند کے آئینی افسر شاہی سانچے یا سامراجی برطانیہ کی حربیاتی پالیسی میں صحیح نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ اس کا نتیجہ کپلنگ کے آخری قادی قانون دشمن کے الفاظ میں یہ ہوا۔

”یہ جنگ ہے، سرخ جنگ
لہذا میں تم سے اس وقت تک لڑوں گا جب تک میرے
دست و بازو ناکارہ نہیں ہو جاتے۔
اس ظلم کے لئے جو تم نے لوگوں کے سردار
اور ایک زکا خیل لیڈر سے کیا ہے۔“

(۱۴) باب دہم

ہٹوارہ

تعارف :-

آزادی اور ہٹوارہ کے قریب آنے کے ساتھ ساتھ جو مسائل برطانوی ہند کو گھیرے ہوئے تھے وہ سرحد میں بھی ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء کے اہم سالوں میں رونما ہوئے۔ سرحد اس خونی فرقہ وارانہ تشدد سے متاثر ہوا جس نے پنجاب اور بنگال میں ہلکے چا دیا تھا، اس میں نسبتاً مختصر پیمانے پر ریاستوں کا مسئلہ تھا جو برطانوی حاکمیت کے ساقط ہونے کے بعد تکنیکی طور پر آزاد کارکن بن گئی تھیں نیز قبائلی علاقہ کا خصوصی مسئلہ بھی تھا۔ کانگریس مسلم لیگ جنگ یوں تقبیر سے ہندوستان میں لڑی گئی۔ لیکن صوبہ سرحد میں اس کی شدت وحدت دیگر صوبوں سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ پاکستان کو برطانوی ہند کا بوسا پستو بولنے والا علاقہ ورثے میں جو ملا تھا فغانہ نے پُر زور احتجاج کیا اور یوں ایک بین الاقوامی رخ بھی

سامنے آیا

دور تقسیم کے واقعات تین حصوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں (۱) سیاسی اور فرقہ وارانہ آویزش جس نے اہل سرحد کو اپنی پلیٹ میں لے لیا (۲)۔ عمل جس کے ذریعے صوبہ سرحد، ریاستیں اور قبائلی علاقہ پاکستان کا حصہ بن گئے اور (۳) پٹھان کردار کا غیر معمولی مظاہرہ یعنی جہاد کشمیر پہلے دونوں باب بھی طویل و مربوط موضوعات ہیں جو برطانوی حکومت کے آخری ایام اور آزادی کے ابتدائی ایام میں افزودہ رفتار حالات کا حصہ ہیں۔ وہ ایک سال سے کچھ زیادہ کے دور میں ایک دوسرے کا شمول ہیں۔ آخری حصہ اچھوتا ہے اور اس پر تبصرہ علیحدہ ہی ہوگا۔

فیصلہ کیا:

جنوری ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات میں ڈاکٹر خان صاحب کی کانگریس پارٹی حکومت دوبارہ برسرِ اقتدار آگئی کیونکہ قانون ساز اسمبلی کی پچاس نشستوں میں سے اس نے تیس جیت لی تھیں۔ نئی وزارت پر خان صاحب کے بھائی عبدالغفار خان کا بہت اثر تھا جس کی مقبولیت کو مسلم لیگ مغلوب نہ کر سکی تھی حالانکہ

سرحد میں افغانستان کی دوائی دیکھی اور بٹوارے کے دوران افغان سرگرمیاں بالتفصیل باب دوازدهم میں زیر بحث آئیں گی۔

ہندوستان کے باقی تمام مسلم اکثریتی علاقوں میں قریباً مسلم لیگ ہی انتخابات میں کامیاب ہوئی تھی۔

روز افزوں ہندو مسلم مخالفت پہلے ہی ہندوستان بھر میں زندگی کا اہم ترین پہلو بن چکی تھی۔ سیاسی میدان میں ہندو زودہ کانگریس پارٹی اور مسلم لیگ کے درمیان تمیز بالکل واضح ہو گئی تھی۔ ایک ایسی کانگریس پارٹی حکومت کے لئے سب سے قریباً تمام کی تمام جنگجو پٹھانوں پر مشتمل تھی اور ایک دیوانہ دار مسلمان علاقے میں گاندھی اور نہرو کے ساتھ متحدہ محاذ قائم رکھنے کے لئے کوشاں تھی۔ کامیابی کے حالات بہت ناسازگار تھے۔ صوبہ سرحد میں کانگریسی وزارت کو آئندہ سال جن مسائل کا سامنا کرنا تھا وہ اکتوبر ۱۹۴۶ء میں بالکل واضح ہو کر سامنے آ گئے۔ جب جو اہر لال نہرو نے سرحد کا دورہ کیا تا کہ خان صاحب کی حکومت کو تقویت مل سکے اور پٹھانوں کو کانگریس سے وفاداری کی دانشمندی کا یقین دلایا جاسکے۔ نہرو پشاور میں آمد کے قریباً ساتھ ہی جہانی حملوں کی زد میں آ گیا۔ شہر میں ایک تقریر کی کوشش کے دوران وہ ہلکا سا زخمی بھی ہو گیا اور رائل انڈین ایئر فورس کا جہاز اسے اڑا کر رزمک لے گیا جہاں پولیٹیکل رجمنٹ نے کانگریس لیڈر کو سننے کے لئے معزز ملک کا ایک جرگہ بلایا ہوا تھا۔ جہاز کے اترتے ہی اس پر گولیاں چلائی گئیں اور برطانوی افروں کے تمام اقدامات کے باوجود نہرو جرگہ کے ہاتھوں ایک اور بدسلوکی سے ہشکل ہی بچا۔

سیاحی جنگ ۱۹۴۷ء کے اوائل میں تیز ہو گئی جب حکومت ہند نے مجبور ہو کر ضلع ہزارہ کے قبائل سے یرغمال اور رانٹیں لے لیں اور ان پر ۷۵ ہزار روپے جرمانہ عائد کر دیا کیونکہ انہوں نے فرقہ وارانہ فساد کو ہوا دی تھی۔ مسلم لیگ نے فوراً ہی حکومتی اقدام کی مذمت کی قرارداد پاس کر دی۔ سرحد کے کانگریسی گروہ نے کچھ نہیں کیا۔

۲. فروری کو سرحد قانون ساز اسمبلی میں مسلم لیگ لیڈر عبدالقیوم خان کو مردان میں گرفتار کر لیا گیا جہاں لیگ نے ابھی ابھی ایک ضمنی انتخاب جیتا تھا۔ جواباً لیگ نے اپنے حریفوں کا ہی پسندیدہ ہتھیار استعمال کیا اور کانگریسی حکومت کے خلاف تحریک سول نا فرمانی شروع کر دی۔ مبینہ طور پر مقصد قیوم اور دیگر لیگی رہنماؤں کو جیلوں سے رہا کرنا تھا۔

کانگریس نے لیگ کے ساتھ رد و قدح کی کوشش کی تو آخر الذکر نے صوبے میں گورنر راج کا مطالبہ کر دیا اور یہ جلد ہی ظاہر ہو گیا کہ اصل مقصد خان صاحب کی حکومت کا تختہ الٹنا تھا۔ امار چ کوپشاور میں سنگین فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے جن کے دوران ۴۰ ہزار ہندوؤں کو ایک لاکھ ۶۰ ہزار مسلمانوں میں محصور موت کے پینے آتے رہے۔ سلسلہ مواصلات منقطع ہو گیا اور شہر ہندوستان سے کٹ گیا۔ فوج نے پرانے شہر میں مظاہرین پر گولی چلائی۔ لیگ کے سینکڑوں کارکن گرفتار کر لئے گئے اور شام

تا صبح کر فیورنگا دیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ قبائلیوں کے گروہ پنجاب میں نمودار ہوئے اور مری، ٹیکسلا اور راولپنڈی پر حملے کئے۔

مسلم لیگی رہنما، محمد علی جناح فرقہ دارانہ فسادات کو مذمت کرنے میں ہمیشہ پیش پیش ہوتا تھا۔ اس نے سرحدی لیگ کو اشتعال انگیز کارروائیوں سے باز رہنے کی تاکید کی۔ مقامی لیگ لیڈر جس نے یہ مظاہرے کروائے تھے پیر صاحب مانکی شریف تھا جو ایک سرکردہ نوجوان تھا۔ اس نے اپنے پیروؤں کو پیرامن مزاحمت تک محدود ہونے کا حکم دیا۔ پیر صاحب کو برطانوی اہلکار جبر ہو کر "مانکی ملا" کہنے لگے تھے لیکن ان کے عقیدت مند دولاکھ سے بھی زیادہ تھے۔

مسٹر جناح کی ہدایت و مدد اعلیٰ کے باوجود فرقہ وارانہ عنصر قائم رہا اور پہاڑیوں کے مشاق قبائلی پنجاب میں ہندو دیہا اور دکاتوں کو لوٹتے رہے۔ اس پر پنجاب کے حکام نے صوبہ سرحد کی حکومت سے سرکاری طور پر احتجاج کیا کہ وہ اٹک اور خوشحال گڑھ کے پلوں پر کڑی نگرانی رکھنے میں ناکام ہو گئی تھی۔ سرحد کے زیر انتظام اضلاع میں خوانین کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے اپنے دیہات میں ہندوؤں سکھوں کے تحفظ کی ذمہ داری سنبھالیں۔

جب پیرامن تحریک مزاحمت علاقے کو مفلوج کرتی رہی

تو عبدالغفار خان کے پیرو بہت سے خدائی خدمت گار پشاور کے
باہر اکٹھا ہونا شروع ہوئے ۱۸ مارچ کو وہ ۴ ہزار کی تعداد میں
شہر میں داخل ہوئے تاکہ فرقہ وارانہ غرضات کو دور کریں اور دکانداروں
کو دکانیں کھولنے پر آمادہ کریں لیکن یہ کوشش ناکام رہی۔ جب
خدمت گار اپنی سرخ وردیوں میں شہر کی گلیوں میں گشت کر رہے
تھے تو جگمگوں نظم خاکساروں کے گروہ بھی اپنی خاکی وردیاں اور
عرب لباس پہنے ہوئے نمودار ہوئے۔

فوج بلالی گئی اور قانون ساز اسمبلی کا اجلاس خواردار تاروں
اور سنگینوں کے سائے میں ہوا۔ اب تک ان دو ہفتوں میں ۱۵۰
مارے گئے تھے اور ۲۰ ہزار مسلم لگی گم فائر ہو چکے تھے۔ ایک دو
کے سوا اسمبلی کے سترہ مسلم لگی ارکان جیل میں تھے۔ ۲۸ مارچ کو
پیرانکی شریف کو پشاور کے مسلم لیگ دفتر سے گم فائر کیا گیا۔ اسی دن
قیوم اور بیس دیگر لگی لیڈروں کو پشاور جیل سے ڈیرہ اسماعیل خان
سنٹرل جیل میں منتقل کر دیا گیا تاکہ جیل کی عمارت پر عوامی حملے
کو روکا جاسکے

کانگریسی وزارت اس ہلے میں تو بیچ گئی لیکن یہ اظہر من الشمس
ہو گیا کہ وہ حکومت جس نے صرف ایک سال پہلے ایک بھاری
عوامی اکثریت جیتی تھی اب ایک شدید مخالفانہ سمندر میں ایک
الگ تنگ جزیرہ بن کر رہ گئی تھی۔

نیا واسرائے، لارڈ لوئیس ماؤنٹ بیٹن ۱۸ اپریل کوئی دہلی میں صوبہ سرحد کے گورنر، سر اولف کیرو، وزیر اعلیٰ غان صاحب اور جواہر لال نہرو سے ملا تاکہ صورت حال پر غور ہو سکے۔ مسلم لیگ کا کوئی نمائندہ موجود نہ تھا لیکن سرحد میں لیگ کی قوت کا عالیہ مظاہر کا نفرنس پر محیط تھا۔ جب ابھی گفٹ و شنیدہ ہو رہی تھی تو وزیر تان سرحد کی کلیدی انتظامی چوکی، ٹانک میں نئے فسادات پھوٹ پڑے ہر روز نئی قبائلی نقل و حرکت کی اطلاعاتیں ملتے لگیں اور لندن میں سنجیدہ اخبار ٹائمز نے اعلان کیا کہ سرحد ایک دفعہ پھر شعلہ زن ہونے کے کنارے پہنچا ہے۔

کانفرنس نے فیصلہ کیا کہ گڑ بڑ کو ختم کرنے کے لئے سرحد میں تمام سیاسی قیدی رہا کر دیے جائیں گے ۱۲ اپریل کو مسٹر جناح نے اعلان کیا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اسے اس فیصلہ سے مطلع کیا تھا اور یہ کہ اسے یقین تھا کہ واسرائے مسلم لیگ سے صحیح سلوک کرے گا چنانچہ اس نے بھی سرحد میں امن و امان قائم کرنے والوں کی ہاں میں ہاں

۱۔ ڈائمز (لندن) ۱۹ اپریل ۱۹۴۷ء اس باب کا تاریخ وار سلسلہ بہت سے اخبارات مشمولہ بہ ڈائمز سے مرتب کیا گیا ہے جس کے علاوہ نیویارک ڈائمز شیشمین ڈیڑی دہلی اور کلکتہ اور ڈان ڈیڑی دہلی اور کراچی اور پشاور میں ذاتی انٹرویو بھی تھے۔ مخصوص اخباری حوالہ من و عن اقتباس یا ایسے ہی مواد کے لئے دیا گیا ہے۔

ملا دی۔ ۲۷ اپریل کو خان صاحب نے پشاور واپس آکر حکم دیا کہ وہ تمام قیدی رہا کر دیئے جائیں جو تشدد کاری کے مجرم نہیں پائے گئے تھے۔ کوئی چار تا پانچ ہزار مسلم لیگی جیلوں سے باہر آگئے لیکن خلیفہ کے بہت سے کلیدی رہنما محبوس ہی رہے۔

دریں اثناء ماؤنٹ بیٹن نے حالات کا جائزہ لینے کے لئے خود سرحد آئیکا فیصلہ کیا۔ وہ ۲۸ اپریل کو پشاور آیا۔ وہ فوراً ہی غضب آلود مسلم لیگیوں کے ایک ہجوم کو خطاب کرنے کے لئے بیرون شہر آیا جو اندرون شہر میں جمع شدہ فدائی خدمت گاروں کے ساتھ ٹکڑے پر تیار تھے۔ اس دن دائرائے کی موجودگی کی وجہ سے تصادم نہ ہوا لیکن لگے دن شہر میں بم پھٹنے لگے اور گولیاں چلنے لگیں۔ اس وقت تک انگریزی حکومت سرکاری طور پر برصغیر کی تقسیم کے امکان کو روک رہی تھی لیکن اسی دن جواہر لال نہرو اور راجندر پرشاد نے دہلی میں دستور ساز اسمبلی کے تیسرے سیشن کا افتتاح کرتے ہوئے تسلیم کیا کہ برطانوی راج کے خاتمہ کے بعد ہندوستان کا تقسیم ہونا عین ممکن تھا۔

ادائل مسی میں ٹانگرنے سرحد کو پھر ”ہندوستان کا خطرناک ترین“ حصہ قرار دیا۔ روز افزوں تشدد کے پیش نظر کاندھلی کی اہم

کے حلف بردار فدائی خدمت گاروں نے غضب آلود پٹھان جنگجوؤں کے سیلاب میں اپنے آپ کو بے دست و پا پایا۔ عبدالغنی خان ابن عبد الغفار خان نے پختوں نہ لمی (جوان پٹھان) کی بنیاد رکھی جو دفاع اور انتقام میں تشدد کی علمبردار تھی۔ اس گمراہ کے افراد اقلوں اور پستو لوں سے مسلح ہو کر عوامی جلسوں میں مسلم لیگ کو لٹکانے لگے۔ لیگ کی تحریک کو ختم کرنے کی آخری کوشش کے طور پر کانگریسی حکومت نے پانچ کلیدی مسلم لیگی لیڈروں کو رہا کر دیا تاکہ وہ دہلی میں مسٹر جناح سے مشورہ کر سکیں اور کسی پُر امن حل پر پہنچ سکیں۔ سیمین جان خان، عبدالقیوم خان، پیر مانکی شریف، میاں عبداللہ شاہ اور ارباب نور محمد مٹی کے پہلے ہفتے میں دہلی آئے جب وہ مسٹر جناح سے گفتگو کر رہے تھے تو صوبہ سرحد کے سابق مسلم لیگی وزیر اعلیٰ، سردار اورنگزیب خان کو پشاور میں گرفتار کر لیا گیا۔

یہ جناح کے لئے ناقابل برداشت تھا اور، مٹی کے ایک بیان میں اس نے اعلان کیا کہ وہ سرحد لیگ کو تحریک سول نا فرمانی ختم کرنے کا مشورہ نہ دے سکتا تھا۔ اس کا اصرار تھا کہ فتنہ و فساد کی جڑ سرحد پر کانگریسی کنٹرول تھا جو باشندوں کی اکثریت کی خواہش کے خلاف تھا اس نے لیگی کارکنوں کے خلاف ایف سی آر کے استعمال کی مذمت کی۔ اس نے تسلیم کیا کہ لیگ صوبے میں سیکشن ۱۴۱ الف

کے نفاذ (گورنری راج) پر زور دیتی رہی تھی لیکن اب اس کی امیدیں لندن میں عنقریب ہونے والے نئے انتظامات کے اعلان پر لگی ہوئی تھیں۔

حکومت برطانیہ کی طرف سے کسی فوری فیصلے کی ضرورت دن بدن بڑھتی جا رہی تھی برطانوی نظم و نسق کس حد تک کمزور پڑتا جا رہا تھا اس کا مظاہرہ ۱۷ مئی کو ہوا جب سرایون جنکٹرنے پنجاب کے ضلع راولپنڈی کے مسلمانوں پر ایک بھاری جرمانہ عائد کرنے کی ناکام کوشش کی جو پچھلے دو ماہ کے فرقہ وارانہ فسادات کے سلسلے میں تھا۔

(شرارت زیادہ تر سندھ پارکے پٹھانوں نے کی تھی اور جرمانہ بھی نہ وصول کیا جاسکا) وزیراعظم ایٹلی نے ۱۳ جون کو دارالعوام میں آزادی ہند کا منصوبہ پیش کیا۔ اس میں بٹوارہ مشتمل تھا۔ اعلان میں کہا گیا کہ صوبہ سرحد کے تین میں سے دو نمائندے اس وقت مرکزی دستور ساز اسمبلی میں حصہ لے رہے تھے لیکن اگر سارے یا کچھ حصہ پنجاب نے ایک نئی اسمبلی (یعنی بٹوارہ) میں نمائندگی کے لئے فیصلہ دیا تو ایسی صورت میں صوبہ سرحد جغرافیائی طور پر الگ تھلک ہو جائے گا اور اسے بھی اپنی حیثیت پر غور کرنے کا موقع ملتا ضروری ہوگا۔

اس کے لئے وائسرائے صوبائی حکومت کے مشورے کے

ساتھ ریفرنڈم کرانے لگا۔ صوبہ سرحد کی قانون ساز اسمبلی کے تمام رائے دہندگان ریفرنڈم میں حصہ لینے کے مجاز نہ ہوں گے۔ یہ نیا انتظام تھا جس کی مسٹر جناح کو لندن سے امید تھی۔ اس نے سرحد میں کانگریس پارٹی کا جنازہ نکال دیا اور سرحد کی پاکستان میں شمولیت کو یقینی بنا دیا۔ لیکن اپنی ۱۰۵ دن پرانی تحریک سول نافرمانی بند کر دی اور ریفرنڈم کے لئے اپنی بھرپور مہم شروع کر دی۔

وانا بریگیڈ کے کمانڈر، بریگیڈر جے۔ آر۔ برتھ کور ریفرنڈم کمشنر مقرر کیا گیا۔ پورا اعلیٰ برطانوی فوجی افسروں کی نگرانی میں ہوا، اور اس میں پولیسکی سروس یا ہندوستانی اہلکاروں سے کوئی مدد نہیں لی گئی۔ کچھ عرصے تک صوبہ سرحد کے گورنر مرادOLF کیرو کو خدائی خدمت گار اور کانگریس مسلم لیگ کا حامی سمجھتے رہے جس کی بظاہر کوئی وجہ نہ تھی۔ تعصب کے الزام سے بچنے کے لئے مرادOLF ۱۸ جون کو اپنی ہی درخواست پر چھٹی پر چلا گیا۔ اس کی جگہ سر راب لوکھارٹ نے لی جو اس وقت تک افواج ہند کی جنوبی کمان کا سربراہ تھا۔

کانگریسی رہنماؤں کو جلد ہی احساس ہو گیا کہ مسٹر جناح نے انہیں بساط سیاست پر شکست دیدی تھی۔ صوبہ سرحد کے غالب اکثریتی مسلمانوں کو دو ویں سے ایک راستہ چننا تھا یعنی

موجودہ ہندو زدہ اسمبلی کے لئے تائید سے بچنا جیسا کہ دہلی اسمبلی میں شرکت نہ کرنے والے دوسرے صوبے بھیجیں گے۔ (یعنی مسلم پاکستان میں شرکت) یہ تو واضح ہو چکا تھا کہ پاکستان مسٹر جناح اور اس کی مسلم لیگ کی تخلیق ہو گا اور اس میں خدائی خدمت گاروں جیسے مسلمان منحرفین کی کوئی جگہ نہ ہوگی۔

اس منجھے میں پھنس کر خدائی خدمت گاروں کے لئے ایک ہی راستہ کھلا تھا اور انہوں نے اسے کچھ سیاسی قوت قائم کرنے کا آخری سہارا سمجھتے ہوئے اپنا لیا۔ خدائی خدمت گار فرقہ وارانہ تو کبھی نہ تھے، لیکن وہ ہمیشہ ایک خاص صوبائی تنظیم رہے تھے۔ یہ ابتدائی طور پر ایک پٹھان پارٹی تھی اور شانوی طور پر کانگریسی۔ لہذا اگر سرحد کو ہندوستان اور کانگریسی راج سے علیحدہ ہی کرنا تھا تو خدائی خدمت گار صرف اسی صورت میں باقی رہ سکتے تھے اگر کسی قسم کا پٹھانان پاکستان کے اندر یا باہر قائم ہو جائے جس سے ان کی شناخت ہو سکے۔ پٹھان خود مختاری کا یہ خیال سراسر نیا نہ تھا۔ پچھلے چند ماہ میں اس پر قدرے بحث ہوتی رہی تھی۔ قبائلیوں کے لئے اس میں ایک فطری کشش تھی اور کانگریس اور لیگ کی سیاست سے انہیں کیا سروکار تھا۔ افغانستان سے بھی اس کی حمایت کی توقع تھی لیکن ریفرنڈم میں یہ شامل نہیں تھا۔ خدائی خدمت گار اعلان کے ساتھ ہی ریفرنڈم کے خلاف

رڑ رہے تھے ۱۸ جون کو دہلی میں واسریگل لاج کی ایک میٹنگ میں جس میں گاندھی اور جناح دونوں موجود تھے، عبدالغفار خان نے رسمی طور پر ”پٹھانستان“ کا انتخاب بھی پیش کیا۔ لیکن کانگریس پہلے ہی ہندوستانی ریاستوں کے مسئلے پر متفکر تھی جس کا اسے سامنا کرنا تھا۔ گاندھی، نہرو اور پیٹل پاکستان سے بھی زیادہ برصغیر کی مزید تقسیم سے خوفزدہ تھے لہذا گاندھی نے جناح کے ساتھ مل کر ۲ جون کے منصوبے کو تسلیم کر لیا جو انگلیزوں نے پیش کیا تھا۔

تاہم ۲۲ جون کو بنوں میں کانگریس پارٹی کی ایک میٹنگ میں ایک علیحدہ پٹھان سٹیٹ کے مطالبے پر اتفاق کیا گیا جو ایک پٹھان دستور کی مالک ہوگی اور جس کی تشکیل جمہوریت، مساوات اور سماجی انصاف کے اسلامی تصورات پر ہوگی، ”نیم سی دن جواہر لال نہرو نے پنجاب اور صوبہ سرحد سے آئے ہوئے پشتو بولنے والے سکھ اور ہندو پناہ گزینوں کو ہر دوار (صوبجات متحدہ) میں خطاب کرتے ہوئے اس خیال کی بر ملا حمایت کی۔

۲۳ جون کو پنجاب کی قانون ساز اسمبلی نے انتہائی سناؤ کی فضا میں ایک نئی اسمبلی کے لئے نمائندے بھیجنے پر ووٹ دیا، جو اصل میں تقسیم ہند اور دونوں نئی سلطنتوں کے درمیان تقسیم صوبہ پر ووٹ تھا۔ داسرائے نے فوراً ہی صوبہ سرحد میں موجودہ

۱۔ نیویارک ٹائمز، جون ۲۳، ۱۹۴۷ء

ریفرنڈم کے طریقہ کار کا اعلان کیا۔ عین اسی وقت عبدالغفار خان نے دہلی میں ایک آزاد پٹمان سٹیٹ کی حمایت کے لئے حلف اٹھایا۔ اس نے برطانوی حکومت پر سخت تنقید کی کہ اس نے ریفرنڈم میں یہ انتخاب مہیا نہ کیا تھا اور الزام لگایا کہ وہ پٹھانوں کی مرضی کے خلاف صوبہ سرحد پر پاکستان مقبوض دینا چاہتے ہیں تاکہ وہ روس کے خلاف اپنے فوجی اڈے اور ہوائی فروریگاہیں قائم کر سکیں۔ ۲۳ جون کو غفار خان نے باقاعدہ اعلان کر دیا کہ خدائی خدمت گار سرحد میں ریفرنڈم کا بائیکاٹ کریں گے۔

سر جناب نے الزام لگایا کہ پٹھان کی کانگریسی حمایت ”حکومت برطانیہ کی ۳ جون کے پلان کی کانگریسی منظوری کی صورت میں خلاف ورزی تھی“ اس نے گاندھی اور غفار خان کو بھی نشانہ تنقید بنایا کہ وہ اس خیال کو آگے بڑھا رہے تھے اور وعدہ کیا کہ صوبہ سرحد ایک غیر مخصوص انداز میں پاکستان کا ایک خود مختار حصہ ہوگا۔

سرحد میں ریفرنڈم ۲ جولائی کو شروع ہوا یعنی اسی دن جب دن برصغیر کی دوسری طرف آسام کے ضلع سلہٹ میں یہ پُر امن طریقہ سے جاری رہا، گو خدائی خدمت گاروں کے مقاطعہ نے کافی لوگوں کو

۱۔ نیویارک ٹائمز، جون ۲۴، ۱۹۴۷ء

۲۔ نیویارک ٹائمز، جون ۲۹، ۱۹۴۷ء

وڈنگ کے لئے نہ آنے دیا۔ ۱۸ جولائی کو لندن میں قانون آزادی ہند کی شہنشاہ نے منظوری دی اور یوں انتقال اقتدار کو باقاعدہ شکل دی گئی اور ۱۹ جولائی کو سرحد میں ریفرنڈم مکمل ہوا۔ اگلے دن اس کے نتائج کا اعلان کر دیا گیا۔ اس سے صوبہ سرحد واضح طور پر پاکستان کی حمایت کی گواہی دینے میں متضاد دعوے کئے۔

صوبہ سرحد کی صرف ۵.۶۹ فیصد ایکٹوریٹ نے فیصلہ دیا۔ ان میں سے ۲,۸۹,۲۴۴ پاکستان کے اور ۲۸۷,۷۲۸ ہندوستان کے حق میں تھے۔ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ پاکستان کی حامی مسلم لیگ نے ڈالے گئے ووٹوں کا ۹۹ فیصد سے بھی زیادہ حصہ جیتا تھا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ احتراز کرنے والے ۱.۷۹ فیصد میں سے کیتوں نے خدائی خدمت گاروں سے عقیدت کی بناء پر ایسا کیا۔ کچھ نے یقیناً ایسا کیا۔ یہ امکان خواہ کتنا بھی بے معنی ہو خدائی خدمت گاروں کا آخری اظہار قوت تھا۔

صوبہ میں تناؤ قائم رہا اور خدائی خدمت گار آئندہ تشدد کا ہولناک ذکر کرتے رہے۔ لیکن آزادی کی تیز رفتار گاڑی روانہ ہو چکی تھی اور عبدالغفار خان اور اسکے کانگرس ساتھی، جہاں تک سرحد کی اکثریتی آبادی کا تعلق تھا، اس سے رہ گئے تھے۔ ۳ اگست کو سرحد خارج کشمکھم جو ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۶ء تک سرحد کا گورنر رہا تھا، دوبارہ واپس آیا تاکہ آخری ایام کی نگرانی کر سکے۔

آزادی اور بٹوارا۔

۱۵ اگست سرحد میں ایک خاموش مسرت کی فضا میں نمودار ہوا ۲۲ اگست کو پاکستان کے گورنر جنرل نے خان صاحب کی وزارت کو ختم کر دیا جو ڈیڑھ سال سے برسرِ اقتدار تھی اور مسلم لیگ اسمبلی لیڈر، عبدالقیوم خان وزیر اعلیٰ بنا۔ اگلے چھ ماہ تک وہ قریباً اکیلا ہی حکومت چلاتا رہا اور سرحد کو اس نے اس فرقہ وارانہ خوف و ہشت سے بچا لیا جو پنجاب میں پھیل رہا تھا۔ انگریزوں کا چھوڑا ہوا نظم و نسق جوں کا توں رہا لیکن قیوم نے سرحد میں ایک نیا اور متحرک جذبہ پیدا کر دیا جس نے بعد کے سالوں میں برطانوی ہند کے ”مسئد صوبہ“ کو پاکستان کا مثالی صوبہ بنا دیا۔

جنوری ۱۹۴۸ء میں وزیر اعظم لیاقت علی خان نے صوبے کا دورہ کیا اور نئی حکومت کے لئے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ سر جارج کنگسم بیمار ہوا تو اپریل کے شروع میں اس کی جگہ ایمبروس ڈنڈاس نے لی جو اس سے پہلے بلوچستان میں لے جی جی تھا۔ اسی ماہ مٹر جناح سرحد کے دورے پر آئے۔ اس دورے کے دوران غذائی خدمت گاروں کی انحطاط پذیر قوت کو آخری دھچکا لگا جب غفار خان کے ایک سابقہ دست راست میاں جعفر شاہ کو گورنر جنرل کی تجویز پر دور کنی مسلم لیگی کا بینہ میں شامل کر

لیا گیا۔ (دوسرا وزیر محمد عباس خان تھا)۔ ایک نیا بحریہ تیار ہوا اور منظور کر لیا گیا جس کا مقصد صوبہ کو خود کفیل بنانا تھا۔

یہاں ایک ایسا مسئلہ جس نے پاکستان کو ہمیشہ سے پریشان کر رکھا ہے آتھاپند نوجوان بیرمانکی شریف نے اٹھایا جس نے صوبے کو پاکستان کے لئے جیتنے میں بے حد اہم کردار ادا کیا تھا۔ بیر صاحب نے خان صاحب کی وزارت کی برطرفی کے بعد قیوم حکومت میں وزارت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بعد میں وہ مرکزی دستور ساز اسمبلی کے لئے انتخاب میں ناکام رہے۔ انہوں نے اب مطالبہ کیا کہ گورنر جنرل جناح اور وزیر اعلیٰ قیوم فوراً صوبے میں شریعت راج نافذ کر دیں تاکہ پاکستان کو ایک اسلامی مملکت بنانے کا مقصد حاصل ہو سکے۔ یہ مطالبہ ٹھکرا دیا گیا اور مانکی حزب اختلاف میں چلے گئے اور وہ قیوم حکومت تک اسی کردار پر قائم رہے۔

عبد الغفار خان نے بھی اسلامی حکومت پر زور دینا شروع کر دیا۔ وہ مسلم لیگ حکومت کا سخت مخالف رہا اور مئی ۱۹۴۸ء میں اس نے ایک وسیع تقریری دورہ کیا۔ اس نے اشارتاً کہا کہ ”پٹھانستان“ اب بھی ممکن تھا۔ ابتدائے جون میں اسے ایک نئی پاکستان پیپلز پارٹی کا صدر چنا گیا جو خدائی خدمت گاروں کی جگہ بنا لی گئی جن پر کانگریسی چھاپ بہت گہری تھی۔

غفار خان کے دورہ یورپ کی افواہیں ۱۵ جون کو ختم ہو گئیں

جب اسے ضلع کوہاٹ کے ایک چھوٹے سے گاؤں، بہادر خیل میں گرفتار کر لیا گیا۔ اگلے دن ڈی سی کوہاٹ نے کوہاٹ، بنوں روڈ پر واقع بانڈہ داؤد شاہ کے کچے فرش کے ریٹ ہاؤس میں ایف سی آر کے سیکشن ۴ کے تحت اس کے خلاف مقدمہ کی سرسری سماعت کی۔ اسے تین سال کی قید با مشقت کی سزا دی گئی۔ جرم ”ملکت کے خلاف بغاوت“ بتایا گیا۔

صوبہ سرحد کی حکومت کو غیر مقبول ایف سی آر کے استعمال کا احساس تھا لہذا اس نے ایک لمبا کیسوں کا جاری کیا جس میں الزام لگایا گیا تھا کہ غفار خان بنوں جیل تھا ”جہاں معتبر اطلاعات کے مطابق اسے فقیر آف ایپی کے ایجنٹوں سے رابطہ قائم کرنا تھا تاکہ سرحد میں فتنہ بھڑکایا جاسکے“ غفار خان پر یہ الزام بھی لگایا گیا کہ وہ ”صوبہ سرحد میں فساد پھیلانے کی ایک قطعی اور سوچی سمجھی سازش جو عین اس وقت ہوئی جب ہندوستانی فوج براہ راستہ کشمیر صوبہ سرحد میں متوقع پیش قدمی میں شریک تھا“ اور یوں اس میں ایک بین الاقوامی پہلو بھی پیدا ہو گیا۔ سابقہ کانگریسی حکومت کا وزیر مال، قاضی عطاء اللہ جان

۱۔ سٹیشن ۱۶، جون ۱۹۴۸ء

۲۔ ٹائمز (لندن)، ۱۶ جون ۱۹۴۸ء، کمیونیکے کا پورا متن ڈان ۱۶ جون ۱۹۴۸ء

میں موجود ہے۔

پور سردر سردر کا نگہ س کیٹی، امیر محمد خان بھی ۱۹ جون کو اس سازش کے سلسلے میں پیش در میں گرفتار کر لئے گئے۔

وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ آیا غفار خان ان جرائم کا مرتکب تھا یا نہیں۔ اسی پہلے ہی افغانان کی زیر سرپرستی تحریک "نجات" کا حامی بن چکا تھا اور حکومت پاکستان کے پاس اس یقین کی کوئی نہ کوئی وجہ تھی کہ ۱۹۴۸ء کے موسم بہار میں مربوط ہندوستانی اور افغان حملے سرحدات پر متوقع تھے۔ غفار خان ۲۵ ۱۹۵۳ء کے آخر تک جیل میں رہا۔ اس نے اس وقت سے مسلسل انکار کیا کہ اس کا اسی کے ساتھ کوئی تعلق تھا یا اسے کسی ایسے "نجات" کی خواہش تھی جو پاکستان کا مخالف ہو اور جس کے لئے اپنی کوشاں تھا، لیکن غالباً غفار خان کی گرفتاری کا اہم ترین پہلو یہ تھا کہ اس پر عوامی رد عمل بہت معمولی ہوا۔ ایک سال سے بھی کچھ عرصہ پہلے "بادشاہ خان" سردر کا مقبول ترین اور طاقتور ترین انسان تھا۔ چھ ماہ پرانی حکومت نے جون میں اسے کسی اہم عوامی احتجاج کے بغیر گرفتار کر کے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ اپنا وقار کتنا کھو چکا تھا۔

۸ جولائی ۱۹۴۸ء کو صوبہ سردر کی حکومت کو غیر معمولی اختیارات مل گئے کہ وہ آرڈینیٹس کے ذریعے تمام ایسی تنظیموں کے خلاف قانون قرار دے سکتی تھی جن کی سرگرمیاں امن و

تحفظ کے منافی ہوں۔ یہ صاف طور پر واضح کر دیا گیا کہ یہ اقدام خدائی خدمت گار بحیثیت ایک گروہ سے کہیں زیادہ اس بیرونی جوڑ توڑ کے خلاف تھا جو ان کا استحصال کرتی رہی تھی تاہم خدائی خدمت گار بیس سال بھی کم عرصے کی متشددانہ اور کبھی کبھار بے حد کامیاب سیاسی سرگرمی کے بعد ختم کر دیئے گئے اور اس کے ساتھ ہی سرحد میں ہٹوارے کا بحران بھی ختم ہو گیا۔

قبائلی علاقہ ۲

قانون آزادی ہند، دفعہ ۷، پیرا "ج" میں مذکور ہے:

اُس قانون کے پاس ہونے کی تاریخ پر وہ تمام معاہدات و متفقات بھی ساقط ہو جاتے ہیں جو شہنشاہ اور ان طاقتوں کے درمیان ہوں جو قبائلی علاقوں میں اختیار رکھتی ہوں اور او اس تاریخ پر موجود ذمہ داریاں جو کسی ایسے اشخاص یا قبائلی علاقوں سے متعلق شہنشاہ پر عائد ہوتی ہوں اور وہ تمام اختیارات، حقوق، حاکمیت یا داسرہ اقتدار جو قبائلی علاقوں میں یا ان سے متعلق کسی معاہدہ، سند شاہی، رواج، چشم پوشی یا کسی بھی وجہ کی بناء پر اس تاریخ کو شہنشاہ کے استعمال میں لائے جاسکتے ہوں۔

اس کی وجہ سے دیر، سوات، چترال اور امب کی ریاستوں

کے سامنے بھی وہی مسئلہ پیش ہوا جو مزید مشرق کی طرف زیادہ
اہم ریاستوں کے سامنے پیش ہوا تھا یعنی مسئلہ اسحاق، یہی حال طائفوں
اور قبائل کا تھا جن کا کوئی مسلمہ حاکم فرد یا ادارہ نہ تھا جو ان کا ذمہ دار
ہوتا۔ بلوچستان میں قلات، مکران، بسیلہ اور خاران کی ریاستیں بھی
جو پٹان سرحد کو بحیرہ عرب سے ملاتی ہیں اسی مسئلے سے دوچار تھیں۔
گویہ علاقے اور ان کے لوگ واقعتاً ”ہندوستان کے دور افتادہ
ترین حصے“ تھے تاہم یہ برصغیر میں رہنا ہونے والے واقعات
سے ناگزیر طور پر متاثر ہوئے تھے۔ جب پشاور میں مسلم لیگ
کا نگرہس سے مسابقت میں شریک تھی تو قبائل اپنا اظہار روایتی انداز
میں کمر ہے تھے ۱۹۴۷ء کے پہلے تین ماہ میں آفریدیوں نے تین دفعہ
درہ خیبر کو بند کیا تھا۔ آفریدی ملک کی ایک جماعت سراولف
کیرو کے بوجھ کو معمولی سا بھی ہلکا نہ کہہ سکی جب وہ پشاور کے
گورنمنٹ ہاؤس میں اسے سیتلنے آئی۔ ہمیں ”کانگرہس پارٹی سے
سرکار نہیں۔ ہمیں مسلم لیگ سے واسطہ نہیں۔ ہم ایک ایسی حکومت
کے ساتھ بات کر سکتے ہیں جو طریقہ کی نمائندہ ہو۔ درہ خیبر ہمارا
ہے اور ہم اسی بنیاد پر سودا کریں گے۔“

ایک ماہ بعد ایسا ہی اعلان لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے سامنے ایک

ملک دین خیل آفریدی، ملک عبداللطیف خان نے کیا جب وہ سرحد کے دورے پر تھا۔ عبداللطیف ایک قدم اور بھی آگے گیا اور دھکی دی کہ اگر وہ آئندہ تعلقات سے مطمئن نہ ہوا تو افغانستان سے مذاکرے کرے گا۔ یوں آزادی نے اس آزادی کی قانونی تصدیق کر دی جو عملاً انہیں حاصل تھی۔ انگریزوں کے جانے سے سرحدی پہاڑیوں کے طرز زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑا، لیکن میدانوں میں جو کھیلی مچی اس میں ایک تاریخی کشش تھی۔ ستمبر کے آغاز تک کہیں کہیں قبائلی نقل و حرکت دیکھنے میں آئی۔ بلوچستان میں لغاریوں نے زبیریں پنجاب میں ہلے بولے اور دہشت و تباہی کا سماں پیدا کر دیا۔ پٹھانوں کے ایک فحلو ط گردہ نے کوہاٹ کے قریب ایک فوجی ٹرین پر حملہ کیا جو بمبئی گرنیڈیئرز کو کوہاٹ چھاؤنی سے واپس لے جا رہی تھی اور ۲۲ مار دیئے اور ۹ زخمی کر دیئے۔ لیکن یہ واقعات اکاؤنٹاتے اور ۶ ستمبر کو ٹائمز کے چشم دید نامہ نگار نے خبر دی ”پٹھان قبائلیوں نے بھی ابھی تک کوئی خاص مسئلہ کھڑا نہیں کیا کیونکہ سال کے اس حصہ میں وہ اپنے ریوڑوں کے ساتھ وادیوں میں اتر آتے ہیں۔ پٹھانوں کا گولی چلانے کا موسم سال کے بعد کے حصہ میں شروع ہوتا ہے“ بحیب گولیاں چلانے کا موسم آیا تو پٹھانوں کی ساری توانائیاں جہاد کشمیر پر مرکوز تھیں اور قبائلی علاقہ خاموشی سے اور قریباً غیر محسوس

طور پر پاکستان کا ایک حصہ بن گیا۔ کراچی کی حکومت نے ہر طرف سے مجبور ہو کر فوری طور پر قبائلی علاقے میں تمام فوجی تنصیبات کو ایک دم چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ کشمیر میں مصروف ہونے کی وجہ سے قبائلی ان کی وفاداری پر اعتماد کے اس اشارے کو بمشکل ہی دیکھ سکے۔ گورنر جنرل جناح صاحب کی سالگرہ کے دن ۲۵ دسمبر ۱۹۴۹ء کو اعلان کیا گیا کہ باقاعدہ فوجی یونٹوں کی واپسی مکمل ہو گئی تھی۔ تمام اہم ترین قبائل کے جرگوں نے پہلے ہی سر جارج کنگسم کے ساتھ معاہدے کر لئے تھے کہ انہوں نے پاکستان کو انہی شرائط پر اپنا نیا حاکم تسلیم کر لیا تھا جو انگریزوں کے ساتھ کی گئی تھیں۔ وسط جنوری ۱۹۴۸ء میں وزیراعظم لیاقت علی خان نے بھی قبائلی علاقے کا طوفانی دورہ کیا تاکہ عل اسحاق کو تقویت حاصل ہو۔ وہ ۱۵ جنوری کو خیبر راٹھور کے صدر مقام لنڈی کوتل کے ایک جرگہ میں موجود تھے اور انہوں نے قبائلیوں سے کشمیر واپس آنے کی رسمی اپیل کی۔ آفریدیوں نے ان کا دایمانہ استقبال کیا لیکن ان کی درخواست کو ٹھکرا دیا۔ عبداللطیف خان اور مراد خان شورو نے اعلان کیا کہ کشمیر پٹانوں کا تھا اور ۶۰ ہزار قبائلی جو وہاں گئے تھے اس وقت واپس ہوں گے جب تک وہ اسے راکر جیت نہ لیں۔ دونوں ملک نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لاداکھ میں اخافتے کا مطالبہ کیا تاکہ فضلوں کی کمی کا مداوا ہو سکے اور

ان کی نئی ذمہ داریوں کے اخراجات پورے ہو سکیں لیاقت علی نے جواباً خوبصورتی سے ان درخواستوں کو ٹھکرا دیا۔ اگلے دن میرانشاہ اور ٹانک میں بھی ایسے ہی مناظر دیکھے گئے جہاں وزیراعظم نے وزیر اور محسود جگروں سے خطاب کیا۔

۴ مارچ ۱۹۴۸ء کو تھکے ماندے بیمار لیکن فتح مند قائداعظم محمد علی جناح بھی آئے اور یوں الحاق کا یہ عمل اپنے جو بن پر پہنچا۔ وہ خیبر سے گزرتے اور اسی کے سرے پر سرحد پار، ڈیو زڈ لائن کی دوسری طرف افغان سنتری سے ہاتھ ملائے۔ آفریدیوں اور شنواروں نے خوشی کے اور اعزاز کے طور پر اپنا بارود دل کھول کر استعمال کیا۔ کوکی خیل آفریدیوں کے نوجوان رہنما، ملک ولی خان نے قائداعظم کو ۳-۳ رائفل بطور اظہار دوستی و وفاداری پیش کی جو ہموں میں اس کی اپنی فیکٹری میں تیار کی گئی تھی۔ (چار سال بعد یہی ولی خان کابل میں ایک مفرد کی حیثیت سے زیادہ مخالف قیامیوں کا ایک لشکر پاکستان پر حملہ کے لئے لایا) لیکن جشن مناتے ہوئے قبائلی بالکل بے خود نہیں ہوئے۔ حسب معمول انہوں نے کہا کہ اگر انہیں سی قوم کی مناسب خدمت کے قابل بنانا مقصود تھا تو انہیں خوراک و پوشاک کے لئے زیادہ الاؤنس دے کر رہتے۔

۱۴ اپریل کو پشاور کے گورنمنٹ ہاؤس میں تمام قبائلی کما بھر گئے منعقد ہوا۔ قائداعظم کی موجودگی میں ۲۰ ملک نے پاکستان

سے وفاداری کا حلف اٹھایا۔ اپنے نئے ملک کے لئے کشمیر حاصل کرنے کا عزم دہرایا اور التجا کی کہ انہیں براہ راست مرکزی حکومت کے تحت رکھا جائے۔ یہ التجا ۶ جولائی کو منظور کر لی گئی جب قائد اعظم نے ریاستوں اور سرحدی علاقوں کی وزارت قائم کی اور ذاتی طور پر قبائلی علاقہ کی ذمہ داری قبول کر لی۔

جب کراچی میں یہ اقدامات ہو رہے تھے تو ٹیڈ جی سکاوٹوں کے ایک دستہ نے وزیرستان میں فقیر ایپی پر حملہ کیا اور ایک معرکہ میں ایپی کا نائب سید امیر مارا گیا اور ۳ قیدی بنائے گئے۔ ایک اور واقعہ ہوا کہ ایک انگریز پولیٹیکل افسر پی۔ ٹی۔ ڈیکمن جس نے بطور پولیٹیکل ایجنٹ جنوبی وزیرستان پاکستان میں رہنا منظور کیا تھا ایک براہِ گنجنہ محسود کے ہاتھوں لٹاؤ سے کوئی ۶ میل کے فاصلے پر مارا گیا۔ ان دو واقعات کے سوا وحشیانہ قبائلی علاقہ پر امن طور پر نئے دور میں داخل ہو گیا۔

وظائف جاری رکھے گئے لیکن سال کے خاتمہ تک ظاہر ہو گیا کہ قبائلی علاقوں میں فوجی چھاؤنیوں کی ویرانی ایک رحمتِ بے زحمت نہ تھی۔ فوجیں جو گئیں تو ان کے ساتھ ہی رسد رسانی اور سڑک سازی کے ٹھیکے بھی گئے جو نادار قبائل کے لئے اقتصادی طور پر اتنے اہم تھے۔ محسودوں اور وزیریوں کو بہت نقصان ہوا اور ابھی ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ وہ دستوں کی واپسی کی درخواستیں

کرنے لگے لیکن مجموعی طور پر قبائلی علاقہ میں آنا امن و سکون تھا کہ
ساہا سال بعد نصیب ہوا تھا۔

ریاستیں :-

سرحدی ریاستوں نے نئی حکومت پاکستان کو کوئی مسئلہ پیش
نہیں کیا۔ سب نے فوراً ہی اسحاق دہلوی اور چترال نے اس مہم حاکمیت
کو نظر انداز کر دیا جو کشمیر ۱۸۵۷ء سے اس پر جتلا رہا تھا۔ بلوچستان
ریاست قلات نے جو جنوبی سرحد پر چھائی ہوئی تھی اور اس میں ایک مضبوط
پٹھان عنصر تھا، ایک زیادہ مشکل مسئلہ پیدا کیا۔

۱۲ اگست ۱۹۴۷ء کو خان قلات میرا حمزہ خان نے
بادلی ناخواستہ پاکستان کے ساتھ ایک معاہدہ قبول کر لیا جس میں
آزادانہ رسل و رسائل اور تجارت کی آمد و رفت کی ضمانت تھی۔
دفاع، خارجہ امور اور مواصلات پر بعدہ مذاکرات کا ذکر
تھا اور قلات کو ہندوستان کی دیگر ریاستوں سے مختلف
درجے کا سمجھتے ہوئے ایک آزاد ریاست تسلیم کیا گیا تھا۔
یہ غیر معینہ صورت حال چھ ماہ تک جاری رہی جب پاکستان
زیادہ توجہ طلب مسائل حل کرتا رہا۔

دریں آثناء خان قلات نے اپنے عزائم کا کھل کر اظہار
کر دیا۔ اس نے جنگی اہمیت کے کورٹ اور یولان کے علاقوں کی

واپسی پر زور دینا شروع کیا جو تین چوتھائی صدی پہلے ریاست
 قلات نے انگلیزوں کو اجارے پر دیئے تھے ۱۲ فروری ۱۹۴۸ء
 کو قائد اعظم میر احمد سے بھی میں ملے لیکن کراچی اور قلات کے
 درمیان بڑھتا ہوا تناؤ کم نہ ہو سکا تاہم قائد اعظم طاقتور بلوچ
 اور براہوئی قبائلی سرداروں کی اطاعت حاصل کرنے میں کامیاب
 ہو گئے جو عرصہ سے خان سے بگڑے ہوئے تھے۔ خبریں آنے لگیں
 کہ میر احمد ہندوستان اور افغانان دونوں سے رابطہ قائم کئے
 ہوئے تھا تا کہ ایک مکمل طور پر آزاد قلات کے لئے حمایت حاصل کر
 سکے۔ کراچی بالخصوص افغانان اس مبینہ پیش کش پر متفکر تھا
 کہ وہ گواورد اس وقت عمانی حاکمیت میں) اور پنی کی بندرگاہیں
 استعمال کر سکتا تھا۔ یہ بھی بتایا گیا کہ خان نے ہندوستان کو پیش کش
 کی تھی کہ وہ خلیج فارس کی پروازوں کے دوران مکرانی ایر فیڈ
 بطور درمیانی وقفہ استعمال کر سکتا تھا۔

ان کے سدباب کے لئے پاکستان نے ایک پورے اور غیر مشروط
 الحاق کے سلسلے میں اپنا دباؤ بڑھانا شروع کیا۔ ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء
 کو قلات کنفیڈریسی کی تختیاریاستوں، غاران، مکران اور لس بلہ
 نے میر احمد خان کے احکامات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پاکستان
 سے الحاق کر لیا۔ پاکستانی فوج کوٹھڑ میں بڑھادی گئی اور بحریہ کے
 یونٹ ساحل مکران پر گشت کرنے لگے۔ مارچ کے آخر میں پاکستانی

وزارت خارجہ کے جوائنٹ سیکرٹری کرنل اے ایس بی شاد نے کوئٹہ میں قلات کے وزیر خارجہ کے ساتھ نئے مذاکرات کا آغاز کیا۔ اسی گفت و شنید کے دوران خان نے قلات کے وزیراعظم محمد اسلم خان کو اس بناء پر گہ فہرست لیا کہ وہ پاکستان کے ساتھ سازش کر رہا تھا۔ ۲۷ مارچ کو آل انڈیا ریڈیو نے یہ خبر نشر کی کہ خان نے دو ماہ پہلے ہندوستان سے اسحاق دہریہ کی کوشش کی تھی لیکن اسے ٹھکرا دیا گیا تھا۔ بعد میں وزیراعظم نہرو نے ہندوستانی پارلیمنٹ میں اس خبر کی تردید کر دی لیکن اس سے بحران ختم ہو گیا اور ۲۸ مارچ کو میر احمد نے غیر مشروط طور پر پاکستان کے ساتھ اسحاق دہریہ لیا۔

جہاد کشمیر :-

۱۹۴۷-۴۸ء میں کشمیر پر بھانوں کا حملہ دو محاذ سے اہم ہے ایک تو بین الاقوامی اور قانونی ہے۔ اس میں آزادی اور بٹوار کے وقت ریاست کا مقام اور اس وقت سے ہندوستان اور پاکستان دونوں کے ساتھ اس کے تعلقات شامل ہیں۔ یہ مسئلہ اقوام متحدہ کے سامنے کئی دفعہ گرما گرم بحثوں کا موضوع رہا ہے اور ہندوستان اور پاکستان کے درمیان درجنوں دوطرفہ کانفرنسوں کے زیر غور آیا ہے۔ اس کی تفصیلات پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔

حملے کا دوسرا رخ کشمیر میں قبائلیوں کی کارکردگی پر مشتمل

ہے۔ اس پر کوئی توجہ نہیں دی گئی حالانکہ اس میں قبائل کے کردار کی ایک کلید اور ان کی قوت کی امکانات اور تحدیدات کا ایک عملی ثبوت پوشیدہ ہیں۔ قبائلیوں نے کشمیر میں بہت سے ایسے کام بھی کئے جو قابل تعریف نہ تھے لیکن اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ ریاست میں ان کی مداخلت بنیادی طور پر اس لئے ظہور پذیر ہوئی کہ ان تک ظلم و ستم کی داستانیں پہنچیں جو ریاستی فوج کے ڈوگرے کشمیر کے روایتی جنگجو اور ہندو تشدد پسند تنظیم، جن سنگھ کے کارکن کشمیر کے مسلمان باشندوں پر کمرہ بستے تھے۔ اس نے ان کے کشمیر پر حملے کو ان کی نگاہوں میں صحیح معنوں میں جہاد کا رنگ دے دیا۔

۲۲ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی رات کو جب پنجاب میں کشت و خون ابھی قدرے کم ہونے لگا تھا تو قریباً ۲۰ ہزار پٹھانوں کا ایک لشکر جس میں زیادہ تر آفریدی تھے۔ صوبہ سرحد کے ضلع ہزارہ سے سرحد کشمیر کے عین پارہ مظفر آباد کے قصبے میں وارد ہوا۔ ان میں سے اکثر ڈومیل کے مغرب میں قریباً ۱۰۰ ارٹھروں پر کرشن گنگا پل پار کر کے آئے تھے۔ کچھ اور زیادہ رومانوی انداز میں گٹھوں اور تختوں پر تیر کر پہنچے تھے۔ انہوں نے تیری اور چابکدستی سے مظفر آباد کو لوٹا اور پھر بڑی سڑک پر اوڑھی اور سری نگر کی طرف روانہ ہو گئے۔

ایک اور گروہ پونچھ کے راستے اوڑھی کی طرف بڑھا۔

غیر منظم اور خوفزدہ ریاستی فوجی ان کے سامنے ٹھہرنے کے ۔
چھاپہ ماروں نے مظفر آباد اور ڈوٹھیل کے درمیان سڑک پر ڈوگروں
کی ایک بٹالین سے مقابلہ کیا اور انہیں تتر بتر کر دیا۔ انہوں نے
پاور سٹیشن پر قبضہ کر لیا جو پچاس میل مزید مشرق کی طرف سرنگم
کو بجلی مہیا کرتا تھا۔

حلقے کی خبر دہلی میں ۲۶ اکتوبر کو چھپی اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن
کے ساتھ ایک بہ عجلت تیار کردہ معاہدے کے مطابق مہاراجہ کشمیر
نے جس نے اب تک ہندوستان یا پاکستان سے الحاق کرنے سے
انکار کر دیا تھا۔ اپنی ریاست کو ہندوستان سے تقبھی کر دیا۔ شیخ
عبداللہ (جسے مہاراجہ کی جیل سے اسی مقصد کے تحت چھوڑا گیا
تھا) کے تحت ایک عبوری حکومت سرنگم میں بنائی گئی اور ۲۷
ہندوستانی سکھ فوجی بذریعہ ہوائی جہاز فوراً ریاست میں بھیج
دیئے گئے۔

۲۷ اکتوبر تک یٹھان شکر پٹن پہنچا جو سرنگم سے ۱۸ میل

دور تھا لیکن اس کے ہراول دستے پہلے ہی دامان حکومت کے
مضافات تک پہنچ رہے تھے۔ ۱۵ ہزار کی کشمیری ریاستی فوج
پہلے ہی فرار و اموات وغیرہ کی وجہ سے قریباً ختم تھی اور سری نگر
کے دفاع کا انحصار ہندوستانیوں پر تھا۔ سکھ بٹالین سری نگر کے
ہوائی اڈے پر بس عین وقت پر ہی پہنچ کر قبائلیوں سے بچا سکی۔

جیسا کہ ثابت ہوا۔ ہوائی اڈے پر ہندوستانی قبضے کا مطلب یہ بھی تھا کہ حملہ آوروں کی فتح رک گئی۔ لیکن کچھ عرصے کے لئے نتیجہ مشکوک رہا۔ چھا پہ مار وادی کشمیر کے دروازے، بارہ مولہ پر بہت سخت جے ہوئے تھے ۳۱ اکتوبر کو انہوں نے ایک دستہ پہاڑیوں کے پار گلبرگ کو بھیجا۔ اسی دن انہوں نے اوڑی کے قریب دو گروں کے نو منظم باقیات کو توڑ پھوڑ دیا۔

لیکن سکھوں نے ہوائی اڈے پر اپنی گرفت مضبوط رکھی اور ہندوستان سے کمک مسلسل آتی رہی اور ایک ماہ پرانی رائل انڈین ایئر فورس نے اپنے آتش بار پٹاخوں کے ذریعے وادی کی بلندیوں تک چھا پہ ماروں کے رسل و رسائل اور حمل و نقل کو مخدوش کر دیا۔ نمبر کو قبائلی پٹن سے باہر دھکیل دیئے گئے جب انہوں نے ہوائی اڈے پر ایک قینچی چال کی کوشش کی جو بہادرانہ تو تھی لیکن دیر سے کی گئی، ان میں سے بعض تو پیپا ہونے سے پہلے سرینگر سے صرف پانچ میل کے اندر تھے۔ یہ کشمیر میں ان کی پیشقدمی کا نقطہ معراج تھا۔

لڑائی تیسرے ہفتے میں داخل ہوئی تو ہندوستانی باقاعدہ فوج کا بڑھیا نظم و ضبط اور ہوائی طاقت کے فوائد کا بہت بُرا اثر ہوا اور چھا پہ مار بتدریج وادی میں پیچھے دھکیلے جانے لگے ۸ نومبر تک سرینگر کو خطرہ نہ رہا اور چھا پہ مار بارہ مولہ کی اہم چوکی سے بھی نکال دیئے گئے، جہاں اپنے پہلے قبائلی حملے میں انہوں نے ایک ریٹائرڈ انگریز

کرنل اس کی بیوی اور مقامی کانٹونمنٹ کی ایک راہبہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

جب پہلے آئینوالے پسپا ہو رہے تھے تو مزید قبائلی ریاست میں داخل ہو رہے تھے۔ نومبر کے پہلے ہفتے تک ۱۰ ہزار سے زیادہ قبائلی وادی بھر میں پھیلے ہوئے تھے۔ پاکستانی فوج کے رخصتی افسر بھی ان سے آئے تھے اور اتفاقی طور پر ایک امریکی فوجی سارہ جنٹ بھی آگیا تھا جو اپنی آمد کے چند ہفتوں بعد اس علاقے سے نکالے جانے سے پہلے ”برگیڈیئر“ بن چکا تھا۔ چھاپہ ماروں نے چھوٹی اور بڑی توپیں قبضائیں اور انہیں استعمال میں لائے تھے، کہا جاتا تھا کہ مزید بھاری ہتھیار انہیں پاکستانی فوجی سرد خانوں سے پہنچتے رہتے تھے۔

ہندوستان نے اپنے تمام دستیاب ہوائی جہاز کشمیر میں فوجیں اتارنے کے لئے وقف کر دیئے تھے کیونکہ سردی میں کوئی قابل عمل زمینی راستہ موجود نہ تھا۔ وسط نومبر تک ایک برگیڈ سے زیادہ فوج اتاری جا چکی تھی۔ جب وسط مہینے میں لڑائی سست پڑ گئی تو وادی کافی حد تک قبائلیوں سے خالی ہو چکی تھی، لیکن جموں کے علاقے میں ایک خوفناک جنگ بھڑک اٹھی جب پانچ چھ ہزار قبائلیوں نے جھنگر سے ہندوستانی فوجیوں کو نکال باہر کیا۔ وہ ۶ جنوری ۱۹۴۸ء کو نوشہرہ پر حملہ آور ہوئے لیکن بھاری ہوائی قوت کی مدد سے پسپا کر دیئے گئے۔ پورے جنوری اور فروری میں شہر جموں جو ہندوستان

اور کشمیر کے درمیان واحد بری راستے پر ایسا وہ ہے فیض کے فوری
 خطرے میں رہا۔ ۲۱ فروری کو چترال سے چھاپہ ماروں کا ایک گروہ
 جو گزشتہ نومبر میں گلگت میں نفوذ کر گیا تھا وسط قرار قمر میں ۱۲
 ہزار فٹ اونچا درہ برزیل عیو رکھ کے بلتستان کے دارالحکومت
 سکے دوپریکے بعد دیگرے چلے گئے ننگا جو وادی میں آنے والے شمال
 راستے کے سرے پر واقع ہے۔

موسم بہار کے آتے ہی ہندوستانی فوج نے میجر جنرل
 تھمپا (بعد ازاں کوریا شہرت کا) کے تحت اپنا بھرپور حملہ شروع
 کیا تاکہ سڑکیں کھولی جاسکیں اور بیرون وادی علاقوں کو صاف
 کیا جاسکے جہاں پچھلے سال رسائی نہ ہو سکی تھی۔ اس کے جواب میں
 پاکستانی فوج کے باقاعدہ سپاہی ریاست میں داخل ہو گئے اور
 اکثر قبائلی واپس چلے گئے۔ وسط اپریل تک صرف چند ہزار درہ
 گئے گو بعض آخر تک لڑائی میں شریک رہے جب یکم جنوری
 ۱۹۴۹ء کو مجلس اقوام متحدہ کی زیر نگرانی جنگ بندی کی گئی۔

جہاد کشمیر میں شریک ہونے والے قبائلیوں کی کل تعداد کا صحیح
 اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ لڑائی کے سال کے دوران غالباً ان کے
 کئی کئی ہزار آدمی ایک یا دوسرے وقت وہاں موجود رہے۔ وادی
 میں ابتدائی ریل پیل قریب قریب غاصتاً پٹھانوں کی ہی آزدہ
 تھی۔ جموں کی لڑائی میں قبائلی غالباً وحشت میں ہوں تو ہوں لیکن

تعداد میں مقامی کشمیریوں (بالخصوص پونچھیوں) سے زیادہ نہ تھے جن کی بغاوت کی حمایت کے لئے وہ میدان میں اترے تھے۔ پاکستان کے تمام اور افغانستان کے اکثر بڑے بڑے قبائل نے کشمیر میں اپنی اپنی ٹولیاں بھیجی تھیں۔

اگرچہ کشمیر کا بڑا معرکہ واوی میں ہوا پھر بھی چھاپہ مار ریاست کے ہر حصہ میں پہنچے۔ سرینگہ و تہہ خیبر کے دروازے پر واقع قلعہ جمرود سے ۲۹۰ میل ہے۔ یہ فاصلہ وزیرستان کے وسط میں واقع رزک سے قریباً اس سے دو گنا ہے۔ سکرو و اور لدراخ سرینگہ سے ۱۵۰ میل مزید دور اور کمرہ ارض کے بعض بلند ترین پہاڑوں پر ہیں۔ پٹھانوں کے جنگی نعرے ان سب مقامات پر سُنے گئے، چھاپہ ماروں نے لدراخ کی دور افتادہ واوی میں قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ وہاں کی ایک اہم ترین بدھ خانقاہ کے سر لاما کو مار دیا اور چین کے ساتھ کاروانی تجارت کا راستہ بند کر دیا۔

یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ سب قبائل اپنی سرگرمیاں شروع کرنے کے لئے کشمیر کی سرحد پار کرنے کا انتظار نہ کر سکے اور پنجاب کے شمالی اضلاع نے ان کی آمد و رفت سے بہت نقصان اٹھایا۔ کشمیر سے واپسی پر ایک چھاپہ مار گروہ نے ضلع گجرات سے گزرتے ہوئے ۱۳ جنوری ۱۹۴۸ء کو ایک غیر مسلم پناہ گزین ٹرین پر حملہ کیا اور پاکستانی فوجی یونٹوں نے چھ گھنٹے جم کر لڑائی کے بعد

ہی انہیں پسپا ہونے پر مجبور کیا۔

ہندوستانی الزام کہ حکومت پاکستان نے قبائلی حملے کی حوصلہ افزائی اور چشم پوشی کی نہ صحیح ثابت ہو سکا نہ غلط۔ سابقہ برطانوی ہندوستانی فوج کے مسلم افسروں نے یقیناً چھاپہ مار ٹولیوں کی قیادت کی مسلم لیگ نیشنل گارڈز کے ارکان جیسے میجر خورشید انور نے جو مظفر آباد پر ابتدائی حملے کے دوران موجود تھا، چھاپے بھی مارے لیکن ان میں اکثر افسروں نے کمان سنبھالی بلکہ زیادہ صحیح طور پر وہ قبائلی لشکروں کے ساتھی تھے ہو گئے جب آخر الذکر پہلے ہی کشمیر میں پہنچ چکے تھے یا وہ کشمیر کے لئے رواں دواں تھے۔

۱۹۴۸ء کے موسم بہار میں پاکستانی فوج کے میدان میں آنے سے بہت پہلے بھاری آلات زیر استعمال تھے۔ جو عموماً قبائلیوں کے اسلحہ خانوں میں شامل نہ تھے۔ چھاپہ ماروں کی گاڑیوں کو صوبہ سرحد کے سرکاری ذخیروں سے گیسولین کی باقاعدہ فراہمی ہوتی تھی صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ قیوم نے جنوری ۱۹۴۸ء میں چھاپہ ماروں کی حوصلہ افزائی کا اعتراف کیا گو وزیر اعظم لیاقت نے تمام ذرائع کے مطابق کمر قانون پسند گورنر جنرل قائد اعظم کے سخت احکامات کے مطابق حملے کو نہایت مخلصانہ طور پر روکنے کی کوشش کی تھی۔

لیکن اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ حملے کی

ترغیب و تشویق خود قبائلیوں کے اندر سے پیدا ہوئی۔ گو کبھی کبھار بے معنی تباہی اور لوٹ مار بھی ہوئی تاہم وہ ایک پُر خلوص جذبہ جہاد کے تحت ہی حرکت میں آئے تھے۔ خونیں جھگڑے اور دیرینہ بین القبائلی دشمنیاں عارضی طور پر بالائے طاق رکھ دی گئیں۔ بہت سے مبصرین کا خیال تھا کہ جہاں تک چھاپہ ماروں پر کسی کنٹرول کا تعلق تھا ملوک کی بجائے پیر اور ملانہ یا دہ با اثر تھے۔ تمام حصہ گیر قبائل آج بھی اپنے تجربات کو مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ ایک ملک نے ۱۹۵۴ء میں اپنا تجربہ یوں بیان کیا: ”یہ میری زندگی کا بہترین دور تھا۔ ہم رائفل پدوش گاتے ہوئے گئے، کوئی چیز ہمارے سامنے نہ ٹھہر سکی۔“

۱۹۴۸ء سے قبائل مسلسل مطالبہ کرتے رہے ہیں کہ انہیں کشمیر واپس جانے دیا جائے۔ بعض اوقات یہ مطالبہ بلا شک و شبہ پاکستانی اہلکاروں کے اشارے پر نہایت مصمم انداز میں بیرونی اصحاب کے سامنے پیش کیا گیا لیکن اکثر و بیشتر یہ مطالبہ از خود کیا گیا۔ اس مطالبے کا اہم ترین محرک نہایت سادہ لیکن کلاسیک ہے یعنی بدل یا فرض انتقام۔ بہت سے قبائل کے افراد کشمیر کے میدان جنگ میں کام آئے۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ جنگ نہ جیت سکے اور واپس جا کر اپنی عزت پر گئے ہوئے اس باغ کو دھونے کا جذبہ ان کے اندر بہت مضبوط ہے اور یوں ہمارے

دور کا ایک دھماکہ خیز ترین بین الاقوامی واقعہ اسلامی جہاد کے ننگ
تصور سے رونما ہوا جس کی اب بھی پٹھان عزت کے ننگ تر تقاضے
کے تحت تجدید ہو سکتی ہے۔

(۱۵) باب یازدہم

پاکستان! مسائل اور ترقی

تعارف :-

شمال مغربی سرحدی صوبہ ۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کا حصہ بنا۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو یہ پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے ساتھ ہی مغربی پاکستان کے ون یونٹ، صوبہ میں مدغم ہوا۔ اس طرح یہ قریباً آٹھ سال تک پاکستان کی ایک آزاد سیاسی کائی بنا رہا۔ یہ باب زیادہ تر اسی دور سے متعلق ہے۔ ان میں سے پہلے پانچ سالوں میں صوبہ سرحد کے معاملات کے مدارِ المہام مسلم لیگی لیڈر خان عبدالقیوم خان ہی رہے جو ۲۲ اگست ۱۹۴۷ء کو وزیر اعلیٰ بنے تھے۔ قیوم اس صوبے میں استحکام و ارتقاء کا ایک ایسا دور لائے جو اس کی تاریخ میں اپنی نظیر آپ ہے۔ ۱۹۴۵ء تک قیوم کانگریس پارٹی کا ممبر تھا۔ وہ دہلی کی مرکزی اسمبلی میں عین اس وقت کانگریس کا ڈپٹی لیڈر رہا

جب لیاقت علی خان جو بعد میں پاکستان کے پہلے وزیر اعظم بنے، مسلم لیگ کے ڈپٹی لیڈر تھے۔ ایک کتاب شائع کرنے کے تھوڑا عرصہ بعد ہی جو کانگریس کے اغراض و مقاصد کی قصیدہ خواں تھی اور جو عبدانغفار خان کے نام منسوب کی گئی تھی، بھارتی قیوم نے اگست ۱۹۴۵ء میں کانگریس چھوڑ دی اور نظریہ پاکستان کی حمایت شروع کر دی جسے مسلم لیگ آگے بڑھا رہی تھی۔ وہ اس وقت سرحد کی چھوٹی سی بے اثر لیگ میں شامل ہوا۔ سرحد لیگ کو پھیلانے اور خان صاحب کی حکومت کا تختہ الٹنے کی تحریک میں اس کا کردار پچھلے باب میں بیان ہو چکا ہے۔

آزادی کے پہلے چھ ماہ تک قیوم نے بلا شرکت غیرے صوبہ پر حکومت کی۔ اس نے اپنی کابینہ میں قانون ساز اسمبلی کا صرف ایک اور ممبر شامل کیا جس میں ہٹوارے کے بعد غیر مسلم ارکان کے انخلاء کے نتیجہ میں کل ارکان پیپاس کی بجائے انتالیس رہ گئے تھے۔ اسمبلی ممبران کی وفاداری بالکل یقینی نہیں تھی اور کچھ عرصے کے لئے ایسا لگتا تھا کہ غفار خان کے ”پنجتستان“ کی حمایت میں ایک قرارداد پاس ہو جائے گی لیکن ۱۵ مارچ ۱۹۴۸ء

۴ - عبد القیوم گوڈائیڈ گنتر، آن دی پنٹان فرنیٹر، (بمبئی ہندوستان)

(۱۹۴۵ء)

ہم جب اسمبلی نے پاکستان سے وفاداری کا حلف اٹھایا قیوم تھے
سول اور پولیس کے محکموں کے مؤثر استعمال اور اسمبلی ارکان کے
ساتھ غیر معمولی طور پر کامیاب سیاسی جوڑ توڑ کے ذریعے صوبے
میں اپنا دبدرہ قائم کر لیا تھا۔ اس کی فتح اس وقت یقینی ہو گئی جب
غفار خان کا ایک سابقہ نائب میاں جعفر شاہ اپریل میں مسلم لیگ میں
شامل ہو گیا۔

جولائی ۱۹۴۸ء میں خدائی خدمت گاروں پر عائد شدہ پابندی
نے داعد باقی ماندہ چیلنج کو ختم کر دیا جو امکانی طور پر قیوم کے
اختیارات کے خلاف گھیر ہو سکتا تھا اور توسیع شدہ لیگ کی تنظیم
کے قریباً تمام عناصر نے قیوم کی قیادت کو تسلیم کر لیا۔ صرف لیگ کے
سابق صدر پیر صاحب ماتلی شریف الگ رہے۔ پیر صاحب اسلامی
مملکت کا پروگرام متوانے میں ناکام ہو کر حزب اختلاف میں چلے
گئے اور بالآخر ایچ۔ ایس ہرودی کی جناح عوامی لیگ کی سرحد پرانچ
کے صدر ہو گئے جو اس وقت قومی حزب اختلاف تھی۔

قیوم کے جارحانہ اور بعض اوقات یکطرفہ طریقوں کی وجہ
سے کبھی کبھی اس کی مرکزی حکومت سے بھی ٹکرا ہوئی اور مقامی لیگی
لیڈروں سے بھی۔ اس نے قائد اعظم کی خواہشات کے خلاف ۱۹۴۷ء
کی سردی میں کشمیر میں جانے والے قبائلی لشکر کی حوصلہ افزائی بلکہ پشت
پناہی بھی کی۔ اس نے فوراً ہی قبائلی علاقے کے بہتر ترقی یافتہ حصوں

پر صوبے میں انضمام کے لئے زور ڈالتا شروع کر دیا۔ اس نے مرکز ہی حکومت کی منظوری سے پہلے ہی ترقیاتی سکیموں پر عملدرآمد کرانا شروع کر دیا۔ اس نے سابقہ خدمات کا لحاظ رکھتے بغیر لیگ کی تنظیم میں سے غیر دوستانہ سیاستدانوں کو نکال باہر کیا۔ اس نے مخالف جماعتوں کو دبائے رکھے ایف سی آر کے تحت انتہائی اختیارات اور انگریزوں کے چھوڑے ہوئے خصوصی قانونی ہتھکنڈے استعمال کئے۔

۱۹۵۱ء کے انتخابات :-

قیوم اپنی مقبولیت اور حاکمیت پر آنا پُر اعتماد تھا کہ وہ جلد از جلد انتخابات کا منتظر رہا۔ یہ ۲۶ نومبر اور ۱۲ دسمبر ۱۹۵۱ء کے درمیان ہوئے اور پاکستان میں ہونے والے پہلے انتخابات تھے۔ اسمبلی کی نشستیں بڑھا کر پچاسی کر دی گئیں اور نمائندوں کا انتخاب بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر ہوتا تھا۔ سیاسی نشستیں مسلمانوں کے علاقائی حلقہ ہائے نمائندگی کے لئے تھیں، ۲۰ نشستیں مسلمان خواتین کے لئے مخصوص تھیں اور ایک غیر مسلم نمائندگی کے لئے۔ ایک مضمّن (گو ہمیشہ کامیاب نہیں) کوشش کی گئی کہ حلقہ ہائے نمائندگی کی حد بندی خاص جغرافیائی بنیادوں پر کی جائے تاکہ اقتصادی یا رشتہ داری کی بناء پر مقامی معتبرین کا رواجی اثر و رسوخ کم کیا جاسکے۔ مقابلے کے لئے فہرست رائے دہندگان

۱۔ این ڈیویڈ ایف پی (پاکستان) انعام میسن ڈیپارٹمنٹ، نوی مارنہ ویسٹ فوٹیر ریڈس

۲۔ اسمبلی کے لئے منتخب شدہ دونوں خواتین کا بیس منظر ٹیماں مستورات کے

مخصوص کردار پر دیکھ پختہ روشنی ڈالتا ہے دونوں خواہیں قریباً بیس سالہ

تھیں لیکن دونوں سالہا سال سے مسلم لیگ معاملات میں پیش پیش رہی تھیں مشمولہ

یہ تحریک سول نا فرمانی، دونوں پردے کی سخت یا بند تھیں اور اسمبلی کے کاروبار

میں بہت کم حصہ لیتی تھیں۔ دونوں بھتیجیاؤں کی ماری اور ارد گردانی سے بڑی تھیں

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نشتیں لے گئی تھی۔

اسمبلی میں بڑی اکثریت اور سیکرٹریوں اور محکمانہ سربراہوں کے ایک معمولی طور پر کارکنانہ دستے کے ساتھ قیوم نے اگلے ڈیڑھ سال میں ایک جامع قانونی اور ترقیاتی پروگرام کو عملی جامہ پہنایا۔

اپریل ۱۹۵۳ء میں اس نے بادل ناخواستہ سرحد کی وزارت اعلیٰ سے استعفیٰ دیا تاکہ محمد علی کی مرکز کی کابینہ میں شامل ہو سکے جس نے خواجہ ناظم الدین کی جگہ لی تھی جو بیاقت علی خان کی جگہ پاکستان کا وزیر اعظم بن گیا تھا۔ سرحد میں قیوم کا جانشین سردار عبدالرشید خان بنا جو اس وقت تک صوبائی آئی جی پولیس تھا۔ رشید نے قیوم کی قائم کردہ ہموار رفتار ترقی کو جاری رکھا جسے حتیٰ کہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو صوبہ سرحد وٹن یونٹ مغربی پاکستان میں ضم ہو گیا۔

قیوم اور مثالی صوبہ

صوبہ سرحد نے فقدان وسائل کے باوجود دیگر پاکستانی صوبوں کے مقابلے پر آزادی کے بعد کے سالوں میں زیادہ تیزی سے ترقی کی۔

(بقیہ حاشیہ)

ایک نئے اپنے شوہر کے ساتھ کشمیر جہاد میں حصہ لیا تھا۔ دیکھئے این ڈیو ایف پی (پاکستان) انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ "گائیڈ ٹو دی این ڈیو ایف پی اسمبلی" (لاہور پاکستان پرنٹنگ ورکس ۱۹۵۲ء) ص ۲۷ اور ۱۰۰

اس ترقی کا سہرا زیادہ تر قیوم کے سر ہے جو سیاسی میدان میں
 جمہوری طریقوں کے عدم لحاظ کے باوجود اپنے علاقہ کے لوگوں
 کی فلاح و بہبود کے احساس ذمہ داری کا سراپا مجسمہ تھا۔
 قبائلی تعلقات کے بغیر ایک "غریب لڑکا" ایک ایسے
 علاقے میں جہاں اہم ترین معاملات کا فیصلہ موروثی زمینداروں
 کے ایک چھوٹے سے گروہ یا قائم و دوام سرکاری خاندانوں پر
 منحصر تھا۔ قیوم بظاہر ابتداء میں خدائی خدمت گاروں اور کانگریس
 کی طرف خان برادران کی سماجی و اقتصادی اصلاحات کی تبلیغ
 کی وجہ سے مائل ہوئے۔ کانگریس سے اس کی حیرت انگیز علیحدگی
 کا اصلی محرک کبھی واضح نہیں ہو سکا۔ اس کے ناقدین ذاتی اقدار
 خواہی کا ڈھنڈورہ پیٹتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ خان برادران قیادت
 میں کسی کو شریک نہ کرنے والے تھے لیکن اس وقت مسلم لیگ میں
 بھی ذاتی کامیابی کے امکانات بھی بہم ہی تھے۔ ممکن ہے وہ
 کانگریس کی سرگرمی میں بڑھتی ہوئی فرقہ واریت پر مضطرب ہوا ہو
 لیکن اس میں مذہبی جنون کے آثار نہ تھے اور وہ سماجی و سیاسی زندگی

۴۔ قیوم ۱۹۰۱ء میں چترال میں پیدا ہوا۔ وہ ایک سرکاری اہلکار کا بیٹا تھا۔ مگر
 وہ پشاور میں پلا پڑھا اور پیردان چڑھاتا، تاہم اس کے سیاسی حریف خاندانی ماحدہ
 کی وجہ سے اسے ہمیشہ کشمیری ہی کہتے رہے۔

میں ملاؤں کے منفی کردار کا سخت نقاد تھا۔ اغلب ترین وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ بھی ایک علیحدہ ملک کی تخلیق اور پاکستان کے لئے ایک پُر اسرار اور نوشگفتہ محبت میں گم نہ ہو گیا تھا جس نے اس وقت کے ہندوستان کے بہت سے دیگر مسلمان رہنماؤں کو بھی اپنا اسیر بنا لیا تھا۔

بہر کیف جب وہ لیگ میں شامل ہوا تو اس نے اس کے قدامت پسند اقتصادی فلسفے کو قبول نہیں کیا جو اس پر حاوی تھا صوبے میں اپنی طاقت مستحکم کر کے اس نے قدامت پسند عناصر پر کم سے کم انحصار کیا اور وہ ان سے قطعاً لا تعلق ہو گیا جب اس نے ۱۹۵۱ء کے الیکشن میں یوسف خٹک ابراہیم جھگڑا اتحاد کو مغلوب کر لیا۔ عجیب بات ہے کہ جب اس کا بدترین سیاسی حریف عبدالغفار خان اس کے ہاتھوں جیل کی سلاخوں میں بند تھا، وہ نہایت تمہہ ہی سے ایک ایسے اصلاحاتی پروگرام کو نافذ کر رہا تھا جس میں بہت سے ایسے منصوبے شامل تھے جو پرانے خدائی خدمتگار لاکھ عمل میں پیش کے مباحیے تھے۔

اقتصادی ترقی

صوبہ سرحد کا بجٹ انگریزی دور کی طرح پاکستان کے تحت بھی خسارے کا بجٹ ہی رہا لیکن جیسے جیسے صوبائی حکومت کی سرگرمیاں

بڑھتی گئیں یہ بھی تیزی سے پھیلتا گیا۔ اخراجات ۴۷-۱۹۵۵ء کے
 ۳,۴۹,۹۳,۰۰۰ روپے سے بڑھ کر ۵۶-۱۹۵۵ء میں ۶,۴۸,۲۰,۰۰۰
 روپے ہو گئے۔ ریونیو سے باقی ماندہ اخراجات کے علاوہ ایک کیپٹل
 اخراجات کا بجٹ بھی عمل میں لایا گیا جس کی پشت پناہی پبلک
 اور مرکزی حکومت کے قرضوں نے کی۔ یہ صوبے کے ترقیاتی بجٹ
 کے مترادف ہے ۵۶-۱۹۵۵ء تک کیپٹل اخراجات کا اندازہ
 ۳,۵۵,۸۵,۰۰۰ روپے تھا۔ صوبے کی ترقیاتی ترجیحات اس رقم
 میں منعکس تھیں مشمولہ بہ

آبیاشی	۱,۵۹,۶۴,۰۰۰ روپے
زیادہ اناج اگاؤ	۵۱,۳۷,۰۰۰ روپے
بیکلی	۵۵,۰۰,۰۰۰ روپے
صنعتی ترقی	۷۰۰,۰۰۰ روپے

۱- صوبہ سرحد کے بجٹ: ۵۲-۱۹۵۱ء تا ۵۶-۱۹۵۵ء

سال	ریونیو	اخراجات	بقایا
۵۲-۱۹۵۱ء	۵,۷۷,۰۰,۰۰۰ روپے	۳,۴۹,۹۳,۰۰۰ روپے	۲,۲۷,۰۷,۰۰۰ روپے
۵۲-۱۹۵۲ء	۵,۷۷,۰۰,۰۰۰ روپے	۵,۷۷,۰۰,۰۰۰ روپے	۰ روپے
۵۲-۱۹۵۳ء	۵,۷۷,۰۰,۰۰۰ روپے	۶,۲۱,۸۶,۰۰۰ روپے	۴,۴۸,۰۰,۰۰۰ روپے
۵۴-۱۹۵۵ء	۶,۴۸,۲۰,۰۰۰ روپے	۶,۴۸,۲۰,۰۰۰ روپے	۰ روپے

سرکیں اور ٹرانسپورٹ ۵,۰۰,۰۰۰ روپے^۱

زراعت:

صوبہ سرحد کے قریباً پچھتر فیصدی باشندے اپنی گزاراوقات کے لئے بالواسطہ یا ملا واسطہ زراعت پر منحصر ہیں۔ اس کے باوجود صوبے کو سالانہ قریباً ۵۰ ہزار ٹن اناج کا خسارہ ہوتا ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ قبائلی علاقہ میں پیداوار انتہائی کم ہوتی ہے۔ اس خسارے کو کم کرنے کے لئے افزائشی اقدامات کئے گئے ہیں جیسے کناروں کی زمینوں کو زیر کاشت لانا اور بہتر بیجوں، آلات کھاد اور پھنڈی توڑ طریقوں کے ذریعے موجودہ زمینوں کی پیداوار بڑھانا اور آبادی میں مسلسل اضافہ اور اس کے نتیجہ میں بڑھتی ہوئی غذائی کھپت فی کس تیز رفتاری سے بڑھ رہی ہے اور سیدوں نے سالانہ خسارے کو جو کھانوں کا توڑ رکھا ہے۔ پھل کی پیداوار میں بالخصوص قابض ذکر پیش رفت ہوئی ہے اور بانجیوں کا رقبہ ۸۴۹۷ کے ۱۸ ہزار ایکڑ سے بڑھ کر ۱۹۵۵ء میں ۳۶ ہزار ایکڑ ہو گیا^۲ ایک وسیع دیہی ترقیاتی پروگرام موسومہ بہ ویلج ایڈز زرعی و صنعتی

^۱ - این ڈی بی ایف پی ریکارڈ ۱۹۵۵ء ص ۵۸

^۲ - این ڈی بی ایف پی ریکارڈ ۱۹۵۵ء ص ۸۵

ترقی) صوبے میں سرگرم ہے جس کی کفالت امریکی خاکن آپریشنز
ایڈمنسٹریشن، فورڈ فاؤنڈیشن اور پاکستانی حکومت کر رہی ہیں۔ ایک

بڑا تربیتی مرکز پشاور میں مکمل کیا گیا ہے جو سرحدی فن تعمیر کے
روایتی خطوط اور مغربی پبلک بلڈنگ کے افادی نمونے کا امتزاج
ہے۔ ویلچ ایڈ پروگرام ممبر دیہات کی کمیٹیوں کے توسط سے سماجی و
اقتصادی مسائل کے مقبوعہ پر حملہ کرنے میں خاصا کامیاب رہا ہے۔
اس میں مندرجہ ذیل شامل ہیں۔ چھوٹے چھوٹے مقدموں کا بلا مقدمہ
بازی فیصلہ، شادیوں پر اخراجات کم کرنے کی تلقین، سائنسی کھاد
اور بڑھیا بیجوں کا استعمال، گندم اور مکئی کی قطار وار بجائی،
مرکب کھاد کے گڑھوں کی کھدائی، نالیوں کی تعمیر نو، ٹیکہ لگوائی
ہم، بلیکے خلاف مہم، دیہات کے درمیان مواصلات کی بہتری
اور بخیر زمینوں کی بحالی۔

ان سب کے عقب میں زمینی اصلاحات کا ایک جامع
گومعتلانہ پروگرام تھا جو قیوم نے شروع کیا تھا۔ ۱۹۴۹ء میں بہت
سی جاگیرات یا حقوق مالیہ بعض حالتوں میں ٹیکس معافی) جو قدیم
سیاح یا مذہبی خدمات کے بدلے حاصل کی گئی تھیں منسوخ کردی
گیں۔

۱۹۵۰ء کے سرحد کے قانون مزارعت تلے نہ صرف

کاشتکار اور غیر کاشتکار طبقوں کے درمیان دیرنیہ رواجی امتیازات کو ختم کر دیا بلکہ قابض مزارعین کو اختیار دیا کہ وہ اپنے زمینداروں کو معقول معاوضہ دیکر اپنی پوری یا جزوی زیر کاشت زمین کی ملکیت حاصل کر سکتے تھے۔ اس قانون نے خدمات اور خصوصی ڈیوٹیوں مشمولہ بیگار کو بھی ختم کر دیا جو زمیندار روایتاً پیداوار کے مقررہ حصہ کے علاوہ غیر یا بند مزارعین سے وصول کرنے کے مجاز تھے۔ ایک اور قانون کے ذریعے جو اسی کے ساتھ ہی پاس کیا گیا ۱۹۲۰ء سے پہلے کے رہن نامے منسوخ کر دیئے گئے۔ اگلے سال ایک ضمنی قانون منظور کیا گیا جس کے تحت ۱۹۵۱ء کے قانون مزارعت پر عملدرآمد سے پہلے زمینداروں کے نکالے ہوئے مزارعین کی بجالی مقصود تھی۔

۱۹۵۵ء تک ۵۷۱۲۱ ایکڑ زمین جو بڑے زمینداروں کے نام تھی ۲۶,۸۶۴ چھوٹے مالکوں کو دے دی گئی جو پہلے صرف قابض مزارعین دکھائے جاتے تھے۔ یہ انتقال بلا معاوضہ تھا کیونکہ مزارعین کا زمینداروں کو روایتی محصول حکومت کو واجب الادا مالیہ اور دیگر ٹیکسوں کی رقم تک محدود تھا۔

مزید ۱۸,۱۸۱ ایکڑ ۲ لاکھ سے زیادہ علیحدہ قابض مزارعین کو معاوضے کے بدلے بذریعہ دستاویز منتقل کر دیئے گئے جس میں کل تقسیم شدہ زمین کا قریباً پچھتر فیصدی حصہ مزارعین کو بطور ملکیت

مل گیا۔

قابض مزارعین جنہوں نے (الف) معاوضہ کی ادائیگی کی پابندی کے بغیر زمینیں (ب) معاوضہ کے بغیر زمینیں لیں اور (ج) اپنے زمینداروں کے ساتھ زمینیں تقسیم کیں (بعض حالتوں میں بلا معاوضہ اور بعض میں با معاوضہ) کے درمیان تمیز کرنا انتہائی مشکل ہے کیونکہ روایتی قانون کے تحت بہت سے مختلف قسموں کے مراعات اور مزارعتی حقوق تسلیم کئے جاتے تھے لیکن زمینی اصلاح کسی حالت میں بھی ضبطی نہیں تھی۔ بلا معاوضہ حالتوں میں زمیندار زمینوں سے منافع کا حق ہمیشہ سے یا دیر سے چھوڑ چکے تھے۔ بہت سی حالتوں میں زمیندار محض مالیہ دیتا تھا اسے قابض مزارعین سے وصول کرنے کے بعد جو کسی قبائلی یا سماجی مجبوری کی وجہ سے کسی وقت زمین کی رسمی ملکیت سے نا اہل قرار دیئے گئے تھے۔

۱۹۵۸ء کے اوائل تک زمینی اصلاحاتی پروگرام قریباً بند ہو گیا کیونکہ بڑے زمیندار مختصر المیعاد ری پبلکن پارٹی کے ذریعے دوبارہ سراٹھا چکے تھے جو مغربی پاکستان اسمبلی پر حاوی ہو گئی تھی۔ لیکن سیاسی حالات نے پھر پلٹا کھایا اور اکتوبر ۱۹۵۸ء میں شروع ہونے والے دور ایوبی نے قیوم کے شروع کردہ زمینی اصلاحاتی پروگرام کو نہایت عجلت اور احسن طریقے سے پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔

آپاشی :-

زیادہ اناج اُکاڑا ہم میں آپاشی کی سہولیات میں توسیع کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے لفٹ اور ٹریولر کے منصوبے پی ڈیوڈی نے تعمیر کئے ہیں جو موجودہ وسیع نظام انہار کی دیکھ بھال کا بھی ذمہ دار ہے۔ زیر تعمیر منصوبوں میں اہم ترین وار سک اور گرم گڑھی کی یکمیں ہیں۔

وار سک اس مقام پر واقع ہے جہاں دریائے کابل میدان پشاور میں داخل ہوتا ہے۔ اسے کولمبویلان کے تحت کینیڈین انجینئروں کی نگرانی میں تعمیر کیا جا رہا ہے۔ کافی توانائی پیدا کرنے کے علاوہ یہ ایک لاکھ ایکڑ سے زیادہ نئی زرعی زمین کو زیر کاشت لے آئے گا جب بند اور نہروں کا بڑا نظام مکمل ہو جائے گا۔ بنوں کے قریب گرم گڑھی منصوبہ ایک بہت بڑے ذخیرہ آب کو جمع کر کے گا جو مٹی سے بھرے ہوئے ڈیم کے عقب میں نرمائی سیلابوں کا شرہ ہوگا۔ یہ قریب تکمیل منصوبہ قریب دو لاکھ ایکڑ زرعی زمین کو سیراب کرے گا اور توانائی کی خاصی مقدار بھی مہیا کرے گا۔

صنعت :- ۱۹۴۷ء سے پہلے کے قریب ٹھیک زرعی علاقہ

میں بجلی کی فراہمی کی مسلسل توسیع کی وجہ سے مختلف انواع کی پھلکی صنعتوں کی ترقی کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ ۱۹۵۵ء میں کل انسٹالڈ صلاحیت ابھی تک ۵۰ ہزار کلو واٹ سے کم تھی لیکن یہ ۱۹۷۱ء سے پھر بھی نمایاں طور پر زیادہ تھی جب یہ بمشکل ۱۹ ہزار کلو واٹ سے کم تھی۔ اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ بجلی صوبے کے قریباً تمام حصوں میں دستیاب ہو چکی ہے۔ بجلی کی فراہمی وارسک ڈیم کے مکمل ہونے پر کافی بڑھ جائے گی کیونکہ اس سے قریباً دو لاکھ کلو واٹ کی توقع ہے، ۱۹۷۱ء میں صوبہ سرحد میں صرف دو اہم صنعتی پلانٹ تھے جو ۱۹۵۵ء تک تیس ہو گئے تھے جن میں شوگر ملیں، کائن اور وول ٹیکسٹائل ملیں، فروٹ کیننگ فیکٹریاں، ایک کیمیکل ورکس شیل ری روٹنگ ملیں، ایک فارما سوشیکل فیکٹری اور تانبہ کو پراسینگ پلانٹ شامل ہیں۔ گھڑیلو دستکاری جو پورے ایشیا میں ایک پسندیدہ ترقیاتی ہدف ہے اتنی تیزی سے ترقی نہیں کر سکی حالانکہ صوبے میں ۱۰ ہزار سے زیادہ کھڈیاں ہیں جس میں وادی کاغان کی ایک چھوٹی سی لیکن اعلیٰ معیار کی اونی صنعت بھی شامل ہے۔

تعلیم :-

۱۹۴۷ء سے اکثر سالانہ میزانیوں میں تعلیم کو سب سے بڑا حصہ ملتا رہا۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ اس پر ہر سال پولیس اور امن وامان کے اخراجات سے لاکھوں روپیہ زیادہ خرچ ہوتا رہا۔ ۵۶ - ۱۹۵۵ء کے بجٹ میں تعلیم کو قریباً بیس فیصدی دیا گیا۔ نتیجہ یہ کہ دس سو زیادہ سکول کھولے گئے ہیں اور ۱۹۴۷ء اور ۱۹۵۵ء کے درمیان سکولوں میں تعداد طلباء دو گنا ہو گئی۔ تعلیم چھٹی جماعت تک مفت کر دی گئی ہے۔ ہر ضلع میں نیا گورنمنٹ کالج کھولا گیا ہے اور پشاور ایبٹ آباد اور ڈیرہ اسماعیل خان کے تین زنانہ کالجوں میں توسیع کی گئی ہے۔ کل کالجوں کی تعداد طلباء ۱۹۴۷ء میں ۱۲۱۰ سے بڑھ کر ۱۹۵۵ء میں ۲۸۲۹ ہو گئی۔
غالباً عظیم ترین کارنامہ پشاور یونیورسٹی ہے جس کا بسیط کمپس پشاور سے درہ خیبر کی سڑک پر ایسا دہ ہے۔ یونیورسٹی وزیراعلیٰ

۱۔ سکول کالج اور یونیورسٹی عمارات کی تعمیر کے اخراجات بھی اس میں شامل ہیں جو بجٹ کی تقسیم میں سول ورکس کے تحت دکھائے جاتے ہیں۔ دیکھئے این

ڈبلیو ایف پی ایئر بک ۱۹۵۵ء ص ۵۹

۲۔ ایف ۷ ص ۶۲

قیوم کا من پسند منصوبہ تھی اور ۱۹۵۵ء میں اس کی بنیاد رکھی گئی۔
اکتوبر ۱۹۵۲ء تک ۲۰۰ طلباء کا ہوسٹل جو غالباً ایشیا میں بہترین
ساز و سامان کا مالک ہے ایک مرعوب کن انتظامی عمارت اور ایک
انجنیئرنگ کالج نے کام شروع کر دیا تھا۔ اس وقت سے قانون
سائنس، میڈیسن، زراعت، فارمسی، ٹیچر ٹریننگ اور آرٹس فیکلٹی
بھی جاری کی جا چکی ہیں۔

میڈیسن اور صحت عامہ:-

سرحدی علاقے میں کئی بہترین ہسپتال موجود ہیں لیکن ان
میں سے اکثر فوجی ہیں اور دیہی آبادی کے اہم طبی مسائل ایک
ویدک پر دگرم کے ذریعے حل کئے جاتے ہیں جس میں چھوٹی چھوٹی
مستقل اور متحرک ڈسپنسریاں، وزٹنگ نرسز اور دایاں اور
سفری ایکسپریس، ٹی بی اور ویکسی نیشن یونٹ شامل ہیں ۱۹۵۵ء
میں ڈسپنسریوں اور آبادی میں ۱:۲۰ کا تناسب تھا۔ یہ مغربی معیار
کے مطابق ناکافی تھی لیکن ایک دور افتادہ اور اقتصادی طور پر
بد حال علاقے میں یہ ایک خاصا کارنامہ ہے۔

نوزائیدگان کی بیماری اور اموات کے سوا موجود مسئلے
کے علاوہ علاقے میں صحت کے لئے بڑا خطرہ بلیریا ہے۔ یہ بیماری
آبپاشی کے علاقوں میں بہت عام ہے باوجودیکہ میچروں پر قابو پایا

کمراس بیخ کنی کی کوششیں کی گئیں ہیں بلیرے کی دبائے ضلع اور ایجنسی میں موجود ہے۔ گوکو ہاٹ ہانگوادی کے ایک آزمائشی علاقے میں جہاں مسئلہ ۱۹۶۹ء سے بھرپور سالانہ توجہ کے تحت ہے، اب نئے مریض نہیں آرہے۔

ٹائیفس بھی ایک بڑا مسئلہ ہے بالخصوص ان علاقوں میں جہاں سے خانہ بدوش اور اکثر جوں زوہ پوتندے اور ان کے جانور باقاعدگی سے گزرتے ہیں۔ نمونیا اور ٹی بی جو اکثر دبیشتریلیرا کی وجہ سے کاہیدہ قوت مزاحمت سے پیدا ہوتے ہیں صوبے میں قریباً ۲۵ فیصدی اموات کے ذمہ دار ہیں۔

قبائلی علاقہ پاکستان کے تحت :-

قبائلی علاقے کو پاکستان کے تحت بھی وہی خصوصی مقام حاصل رہا جو انگریزوں نے اسے دیا تھا۔ انگریزوں کے جانے کے بعد حکومت اور اہل کوہ کے درمیان ایک نئے تعلق کا ظہور ممکن ہوا۔ اگر پاکستان قبائلی پر زیادہ مہربان تھا تو قبائل بھی پاکستان

۱- یہ کوششیں ہنوز بے حد ناکافی ہیں ۵۶-۱۹۵۵ء میں انسداد بلیریا پروگرام کو صرف ۵۸۶،۹۱ روپے ملے۔ دیکھئے این ڈیو ایف پی ایئر بک

سے تعاون کرنے پر زیادہ مائل تھے۔ قبائلی علاقہ براہ راست مرکزی حکومت کے تحت رہا لیکن صوبہ سرحد کی حکومت پٹانوں کی حکومت ہونے کی وجہ سے قبائل پر اثر اندازی کا ایک اہم ذریعہ بن گئی۔ قبائلی علاقے میں پاکستان کا قومی قانون نافذ نہیں ہے۔ باشندے عام ٹیکس ادا نہیں کرتے گو وہ نمک جیسی اشیائے صرف پر بالواسطہ عوائد کے ماتحت ہیں تاہم قبائلی علاقہ پر حکومتی اخراجات مسلسل بڑھتے رہے ہیں۔ مثلاً ۱۹۵۲ء میں پورے پاکستان میں سول نظم و نسق پر کل خرچ ... ۱۹۵,۳۶۵ روپے تھا جس میں سے ... ۵,۸۲۶۵ روپے یعنی قریباً ایک تہائی صرف قبائلی علاقے پر خرچ ہوا۔ اس رقم کا بیشتر حصہ ان انتظامی اور فلاحی اداروں پر صرف ہوا جنہیں پاکستان روایتی برطانوی وظائف کی بجائے ایک نعم البدل کے طور پر قائم کر رہا ہے۔

۱۹۴۷ء میں قبائلی علاقے کا تعلیمی بجٹ ۱۷ ہزار روپے تھا اور کوئی ۵۰۰ بچے سکولوں میں تھے۔ ۱۹۵۵ء میں یہ بجٹ ۱۴ لاکھ روپے ہو گیا اور ۲۵ ہزار بچے سکولوں میں آ گئے۔ اس کے علاوہ صرف ۱۹۵۴ء میں اتالیس نئے سکول تعمیر کئے گئے جن

۱۔ بجٹ آف وی سنٹرل گورنمنٹ آف پاکستان فار وی ایر ۵۲ - ۱۹۵۱ء

(کراچی سنٹرل گورنمنٹ پریس ۱۹۵۲ء)

پر کُل لاگت ۴۵ لاکھ روپے آئی دسکولوں کی تعمیر کے اخراجات
تعلیمی بجٹ کی بجائے تعمیرات عامہ کے تحت کئے جاتے ہیں اور
صحت کے میدان میں ہر ایجنسی میں اس کا اپنا سرجن اور
کئی اسٹنٹ سرجن، ایک سکاؤٹ ہسپتال اور ایک متحرک
ڈپنسری ہوتے ہیں۔ ویکسی نیٹروں کے گروہ ساری قبائلی پٹی میں
پھرتے رہتے ہیں اور کبھی کبھار ایسے علاقوں میں بھی نکل جاتے ہیں
جہاں پولیٹیکل ایجنٹ بھی جانے سے کتراتا ہے کہ بدامنی نہ پیدا ہو۔
۱۹۵۲ء سے مرکزی حکومت نے گھریلو دستکاروں کو فروغ دینے
کی محدود سی کوشش کی ہے۔ کرم میں ریشم کی پیداوار اور ٹوکری
سازی کے سنٹر کھولے ہیں۔ مالکانڈ میں قالین بافی اور وانا جنوبی
وزیرستان میں ایک میٹل ورکنگ شاپ کھولی ہیں۔ ان تجربات
کا ابھی تک اقتصادی لحاظ سے علاقے پر کوئی مجموعی اثر نہیں
ہو سکا تاہم سینکڑوں قبائلیوں نے ایسے کاموں میں تربیت
حاصل کر لی ہے جو ان کی تعلیل آمدنیوں میں اضافہ کا موقع مہیا
کرتے ہیں۔

امن وامان :- لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ

امن دامن پر اخراجات مسلسل زیادہ ہی رہے ہیں ۱۹۵۲ء کے مرکزی بجٹ میں صرف ۲,۴۰,۰۰۰ روپے قبائلی وظائف کے لئے رکھے گئے تھے لیکن اصل خرچ اس سے کہیں زیادہ ہوا د بعد کے میزانیوں میں وظائف بالکل خدق کر دیئے گئے آج بھی سکاؤٹوں، فریئر کانسٹیبلز اور خاصہ داروں پر اخراجات قبائلی علاقہ پر مرکزی حکومت کے کل اخراجات کا غالباً نصف سے بھی زیادہ ہیں۔

ایک لٹاٹ سے قبائلی علاقے کے بعض حصوں پر سرکاری کنٹرول پاکستان کے تحت بڑھنے کی بجائے گھٹ گیا ہے۔ اس کی مثال وسطی وزیرستان میں واقع رزمک کی عظیم چھاؤنی ہے۔ چھاؤنی ترک کر دی گئی ہے۔ یہاں صرف کبھی کبھار ہی افسران جاتے ہیں اور وہ بھی مقامی ملوک کی دعوت پر۔ رزمک کو شمال میں میرانشاہ اور جنوب میں جنڈولہ (ٹانک وانا روڈ پر) سے ملانے والی سڑکیں اب کھلی نہیں ہیں۔ نتیجہ یہ کہ مسافر کو میرانشاہ (صدر مقام شمالی وزیرستان ایجنسی) جانے کے لئے تین چوتھائی راستہ بنوں اور ٹانک میں سے ایک دائرے کے گرد جانا پڑتا ہے۔ فقیر اپنی اپنی موت تک گورونخت میں ناقابلِ رسائی اور غیر اطمینان پذیر بنا رہا۔

ساتھ ہی ساتھ پشاور اور دیگر میدانی قصبوں کو ایسا امن چین نصیب ہوا ہے جو انگریزی دور میں عنفا تھا۔ ان میں سے بعض

اب بھی شام کو اپنے دروازے بند کرتے ہیں اور صبح کو ہی کھولتے ہیں
لیکن یہ محض ایک رسمی کارروائی ہے اور واحد پولیس کا سپاہی
عام طور پر آمادہ ہو جاتا ہے کہ وہ معقول طور پر معزز نما مسافر کو
دروازے کے اندر جانے دے۔ سرحدی واقعات پر اعداد و شمار
حاصل کرنا اب بھی مشکل ہے لیکن زیر انتظام ضلعوں پر قبائلی علاقے
سے چھپے قریباً اب قصہ پارینہ بن چکے ہیں۔ ”پنجتونسٹان“ ایچی ٹیشن
کے باوجود سرحد پار سے حملے بھی کم ہو گئے ہیں۔ یکم جنوری ۱۹۵۲ء
اور یکم اکتوبر ۱۹۵۳ء کے دوران صرف اکتیس روغما ہوئے۔
یہ انگریزی دور کے پُر امن ترین سال سے بھی بہت ہی کم ہیں۔

علاقائی انضمام۔

وزیر اعلیٰ قیوم نے انضمام کی پالیسی پر خوب زور سے عمل
کیا اور قبائلی علاقے کے بعض چھوٹے چھوٹے حصے صوبہ سرحد میں
ضمم ہو گئے۔ پیشتر اس کے کہ آخر الذکر کہ مغربی پاکستان میں شامل کیا
گیا۔ زیریں کوہ سیاہ کے قبائل جن کی تقریباً ۴۳ ہزار تھی
۱۹۵۲ء میں ضلع ہزارہ سے مل گئے۔ ریاست امب کا بھی بیشتر
حصہ تقریباً ۴۵ ہزار کی آبادی سے کوئی ۴۸ ہزار) قریباً

اسی وقت شامل کیا گیا۔ گدون قبائل دکل تعداد قریباً ۳۵ ہزار
جوسوات اور دریائے سندھ کے درمیان رہتے ہیں۔ ۱۹۵۳ء میں
ضلع مردان سے مل گئے۔ سندھی کوہستان کا کچھ حصہ جس میں کوئی ۱۰
لاکھ کی فحلو ط آبادی تھی جولائی ۱۹۵۴ء میں ہزارہ سے ملا دیا گیا۔
حکومت نے امن وامان کی ذمہ داری سنبھال لی ہے اور ضم شدہ
علاقے کے بعض فلاحی پروگرام بھی لے لئے ہیں لیکن ابھی تک کوئی
ٹیکس نہیں لگایا گیا کہ منتقلی آسان سے آسان رہے۔

مغربی پاکستان کے صوبہ ون یونٹ کے قیام سے کوئی انضمام
نہیں ہوا۔ یہ معنی خیر ہے کہ جتنے انضمام ہوئے وہ سب بیٹھان علاقے
کے مشرقی کناروں پر ہوئے جہاں قبائلی علاقہ ڈیورنڈ لائن کے علاقوں
کی نسبت کمزور ہے اور کوئی انضمام بین الاقوامی سرحد سے
متصل علاقوں میں نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ نسبتاً ترقی یافتہ علاقے
جیسے کرم اور ریاست سوات بھی اپنا خصوصی درجہ قائم رکھے
ہوئے ہیں۔ ان کا محل وقوع اتنا اہم ہے کہ مرکزی حکومت
ان پر اپنا براہ راست کنٹرول کا ملا چھوڑنے پر کبھی رضامند
نہیں ہو سکتی۔

تاہم جہاں تک قبائلی مسئلہ کم از کم اقتصادی ہے زیر انتظام
ضلعوں کے ساتھ انضمام اہل کوہ کے لئے بہت کشش رکھتا ہے۔
ان کی سرحدی لاریب ہے جبکہ زیر انتظام ضلعوں میں معیار زندگی

بلند تر ہے اور وہ پہاڑیوں کی نسبت آگے بڑھنے کے زیادہ مواقع پیش کرتے ہیں۔

انصاف کے طریقہ سے قطع نظر قباہیوں کی فطرت اور بیچ کر کا تقاضا ہے کہ یہ تدریجی ہونا چاہیئے۔ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۴ء تک قبائلی علاقوں کے نصف درجن دوروں کے دوران مصنف کو یہ یقین کرنے کا کوئی امکان نظر نہیں آیا کہ قباہیوں کی اکثریت اب بھی ایک بہت محدود اقتصادی فائدے کے لئے اپنی آزادی کو خیر باد کہنے پر رضا مند ہے۔

ایک واقعہ ایسا ہوا کہ ایک وزیر جرگہ نے پولیٹیکل ایجنٹ سے کہا کہ وہ ان کے گاؤں میں ایک سفری ڈسپنسری اور دیہی سکول کے لئے ایک استاد بھیج دے۔ افسر نے وعدہ کیا کہ اگر بجٹ میں گنجائش ہوئی تو وہ بھیج دے گا۔ جب ایک ملک سے پوچھا گیا کہ اس کا قبیلہ زیر انتظام ضلعوں میں کیوں شامل نہ ہوا جہاں اسے سکول اور ہسپتال خود بخود مل جاتے تو ملک نے زوردار منطقی انداز میں کہا: ”اس صورت میں ہم ہسپتال اور سکول لینے اور ان میں جانے پر مجبور ہوتے۔ اب ہم خود ہیں جو فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ ہمارے لئے مفید ہے یا نہیں۔“

سوات۔ ایک بے نظیر ریاست؟۔ قبائلی علاقے کو چھوڑنے

سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے غیر معمولی ترین منظر یعنی ریاست سوات پر چھپچھلتی سی نظر ڈال لیں۔ سوات سرحد کے سیاسی یا اقتصادی نظام میں اولین اہمیت کی حامل نہیں ہے، لیکن یہ دو وجوہات کی بناء پر دلچسپ ہے۔ اولاً یہ پاکستان و ہند کی ایک بے نظیر ریاست ہے اور وہ بھی چھوٹی سی جو نہ صرف باقی رہی ہے بلکہ بٹوارے کے بعد کے سالوں میں پھٹی چھوکی ہے۔ ثانیاً یہ اس بات کی منظر ہے کہ ایک پٹھان ریاست بے مثال قیادت کے تحت کیا بن سکتی ہے۔

سوات کی آبادی قریباً ۵ لاکھ ہے۔ زیریں وادی سوات میں یوسفزئی پٹھان آباد ہیں جو زیادہ تر کازئی سیکشن سے تعلق رکھتے ہیں۔ بالائی وادی اور سطوح مرتفع میں غیر پٹھان قبیلے آباد ہیں جن میں قابل ذکر توروا اور گھوڑوا ہیں۔ یہ ریاست اس صدی میں ایک قابل قدر انسان کی مساعی سے منظم ہوئی جس کا نام عبدالودود تھا۔ عبدالودود ۱۹۴۹ء میں اپنے بیٹے اور موجودہ حکمران جہانزیب کے حق میں دستبردار ہو گیا۔ والی جیسا کہ جہانزیب کہلاتا ہے بہت جڑ رسی اور کل بنی سے ریاست پر حکومت کرتا ہے۔ وہ ذاتی طور پر سیکوں کی مرمت اور سڑکوں کی دیکھ بھال کی نگہانی کرتا ہے اور ۱۲۵ سے زیادہ سکولوں و مشمولہ بہ ایک چار سالہ کالج کے لیل و

ہمار کو دیکھتا ہے جو ریاست میں برسر کار ہیں۔ گو حکومت کی باگ ڈور قریباً والی کے ہاتھوں میں ہے تاہم ۱۹۵۴ء سے ایک مجلس مشاورت بھی موجود ہے جس کے دس ممبر والی کے نامزد اور پندرہ منتخب ہوتے ہیں۔ ریاست کا نظم و نسق ایک بہترین نظام موصلات و حمل و نقل کے ذریعے چلایا جاتا ہے جس میں پندرہ سو میل لمبی ٹیلیفون لائن اور ۳۷۵ میل لمبی ہمہ موسمی سڑک شامل ہے۔

سرحد پاکستان کے ایک حصہ کی حیثیت :-

پٹھانوں کا اپنے نسلی تشخص کا شعور ظہور پاکستان کے بعد کم نہیں ہوا۔ انہوں نے مغربی پاکستان کے صوبہ ون یونٹ کے خلاف سخت ترین دشمن مہیا کئے ہیں جو بنگالیوں، سندھیوں اور بلوچوں کے ساتھ مل کر ”پنجابی غلبہ“ کے خلاف سیاسی محاذ بنانے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ چند پٹھان سیاسی رہنماؤں اور زیادہ تر سرکاری ملازمین نے ون یونٹ کو اس لئے قبول کر لیا ہے کہ یہ ایک انتظامی بہتری ہے اور مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان ایک مستحکم تر سیاسی توازن کے لئے مفید ہے لیکن بہت سے اسے شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

لیکن ون یونٹ پر معرکہ آرائی محض واضح ترین اظہار

ہے پٹھان کی اپنے علاقے سے گہری محبت کا جو روایتی طور پر پاکستان رہا ہے یعنی غیر محکوم لوگوں کی سرزمین یا مختلف الفاظ میں سرکش لوگوں کی سرزمین۔ اگر پٹھان قومیت جدید انداز میں ارتقاء پذیر نہیں ہو سکی تو پٹھان قیادت اور صوبائیت کسی اور گروہ کے ساتھ میل جول کو اور بھی قابل نفرت سمجھتی ہے چرچائیکہ اس کا غلبہ ہو۔

۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۳ء تک مصنف قبائلی ملک کے ساتھ سلسلہ ہائے کلام میں ہر ایک سے پوچھتا رہا ہے ”آپ کون ہیں؟ آپ کا لیڈر کون ہے؟ آپ کا علاقہ کونسا ہے؟“ تقریباً بلا استثنا جواباً کا ڈھب ایک ہی رہا۔ ”مسل نے اپنا نام بتایا، اپنا قبیلہ یا خیل بتایا اور اپنے خیل کے سرکردہ ملک کا نام بتایا دہشڑیکہ وہ اسے تسلیم کرتا تھا ان میں سے معدودے چند میں سیاسی شعور یا شاید مصلحت پسندی اتنی دخیل ہو گئی تھی کہ مقامی پولیٹیکل ایجنٹ کا نام بھی شامل کر لیا جاتا تھا لیکن سب کا خاتمہ کلام ایک ہی تھا۔

”پٹھان ہوں“

سوال کی عبارت کو بھی بدلنے کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ جب تک انہیں صاف طور پر نہ پوچھا گیا کہ وہ پاکستان، افغانستان اور بھارت کے متعلق کیا سوچتے تھے اس وقت تک انہوں نے قومی پیرائے میں جواب نہیں دیا۔ سب پاکستان کے لئے اپنی ترجیح کا

اظہار کرتے تھے لیکن پھر بھی یہ ظاہر تھا کہ وہ پاکستان کو اپنے آپ سے علیحدہ اور ممیز سمجھتے تھے۔

اس کے برعکس متعدد پٹھان سیاست کار ہٹاؤں نے اپنے آپ کو بہت کامیابی و جامعیت کے ساتھ قومی منظر میں جذب کر دیا ہے۔ خان عبدالقیوم خان نے ۱۹۵۳ء میں صوبہ سرحد سے جانے کے بعد ڈیڑھ سال مرکز کی کابینہ میں گزارا، وہاں اس نے نہ صرف زراعت اور اقتصادی امور کے میدانوں میں حسن کارکردگی کا ثبوت دیا بلکہ ستمبر ۱۹۵۵ء کی پارلیمنٹری بغاوت میں نمایاں حصہ لیا جو گورنر جنرل کے اختیارات کو کم کرنے میں عارضی طور پر کامیاب ہو گئی۔ ایک ماہ بعد گورنر جنرل نے منحرف وزراء پر جوابی وار کیا تو قیوم کابینہ سے نکل گیا اور کچھ عرصے کے لئے منظرِ سیاست سے دور ہو گیا۔ وہ ۱۹۵۸ء میں صدر مسلم لیگ کی حیثیت سے دوبارہ نمودار ہوا۔ اس حیثیت میں اس کی زوردار سرگرمیاں قریباً تمام کی تمام قومی اور بین الاقوامی مسائل پر مرکوز ہیں اور ان میں پٹھان صوبانیت کا شائبہ بھی نہ تھا۔

قیوم کا جانشین وزیر اعلیٰ عبدالرشید خان اس عہدے سے محروم ہوا جب صوبہ سرحد صوبہ مغربی پاکستان میں مدغم ہو گیا۔ لیکن رشید پولیس میں واپس نہیں آیا بلکہ مغربی پاکستان کی کابینہ میں رہا اور پھر صوبے کا وزیر اعلیٰ بن گیا۔ رشید صوبہ سرحد کے باقی پاکستان

سے تعلق کے مسئلہ میں الجھارہا۔ وہ پہلے پہلے ون یونٹ کا حامی تھا لیکن بعد میں اس کا مخالف ہو گیا اور جولائی ۱۹۵۵ء میں اس نے پُر زور وکالت کی کہ عبدالغفار خان سرحد واپس آکر اس منصوبے کے خلاف کام کرے۔ مغربی پاکستان کی سیاست میں حصہ لینے کے دوران اس نے مسلم لیگ کو خیر باد کہا اور نو ساختہ ری پبلکن پارٹی میں شامل ہو گیا۔

میاں جعفر شاہ شاید سرحدی سیاستدانوں میں سب سے زیادہ پُر کار اور سخت جان تھا۔ وہ قبل تقسیم کی کانگریس حکومت میں رہا، اور اس کے بعد رشید کے ساتھ۔ بعد ازاں وہ مرکزی کابینہ میں چلا گیا، جہاں اس نے سرحد میں اپنی گہری ذاتی جڑوں کو نظر انداز کر کے ہونے اپنی صلاحیتیں وزارت مواصلات کے لئے وقف کر دیں۔

ان میں سے کوئی بھی قومی منظر پر پٹھان صوبائیت کے علمبردار کی حیثیت سے نہیں آیا۔ یہ بات پٹھان جرنیلوں پر اور بھی زیادہ صادق آتی ہے جو پاکستان کی فوج کے جنرل طاغی میں کثیر العدد ہیں۔ ایسے ہی نسبتاً کم پٹھان سپر سول افسران نے پاکستان کے دونوں بازوؤں مشرقی اور مغربی میں نہایت گراں قدر اور غیر جانبدارانہ خدمات انجام دی ہیں۔

خان برادران یعنی ڈاکٹر خان صاحب رجبے ایک غیر مطمئن بے روزگار نے مئی ۱۹۵۸ء میں قتل کر دیا اور بادشاہ خان عبدالغفار خان ایک قدرے مختلف نقطہ نظر کے مظہر ہیں۔

خان صاحب بٹوارے کے پہلے نصف درجن سالوں کی گمنامی اور گوشہ نشینی کے بعد نئے صوبہ مغربی پاکستان کے پہلے وزیر اعلیٰ بنے۔ یہ کافی حد تک واضح ہے کہ انہیں اس منصب پر کیوں لایا گیا۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ وہ ایک مشہور و معروف پٹھان تھے جنکی نئی حکومت کی سربراہی 'پنجابی غلبہ' کی تردید تھی۔ دوسرے وہ ایک ایماندار مقبول عام اور محترم اصلاح پسند تھے۔

لیکن یہ کچھ زیادہ واضح نہیں کہ انہوں نے ایک ایسا منصب کیوں قبول کیا جو معززانہ ہونے کے باوجود قدیم خدائی خدمت گاروں کے مرکوز لافغان عزائم و مقاصد کے خلاف تھا۔ ممکن ہے ایک پرانا جنگی گھوڑا سیاسی معرکے کے لئے اٹھا ہوتا کہ گمنامی و بد اعتمادی کے دور کے بعد اپنی قدر و قیمت آشکار کرنے کے موقع سے فائدہ اٹھا سکے۔ شاید یہ بات بھی تھی کہ وہ دونوں بھائیوں میں سے زیادہ گنجائش پسند تھے۔ اور چاہتے تھے کہ خدائی خدمت گاروں کے سیاسی واقفان و اصلاحاتی تخیلات کو ایک بڑی ٹیج پر روشناس کرائیں۔

عبد الغفار خان کو قریباً چھ سال بعد ۱۹۵۴ء کے اوائل میں رہا کر دیا گیا۔ وہ فدا، اسی اپنی ان سیاسی سرگرمیوں میں دوبارہ مشغول ہو گئے جن سے انہیں زبردستی ہٹایا گیا تھا۔ انہوں نے مرکزی اسمبلی میں اپنی نشست پھر سے سنبھالی اور وہ حکومت کے زوردار ترین تقادوں میں شامل ہو گئے۔ انہیں سرحد و بلوچستان میں ایچیٹیشن

کی بناء پر دوبارہ مختصر عرصے کے لئے مقرر کیا گیا۔ وہ ون یونٹ منصوبہ کے سخت مخالف تھے۔ انہوں نے اپنے محبوب صوبہ کا ادغام باقی مغربی پاکستان میں روکنے کے لئے ہر ممکنہ طریقہ اختیار کیا۔ انہوں نے کبھی تسلیم نہیں کیا کہ وہ ایک آزاد ”پنجتستان“ کے حامی تھے لیکن وہ ہمیشہ اس پر بضد رہے کہ صوبہ سرحد کو لازماً کوئی خصوصی خود مختار درجہ ملنا چاہیے۔

خدائی خدمت گاروں پر پابندی برقرار رہی تنظیم کے سابقہ کٹر عناصر غفار خان سے وفادار رہے اور وہ زیر انتظام ضلعوں کے تقریری دوروں میں بڑے بڑے مجموعوں سے خطاب کرتے رہے۔ بالآخر ۱۹۵۷ء میں غفار خان پاکستان کے دوسرے حصوں کے غیر مطمئن لیڈروں سے ملے اور نیشنل عوامی پارٹی کی بنیاد رکھی گئی جس کا انتہا پسندانہ، صوبہ پیوستہ پلیٹ فارم بہت سی باتوں میں خدائی خدمت گاروں کی یاد دلاتا تھا۔ انہوں نے میانگ دہل اعلان کیا کہ وہ نہ صرف خارجہ پالیسی کے مسائل سے لا تعلق تھے بلکہ بیرون سرحد پاکستان میں ہونے والے واقعات سے بھی بے نیاز تھے۔ انہوں نے اس خصوصی درجے کی کبھی وضاحت نہیں کی جو وہ سرحد کے لئے چاہتے ہیں لیکن وہ بضد ہیں کہ موجودہ صورتحال کو لازماً ختم ہونا چاہیے اور اس پر گاندھی ہسٹ کے منظر ہیں۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں پاکستان میں جنرل ایوب خان کی نئی حکومت کے قیام کے بعد غفار خان کو

پھر گرفتار کر لیا گیا۔

عمومی طور پر ایوبی حکومت نے اپنے پیشروؤں سے کہیں زیادہ پیٹھانوں کو رشتہ پاکستان میں پروانے کی کوشش کی ہے۔ کسی وقت کی صوبہ سرحد کی حکومت اور مرکز کے اختیارات کا بیشتر حصہ لاہور میں مرکوز حکومت مغربی پاکستان کے ہاتھوں میں دے دیا گیا ہے، چھ زیر انتظام ضلعوں کی انتظامیہ بھی ایک دفعہ پھر رہنمائی کے لئے لاہور کی طرف دیکھنے لگی ہے۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ قبائلی علاقے پر حکومتی دباؤ بڑھ گیا ہے، کیونکہ صدر ایوب نے قبائلی بے چینی پیدا کرنے کی افغان کوششوں کے خلاف زوردار رد عمل کا مظاہرہ کیا ہے۔ کابل کی شہر پر اٹھے ہوئے مخالف لشکروں کو ۱۹۶۰ء کے موسم خزاں میں وفادار قبائل نے پاکستانی فوج کی مدد سے بذریعہ طاقت تتر بتر کر دیا۔ ایچی ٹیشن کے نتیجے میں نواب ویر کو معزول کر دیا گیا اور ریاست میں پہلی دفعہ باقاعدہ پاکستانی فوج اور انتظام کار متعین کر دیئے گئے ۱۹۶۱ء میں مزید اقدامات کئے گئے جن میں باجوڑی ایچی ٹیشن کے لیڈروں کے گھروں پر پاکستان ایئر فورس کی بمباری بھی شامل تھی۔

مستقبل :-

موجودہ پیچیدہ سیاسی صورتحال کے ساتھ ساتھ اس میں یہ اندازہ

لگانا مشکل ہے کہ مستقبل میں سرحد کا باقی پاکستان سے کیا تعلق ہوگا۔
لیکن ایک چیز ”پنجخونستان“ کے باوجود خاصی واضح ہے کہ سرحد کے
ایک آزاد سیاسی یونٹ بننے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کی
زیادہ گنجائش پسند قیادت نے پاکستان کو ایک ایسی سٹیج کے طور پر
قبول کر لیا ہے جس پر اس کی تقدیر کا فیصلہ ہوگا اور پہاڑی قبائل
جدید معنویت کی قومیت کو خاطر میں ہی نہیں لاتے۔

اگر متصل علاقوں میں کوئی بڑا انقلاب نہ آجائے تو یہ بھی
غیر غالب ہے کہ پہاڑی قبائل ایک دفعہ پھر نہ یہاں نظام ضلعوں کی
حکومت کے ساتھ ۲۸-۱۹۳۷ء کی طرح وسیع پیمانہ پر گمبھم گھٹا
ہو جائیں لیکن اس کے ساتھ ہی سرحد اپنا تشخص شاید ہی کبھی مکمل
طور پر نذر پاکستان کرے گا۔ اس سمت میں یہ زیادہ سے زیادہ ایک
قسم کا پاکستانی ٹیکساس پہنچائے گا۔

پہاڑی قبائل کا مسئلہ اس حقیقت سے اور پیچیدہ ہو جاتا ہے
کہ وہ نہ صرف پنجابیوں، سندھیوں اور بنگالیوں کی ایک قوم میں محض
پٹھان ہی نہیں ہیں بلکہ بیسویں صدی کی ایک جمہوریت میں قبائلی ہیں۔
انہوں نے آج تک اپنا یہ کردار ترک کرنے کا کوئی میلان ظاہر نہیں
کیا اور خود پاکستان بھی ان کو اس پر مجبور کرنے میں بے حد متاثر
ہے۔

اس وقت زیر عمل اقتصادی ترقیاتی منصوبے کچھ قبائلیوں

کو پہاڑیوں سے باہر کھینچ لیں گے لیکن پاکستان خود سنگین بنیادی
اقتصادی مسائل میں گھرا ہوا ہے، اور یہ قرین قیاس معلوم نہیں
ہوتا کہ کم از کم مستقبل قریب میں زیر انتظام علاقے آنا ترقی کر جائیں
کہ وہ سب اہل کوہ کو اپنے ہاں کھینچ لیں یا ان کے آنے کی صورت
میں انہیں سنبھال لیں۔

دو برس آٹھ اپنی پہاڑیوں میں مسرت ہیں اور ان کے پاس
اپنے عظیم نشان انسانی وسائل کے سوا کوئی اثاثہ نہیں۔ پاکستان اور
افغانستان دونوں ماضی میں اپنے اپنے قومی مفادات کی خاطر ان
انسانی وسائل کے لئے مقابلہ کرتے رہے ہیں اور وہ اب بھی ایسا ہی
کر رہے ہیں جیسا کہ اگلے باب سے ظاہر ہو گا۔ اس مسابقت نے
پہاڑی پٹھانوں کی دجھوٹی اور انہماک میں سب سے زیادہ رکاوٹ
ڈالی ہے۔

سرحد میں افغان دلچسپی

سرحد افغان دلچسپی کے دوسرے حصے ہیں۔ کابل کے حکمران ٹولہ کے نقطہ نظر سے دونوں بر محل اور جابر ہیں۔ اولاً سرحد ایک لحاظ سے افغانستان بے انفکاک ہے۔ ثانیاً پٹان قبائل ایک ایسی قوت ہیں جو ماضی کی طرح افغان کھومتیں بنا اور بگاڑ سکتے ہیں۔ دونوں عناصر بہت سے پٹانوں کے دماغوں میں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں اور تحریک ”پنجتوستان“ میں ممتاز ہیں۔ ”پنجتوستان“ پر بحث کرنے سے پہلے ان عوامل پر تبصرو ضروری ہے جنہوں نے اسے پیدا کیا ہے۔

افغانستان بے انفکاک :-

سرحد میں تاریخی اجتماع کا ایک خاکہ پہلے ہی پیش کیا جا چکا ہے لیکن سرحد پر افغان دعاوی کا اعادہ یہاں مفید رہے گا۔ اٹھارہویں اور نصف اول انیسویں صدی میں سرحد پر باغضل سیاسی حاکمیت

بے تحاشا بدلتی رہی ہے۔ لیکن افغان نقطہ نظر سے ایک خاما سلسلہ نقشہ کھینچا جاسکتا ہے ۱۷۳۹ء میں ایران کے افشار ترک بادشاہ نادر شاہ نے مغل شہنشاہ محمد شاہ کو مجبور کر دیا کہ وہ سلطنت دہلی کے سندھ پار علاقے اس کے حوالے کر دے۔ جب نادر کی محقر المیاد سلطنت ٹوٹ پھوٹ گئی تو اس کی فتوحات کا مشرقی حصہ ایک مقامی افغان، احمد شاہ ابدالی کے زیرِ نگیں آ گیا۔ احمد شاہ نے اپنا دار الحکومت قندھار میں قائم کیا۔ حکمران پٹھان قبیلے کو درانی کا نام دیا اور ایک ایسی سیاسی مملکت کی بنیاد رکھی جو آج تک قائم ہے اور اسی کا یا پلٹ سے گزری جیسے اور بہت سی ریاستیں گزری ہیں۔

احمد شاہ کے بیٹے اور جانشین، تیمور شاہ نے دار الحکومت کو کابل منتقل کیا تاکہ ایک دور دراز تک پھیلی ہوئی سلطنت کو بہتر طور پر قابو کر سکے جو ۱۷۴۲ء میں اس کی موت پر قریباً پورے موجودہ افغانستان کے علاوہ پشاور، لاہور، ملتان، سندھ، مغلطای بلوچستان، کشمیر اور خراسان پر محیط تھی۔ اگلے پچاس سالہ میں درانی سلطنت ٹوٹ پھوٹ گئی لیکن سندھ پار کے علاقے انیسویں صدی میں بھی اس کے قبضے میں رہے۔ پشاور پر سکھوں کے حملے ۱۸۱۸ء کے قریب شروع ہوئے لیکن ۱۸۳۴ء تک یہ شہر درانی قبضے میں رہا جب رنجیت سنگھ نے اس کا الحاق کر لیا۔

امیر دوست محمد نے بیس سال سے بھی کم سکھ حکومت کے دوران اس علاقے کی بازیابی کے لئے اپنی کوششیں کبھی ترک نہیں کیں۔ انگریزوں نے اپنے سکھ اتحادی کے خلاف افغان دغاوی کی کبھی حمایت نہیں کی لیکن بہت سے برطانوی افسروں نے انفرادی طور پر سندھو پار علاقوں میں افغان دہشت گردی کو جائز قرار دیا۔ ان میں ایگنڈر برنز، میکناٹن، جان لارنس اور لمسٹن شامل تھے۔

اصل میں پہلی جنگ افغان (۱۸۳۸ تا ۱۸۴۲ء) میں انگریز سکھ تعاون نے ان اتحادیوں کی فوجی برتری کو واضح طور پر قائم کر دیا۔ زیادہ تر انگریزوں کی بلاشبک و شبہ اور وسط ایشیا کے اس حصے میں دوست محمد کی بازیابی کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا جو وہ اس گمشدہ صوبے کو برسرِ شمشیر حاصل کرنے پر لگائے ہوئے تھا۔ لیکن ۱۸۴۹ء میں برطانوی قبضہ کے بعد اور دوسری جنگ افغان (۱۸۴۸ تا ۱۸۵۰ء) کے دوران اور اس کے بعد بھی افغان مسلسل انصاف کا مطالبہ کرتے رہے۔

۱۸۹۳ء میں ڈیونڈ معاہدہ تک افغان تان نے سرحد کے بیشتر حصوں پر اپنے دعوے رسمی طور پر ترک نہیں کئے۔ امیر عبدالرحمان کا یہ دعویٰ کہ اس نے مجبوراً تسلیم خم کیا کافی حد تک درست ہے لیکن یہ بھی یکساں طور پر صحیح ہے کہ سندھ پار علاقے پہلے نادر شاہ نے لئے اور پھر احمد شاہ نے محض بنو در شمشیر قبضہ لئے ۱۹۰۱ء

میں سندھ پار علاقے کو رسمی طور پر سیاسی شکل دے دی گئی جب لارڈ کرزن نے صوبہ سرحد اور اس سے پرے قبائلی علاقہ کی تخلیق کی۔

فریورنڈ معاہدہ میں امیر عبدالرحمان اور انگریزوں نے وعدہ کیا کہ وہ ڈیویڈنڈ لائن کے مطابق تقسیم کردہ ایک دوسرے کے علاقے میں "مداخلت کاری" نہیں کریں گے۔ وہ دونوں اس معاہدے کو "سرحد کے سلسلے میں تمام بڑے بڑے اختلافات رائے کا ایک مکمل اور تسلی بخش تصفیہ" سمجھتے تھے۔ عبدالرحمان کے بیٹے اور جانشین امیر حبیب اللہ نے ۱۹۰۵ء میں ایک اور معاہدے پر دستخط کئے کہ وہ ۱۸۹۳ء میں اس کے والد کی اختیار کردہ ذمہ داریوں کو پورا کرے گا۔

گودستخون کے تحت وہ سندھ پار علاقے دے چکے تھے اور ان میں عدم مداخلت کا وعدہ بھی کر چکے تھے تاہم افغان انگریزوں کی طرف سے سرحدی قبائل میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کی مسلسل کوشش کرتے رہے اور خفیہ سیاسی خط و کتابت کے ذریعے اس علاقے کا کم از کم کچھ حصہ واپس دینے پر اصرار کرتے رہے۔

اس کی کوئی دستاویزی شہادت موجود نہیں ہے لیکن افغانوں اور سرحد میں ایک خیال اب بھی موجود ہے کہ انگریزوں نے حبیب اللہ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ پہلی جنگ عالمگیر میں ہمدردانہ غیر جانبداری برتے تو قبائلی علاقہ اسے واپس کر دیا جائے گا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ

۱۹۱۹ء میں اسی لئے قتل کیا گیا کہ وہ اس معاہدے کو ہوانہ دے
اور اپنا معاوضہ نہ مانگے۔ ایسا معاہدہ بالخصوص اس کا آخری حصہ
مغربی دنیا کو خواہ کتنا ہی غیر اغلب معلوم ہو یہ پٹمان کے لئے ہرگز خلاف
معمول یا ناممکن نہیں ہے جو وسط ایشیائی سیاست کی ریشہ دوانیوں میں
جکڑا ہوا ہے۔ آیا اس میں کوئی حقیقت ہے یا نہیں بہر حال حبیب اللہ
کے رویے اور موت کی یہ توجہ اس توجہ سے زیادہ بعید از قیاس نہیں
ہے جو اس وقت انگریزوں نے کی تھی یعنی یہ کہ حبیب اللہ نے
اپنے والد سے انگریزوں کے ساتھ دوستانہ تعاون کی قدر و قیمت
اور دانشمندی کی آگاہی درشتی میں پائی تھی اور وہ دل و جان سے
ان کا مداح تھا اور اس کے بیٹے امان اللہ نے اس کے قتل کا منصوبہ
بنایا تاکہ وہ تخت پر قابض ہو سکے۔

۱۹۱۹ء میں امان اللہ نے جو تیسری جنگ افغان شروع
کی تو اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ سندھ یار علاقوں کو بازیاب کیا
جائے یا انہیں انگریزوں کے لئے غیر مستحکم بنا دیا جائے۔ اس میں بھی
کوئی شک نہیں کہ وہ اپنی حکومت کے خلاف داخلی مخالفت سے
آگاہ تھا اور وہ ایک جہاد کے ذریعے اسے منطف کرنا چاہتا
تھا اور یہ سرحدی قبائلی کے لئے بھی باعث کشش ہو گا۔ بہر کیف
اسے اپنا اصل مقصد تو حاصل نہ ہونے کا گواہ ۱۹۱۹ء کے
معاہدہ راولپنڈی کے تحت جنگ ختم ہو گئی اور امور خارجہ میں

افغانستان کی آزادی کو تسلیم کر لیا گیا لیکن امان اللہ نے ڈیورنڈ لائن کی قائم کردہ انڈو افغان سرحد کو بھی قبول کر لیا۔

۲۲ نومبر ۱۹۲۲ء کو معاہدہ کابل نے عارضی معاہدہ راولپنڈی

کی جگہ لی تو اس نے پہلی دستاویزات کے مشتملات کی تصدیق کر دی لیکن امان اللہ نے ایک شرط اس میں شامل کروادی کہ سرحد کے دونوں طرف قبائلی علاقے میں دونوں طاقتوں کو وہیچسی تھی۔ دفعہ ۲ کے تحت طرفین نے اپنی اپنی سرحدات کے قریب رہائش پذیر قبائل کے متعلق اپنے اپنے نیک عزائم سے باہمی طور پر مطمئن ہو کر فیصلہ کیا ہے کہ وہ مستقبل میں کسی بڑی فوجی کارروائی سے جو ان کے اپنے حلقے کے اندر رہنے والے قبائل میں قیام امن و امان کے لئے ضروری سمجھی جائے آغاز کارروائی سے قبل ایک دوسرے کو مطلع کریں گے۔^۱

امان اللہ نے ایک اور چیز بھی حاصل کر لی۔ یہ کابل میں برطانوی وزیر کے ایک نوٹ میں شامل تھی جو ۱۹۲۱ء کا معامدہ کرنے کے ضمن میں لکھا گیا۔ نوٹ کے ایک حصہ میں کہا گیا: ”چونکہ دونوں حکومتوں کے سرحدی قبائل کی حالت حکومت افغانستان کی دیچسی کا باعث ہے لہذا میں آپ کو مطلع کرتا ہوں کہ برطانوی حکومت تمام سرحدی قبائل کے لئے خیر سگالی کے جذبات رکھتی ہے اور ان سے فیاضانہ سلوک کا عزم رکھتی ہے بشرطیکہ وہ ہندوستان کے باشندوں

^۱ اردو دونوں دستاویزات کے متن ایچ سی، ایضاً، جلد ۳، ص ۲۳ تا ۲۴ پر ہیں۔

کے خلاف زیادتیوں سے احتراز کریں۔^۱

اشارتاً یہ بھی کہتے چلیں کہ سرحدی علاقے میں افغان مائیت کسی نہ کسی شکل میں آخر تک تسلیم کی جاتی رہی۔ پشین اور سی کے بلوچ ضلع، پاڑا چنار اور قتل کے درمیان دادئی کرم اور خود نیبر بھی ۱۸۷۹ء کے معاہدہ گندمک کے تحت انگریزوں کو دیئے گئے۔ کرم پر رسمی قبضہ ۱۸۹۲ء میں ہوا جب ڈیورنڈ معاہدہ کے مطابق سرحد کی عمومی صفائی پیشگی لازمی قرار دی گئی۔ پشین اور سی بھی ۱۸۸۷ء میں واقعاً انگریزی علاقہ قرار دیئے گئے۔ ڈیورنڈ معاہدہ کے مطابق تمام موجودہ قبائلی ایجنسیاں افغانستان سے علیحدہ کر دی گئیں لیکن صرف کرم کو ہی رسمی طور پر انگریزی علاقہ قرار دیا گیا۔

جہاں تک سرحدی قبائل کی فزائی سرگرمیوں کا تعلق ہے ڈیورنڈ لائن کا اثر قبائلی علاقے اور صوبہ سرحد کے درمیان انتظامی سرحد سے بھی کم محدود کت رہا۔ قبائلی علاقے میں انگریزی کی بجائے افغان کرنسی زیادہ چالور ہی (یہ آج بھی ایجنسیوں کے اکثر حصوں میں رائج ہے)۔ اس میں بھی شک نہیں کہ سماجی و ثقافتی میدانوں میں قبائل، ۱۹۴۰ء تک وہلی کی بجائے کابل سے زیادہ قریب رہے گو دینے ترا ققادی اور ۱۹۳۰ء کے بعد سیاسی میدانوں میں ان کا

^۱ ایچی سن، ایضاً جلد ۱۳ ص ۲۳ تا ۲۴

رنج برطانوی ہند کی طرف زیادہ رہا۔

نام نہاد برطانوی مقبوضہ قبائل میں افغان دہچسپی اور ان کے ساتھ رابطہ ۱۹۴۱ء تک قائم رہا۔ گو بنہ ور شمشیر اس علاقے کو انگریزوں سے لینے کی امید تیسری جنگ افغان کے بعد نہ رہی تاہم انگریزوں کے چلے جانے کے بعد اس پر دوبارہ قبضہ کرنے کا خیال افغان ذہنوں میں ضرور موجود رہا جب کبھی آزادی ہند کا امکان زیر بحث آیا۔ ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء کی گول میز کانفرنسوں کے دوران افغانستان نے لندن کو مطلع کیا کہ سندھ پارکے علاقوں کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لئے اسے بھی لازمًا شریک ہونا چاہیئے۔ ایسے شواہد بھی موجود ہیں کہ یہ خیال ۱۹۴۲ء میں کرپس مشن کے دوران اور خاتمہ جنگ پر بھی دہرایا اور پھرایا گیا۔

تاہم کابل ہندوستان کی آزادی اور تقسیم کے متعلق برطانوی منصوبوں کی عجلت و فوریت پر سراپیمہ رہ گیا۔ ۳۰ مئی ۱۹۴۱ء کو ظاہر شاہ نے کابل میں قومی اسمبلی کو بتایا کہ افغانستان یونائیٹڈ کنگڈم اور ہندوستان میں اس کے جانشینوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھنے کا خواہاں تھا اور مزید کہا کہ ”ہندوستان میں سیاسی تبدیلیاں شاید ہی تعلقات پر اثر انداز ہوں“ اس نے سوویت یونین کے ساتھ حالیہ

۱۔ بی۔ شیلہ اور ”کننگٹ بی اوڈ وی انڈس“ وی نیشن، جولائی ۱۶، ۱۹۴۹ء

سرحدی نظر ثانی کا ذکر تو کیا لیکن ڈیوڈنڈ لائن کا حوالہ تک نہ دیا^۱
 لیکن ایک ماہ بعد افغان وزیراعظم، ہاشم خان نے دورہ ہمسایہ
 کے دوران اعلان کیا کہ انگریزوں کو مطلع کر دیا گیا تھا کہ افغانستان سمندر
 تک راستہ چاہتا تھا۔ اس کے مزید کہا کہ افغانستان صوبہ سرحد کے
 ریفرنڈم کو منظور نہیں کرتا تھا جو باشندگان کو صرف ہندوستان اور
 پاکستان کے درمیان انتخاب کا حق دیتا تھا نیز یہ کہ افغانستان کو ریفرنڈم
 میں اپنا نامزدہ بھیجنے کا حق حاصل تھا۔ عین اسی وقت پونائیں افغان
 باشندوں کے ایک گروہ نے اپنے آپ کو ایک آزاد پختونستان^۲ سے
 منسوب کیا^۳

قریباً اسی وقت غفار خان اور اس کے خدائی خدمت گاروں
 نے اپنی سیاسی زندگیوں کے لئے لڑتے ہوئے صوبہ سرحد میں بھی ایسی
 ہی آواز اٹھائی (دیکھئے باب دہم) کوئی ایسی شہادت موجود نہیں
 کہ دونوں مطالبے کابل اور غفار خان کے درمیان پیشگی ساز باز کا
 نتیجہ تھے لیکن ہندوستان کی آزادی و تقسیم کا منصوبہ جو جولائی
 کے مطابق آگے بڑھاؤں دوں یہ دونوں تحریکات ناگنہیر طور پر
 ایک دوسرے سے قدرے ہم آہنگ ہو گئیں خواہ ان کے محرکات
 کتنے بھی مختلف کیوں نہ تھے جب تقسیم کے سالوں کے بعد کابل

۱۔ ٹائمز لندن ۲۱ مئی ۱۹۴۷ء

۲۔ ٹیمپل نیوز ۲۲ جون ۱۹۴۷ء

نے ایک آزاد ”پنجتستان“ کے لئے زیادہ سے زیادہ سرکاری حمایت کی تو اس نے اپنے بھی دعوائی بازربانی بھی اس کے ماتحت کر دیئے۔
افغان احساسات کی شدت کا مظاہرہ ستمبر ۱۹۴۷ء میں ہوا جب کابل نے اقوام متحدہ میں پاکستان کی شمولیت کے خلاف واحد مخالفانہ ووٹ دیا۔ یہ اس بناء پر کیا گیا کہ افغانستان صوبہ سرحد کو اس وقت تک پاکستان کا حصہ تسلیم نہ کرے گا جب تک اس علاقے کے لوگوں کو آزادی کے انتخاب کا موقع نہ دیا جائے اس اقدام سے کابل نے یہ واشگاف کر دیا کہ وہ مسئلہ سرحد کا حل اپنے نئے ہمسائے کے ساتھ تعاون کے ذریعے تلاش نہیں کرے گا۔

اس طرح مسئلہ ”پنجتستان“ پیدا ہوا۔ کابل کے بے بچک رویے کے عقب میں ایک ایسا سلسلہ استدلال موجود تھا جسے جنرل ایشیا کے باہر تو کوئی عمومی وقعت نہیں ملی لیکن ہندوستان اور افغانستان میں اسے ہرگز خارج از امکان قرار نہیں دیا گیا۔ یہ استدلال ان شکوک پر مرکوز تھا جو پاکستان کی ”بقائیت“ کے متعلق تھے۔ نئی قوم کی شکست و ریخت کی صورت میں کسی نہ کسی صورت میں ”پنجتستان“ کے ظہور کے امکانات قوی تھے۔ یہ قرین قیاس تھا کہ ایسی ریاست فوراً ہی افغانستان میں شامل ہو جائے گی۔ بالخصوص ہندوستان کی حمایت کی بناء پر جو شرق سندھ کے علاقے لے جائے گا۔ گو یہ شکست و ریخت تو نہیں ہوئی تاہم ”پنجتستان“ کے لئے افغان جوش و خروش پاکستان

کے استحکام کے مدد و جدر کے ساتھ بڑھتا اور گھٹتا رہا ہے۔ اب بھی
”پنجونستان“ افغانوں کے احساسات بازربانی کا مفید ترین اور علیٰ اسلحہ
خانہ ہے۔ مزید برآں یہ باہمی تعلقات کے پورے دائرے میں کابل پر
پاکستانی دباؤ کا موثر ٹوٹ بھی ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے
کسی حد تک سرحدی قبائل کے اندرون افغانستان عزائم کو ایک
دوسری سمت میں منتقل کر دیا ہے۔

طاقت کے مراکز۔

سرحدی قبائل نے افغانستان کے حکمرانوں کے سلسلے میں ہمیشہ ایک
فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں تخت کے
لئے جو براہِ رائے کشمکش ہوئی قبائل نے یکے بعد دیگرے امیروں کو بنایا
اور ہٹایا۔ انہوں نے شاہ شجاع کو قبول نہ کر کے پہلی جنگِ افغان
کے بعد انگلیزیوں کے لئے اسے تخت پر رکھنا ناممکن بنا دیا۔ شیر علی
(۱۸۷۰ء تا ۱۸۷۴ء) اور یعقوب خان (۱۸۷۹ء تا ۱۸۸۰ء)
دونوں اپنی حکومت قائم رکھنے میں قبائل کی حمایت پر منحصر رہے۔
صرف عظیم عبدالرحمان (۱۸۸۰ء تا ۱۹۰۱ء) اپنا تخت کھوئے بغیر
قبائل بناؤں کو دبانے میں کامیاب ہو سکا۔

امان اللہ کا اخراج !

قبائلی طاقت کا نقش امان اللہ کے اخراج میں پُر زور ترین طریقے سے بیٹھا۔ امان اللہ کے خلاف بغاوت کے بیج اس کے انقلابی اصلاحاتی پروگرام کی قبائلی مخالفت میں موجود تھے جس کے ذریعے وہ اذیتاں کو ایسے ہی جدید بنانا چاہتا تھا جیسے اتاترک نے ترکی کو بنایا تھا۔

امان اللہ ابن حبیب اللہ ۱۹۱۹ء میں تخت نشین ہوا۔ فوراً ہی بعد اس نے انگریزوں کے خلاف تیسری جنگ لڑی، برطانوی سرحد پر شمالی قبائل کی بغاوت جس پر امان اللہ کے جرنیل نادر خان کے وادی کرم پر قبضہ کے تسلسل کا انحصار تھا خلاف توقع ہرگز رونما نہ ہوئی۔ قبائل امان اللہ کے دور کے ابتدائی سالوں میں ایک زبردست لیکن غیر یقینی عامل بنے رہے ۱۹۲۲ء میں وہ اپنے اصلاحاتی پروگرام میں سے بڑی بڑی رعایتیں دے کر ہی ایک بغاوت کا سامنا کر سکا جس میں ایک وقت قریباً تمام غلترئی شامل ہو گئے تھے۔

کمزوری کے اس مظاہرے کی یاد تازہ رہی اور بعد میں اس کے زوال کا اہم سبب بن گئی نومبر ۱۹۲۸ء میں شمالی قبائل ٹوٹ پڑے۔ شبنواری اٹھے اور جلال آباد پر قابض ہو گئے۔ مہمند بھی

لوٹ کا حصہ لینے کے لئے ٹیک پڑے۔ خوست کے ارد گرد گرجا جی اور زدران باغی ہو گئے۔ امان اللہ کے مسائل اور بھی بڑھ گئے جب ایک تاجیک ڈاکو، حبیب اللہ المعروف بہ بیچہ سقہ اپنے گروہ کے ساتھ شمال میں غودا رہا ہوا۔

امان اللہ کو چشم زدن میں تخت و تاج سے محروم کر دیا گیا۔ بیچہ سقہ تھوڑے عرصہ کے لئے تخت پر بیٹھا حتیٰ کہ نومبر بعد اس نے اپنا تخت اور زندگی دونوں نادر خان کے حوالے کئے جس کی حمایت جنوبی پٹان قبائل بالخصوص سرحد کی ہندوستانی طرف کے وزیر اور محسود کر رہے تھے اس کے بدلے نادر خان نے وحشیانہ قبائل کو اپنا دارا حکومت لوٹنے کی اجازت دے دی۔ چند سالوں کے اندر اندر یہی وزیر اور محسود نادر شاہ کی مخالفت پر اتر آئے تھے اور بزدل کہہ رہے تھے کہ انہوں نے اس کی حمایت صرف اس لئے کی تھی کہ وہ امان اللہ کو بحال کرے گا جو بیچہ سقہ کے مقابلے پر فرار ہو گیا تھا۔

۱۹۳۳ء میں حکومت ہند کے احکامات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے وزیروں اور محسودوں نے دوبارہ ڈیونڈ لائن کو عبور کر لیا اور صوبہ خوست کے دارا حکومت متوں کا معاہدہ کر لیا۔ انہیں نادر شاہ کے بھائی، ہاشم خان نے افغان حکومت کی تمام افواج کی کمان کرتے ہوئے بمشکل ایک لڑائی میں پسپا کیا۔

نادر شاہ کے نورائیدہ خاندان کے لئے دیگر قبائلی مخالفتوں کی بھی کمی نہ تھی۔ جنوب میں ”ملائے ٹنگ“ اور ”نئے نی“ کا فیض دیوانہ“ کابل کی حکومت کو تسلیم نہ کرتے تھے۔ فرغانہ کی سویت ریاست کا ایک با سماجی مخالف، ابراہیم بیگ سیخوں پار کر آیا اور روسی اس کے تعاقب میں افغانستان میں بہت اندر تک آگئے۔ بچہ سقمہ مرحوم کے پیروؤں نے کابل کے قریباً مضافات میں بغاوت کر دی تو نادر شاہ کو ایک دفعہ پھر پٹھان قبائلی حمایت کے لئے بلانا پڑا۔ اس دفعہ وہ ان کو کابل کو لوٹے بغیر واپس بھیجنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ خطرات ابھی ختم ہوئے ہی تھے کہ ایک اور خطرہ نمودار ہوا۔ امان اللہ کا ایک منظور نظر اور شاہی خاندان کے دیرینہ دشمن زبردست چرنخی خاندان کا سربراہ غلام نبی جلا وطنی سے واپس آیا اپنے پرانے گناہوں سے تائب ہوا اور نادر شاہ کی خدمت پر مامور ہوا۔ جنوب میں ایک قبائلی بغاوت کا پیرا احتیاط منصوبہ بنا کر وہ کابل میں نمودار ہوا تاکہ کسی مناسب وقت پر نادر شاہ کو اکھڑ دے۔ اس کے عزائم کا پتہ چل گیا اور ۸ نومبر ۱۹۳۲ء کو روایتی افغان انداز میں توپ زور کر دیا گیا، لیکن اس کی سزائے موت نے اپنے تمام تر جواز کے باوجود ان قبائل کی نفرت کو بڑھا دیا جو خاندان کے لئے اس کی حمایت کر رہے تھے۔

۱۹۳۴ء میں کابل نے ایک غلزلے بغاوت کو آسانی سے

دبا دیا، لیکن ۱۹۳۸ء کے موسم بہار میں ایک نیا خطرہ منڈلایا۔ ایک شامی مہم آڑما، سعید اگلیلانی المعروف بہ شامی پیر وزیرستان میں آدھمکا۔ وہ امان اللہ کے اصلاحاتی پروگرام کے رہنماؤں، طرزی خاندان کا ایک رشتہ دار بنایا جاتا تھا جس سے اس کی ملکہ شریا بھی تعلق رکھتی تھی۔ شامی پیر نے محمود علاقے کے وسط میں واقع کئی گورم سے امان اللہ کی بحالی کے لئے اعلانِ جہاد کیا۔ وزیر اور محمود احتراماً اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک بڑا لشکر سرحد کی طرف روانہ ہوا حالانکہ ان کے لئے مقامی تفریح بکثرت موجود تھی جو فیکراپی اور ایک برطانوی مہم پر مرکوز تھی۔

۱۹۲۹ء کے فرار کا اعادہ نہ ہونے دیا گیا۔ دیوانہ وار اور پُر زور احتجاجات کے بعد انڈین پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ نے یورپ کے جنگ کے امنڈتے ہوئے بادلوں کے پیش نظر شامی پیر کو بلطائف الحیل پکڑ لیا اور اسے ۲۰ ہزار پونڈ کے برابر سونے کے ساتھ اس کی جلبِ توجہ کے لئے ایک ہوائی جہاز میں بٹھایا اور واپس دمشق اتار دیا۔ یہ سبق حکومتِ کابل کو سمجھ لے نہیں۔ جو کچھ ۲۰ ہزار پونڈ روک سکتے تھے اتنے ہی یا ان سے بھی کم شروع بھی کر سکتے تھے۔ افغان و ظائف بٹھان قبائل کے لئے بالخصوص جو ڈیورنڈ لائن کی برطانوی طرف بڑھا دیئے گئے۔ دربارِ کابل میں حاضر ہونے والے ملوک کو کھلے دل سے خلعتیں تقسیم کی گئیں۔

کشمیر کے جہاد میں وسیع پیمانے پر شمولیت دیکھئے باب دہم)
 نے حکومت کابل کو ایک دفعہ پھر یاد دہانی کرائی کہ افغان قبائلیوں
 پر اس کا کوئی قابو نہ تھا۔ ”پختونستان“ کے لئے ہندوستانی حمایت افغانستان
 سے کوئی معاوضہ چاہتی تھی اور کابل نے ہر ممکن طریقے سے جہاد کشمیر
 کی مخالفت کے ذریعے اسے ادا کرنے کی کوشش کی۔ حکومتی احکامات
 کے تحت قوم کی سرکاری مذہبی کونسل، جماعت علمائے قبائلی نقل و
 حرکت کی مذمت کی اور اسے جہاد کا درجہ دینے سے انکار کر دیا۔
 لیکن جماعت قریباً سراسر نوجوان، سرکاری تربیت یافتہ
 علماء پر مشتمل تھی اور اصل مذہبی اثر و رسوخ کہیں اور تھا! افغانستان
 میں مذہبی و سیاسی جوڑ توڑ کے بزرگ محترم، مرحوم و مغفور ملا صاحب
 شوربازار نے واضح کر دیا کہ وہ سرکاری نقطہ نظر کے حامی نہ تھے۔
 قدیم مکتب کے ایک محترم و محترم ملا نور شاہ نے جہاد کے خلاف
 جماعت کے فتوے کی کھلم کھلا تردید کی اور افغانستان کے
 مسلمانوں کو اس میں شامل ہونے کی تلقین کی۔

افغان قبائلی کسی قسم کی سیاسی یا مذہبی رہنمائی کے بغیر
 ہی اپنے ذہنوں کو خوب سمجھتے تھے۔ وہ کثیر تعداد میں افغانستان
 گئے۔ حکومت پاکستان قبائلی حملے کو روک سکتی تھی یا نہیں، یہ ایک
 متنازعہ فیہ مسئلہ ہے۔ لیکن یہ صاف ظاہر ہے کہ افغان حکومت سب
 سے بڑے اور بااختیار مذہبی ادارے کے فتوے اور زیادہ سے

477
زیادہ سرکاری دباؤ کے باوجود ایسا نہ کر سکی اور وہ اپنے شہرلوں کو
بھی شرکت سے روکنے میں ناکام ہو گئی۔

پنجتوتان

ایک آزاد پٹھان ریاست کا افغان تصور عید انفار خان کے
تصور سے کہیں زیادہ جامع اور ہمہ گیر ہے۔ گو کابل کے پنجتوتانی علمبردار
کبھی کبھار کہتے ہیں کہ وہ پرانے صوبہ سرحد اور قبائلی علاقے پر مشتمل
رقبے پر ہی قانع ہو جائیں گے تاہم ریاست کی جو اکثر و بیشتر تشریح
کی جاتی ہے اس میں سے بلوچستان، قلات اور بسیلہ، مکران اور خاران
کی جنوبی بلوچ ریاستیں بھی شامل بتائی جاتی ہیں۔ یہ سب مل ملا کر
مغربی پاکستان کے کل علاقے کے نصف سے کچھ ہی کم رقبہ بنتا ہے۔
ایسی ریاست کی ”پنجتوتیت“ مشکوک ہے۔ شرق سندھ کے
ضلع ہزارہ میں پشتو بولنے والے بہت کم ہیں۔ یہی حال ریاست چترال
کا ہے۔ بلوچستان بلوچ ریاستوں اور ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کے نچلے
حصے میں صرف پٹھان اقلیتیں موجود ہیں۔ افغان پنجتوتیت میں ساحل
مکران پر واقع گوادرن کا نقطہ زمہین و محصور بھی شامل تھا جو ۱۹۵۸ء
تک مسقط و عمان کے سلطان کے تحت تھا۔ اس میں ملوٹ بن الاقوامی
مسئلے کو درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔

سب سے دیکھنی بات یہ ہے کہ ایک ایسی ریاست میں جو

اپنا وجود ہی نسلی، لسانی اور ثقافتی تنوع کی بنیاد پر رکھتی ہو کابل کے
”پنجتوستان“ میں ڈیورنڈ لائن کے مغرب یعنی افغانستان میں رہنے والے
پانچ ملین یا اس سے بھی زیادہ پٹھان شامل نہیں ہیں۔

۱۹۴۸ء سے مجوزہ ریاست کی طرف سے پرائیگنڈا کی ایک قحط
اور شدید ہم بیرونی دنیا میں چلائی گئی ہے اور اس کے اہم ذرائع افغان
سیاسی عملے اور ادارے رہے ہیں۔ کتابیں شائع کی گئی ہیں۔ نقشے
چھاپے گئے ہیں اور ”پنجتوستان“ کے شہری، نجی بین الاقوامی مصلحتوں
میں شریک ہوئے ہیں۔ ریڈیو کابل نے قبائل کو متاثر کرنے کے لئے
نشریات کا زیادہ وقت ”پنجتوستان“ کی واقعاتی خبروں اور پشتو میں
پاکستان کے خلاف مواد کو دیا ہے۔ یہ بوچھاڑ ۵۹ - ۵۶ء کے دور
میں کافی حد تک کم ہو گئی جب کابل اور کراچی بتدریج ایک مصالحت
کی طرف بڑھ رہے تھے۔ لیکن ۶۱ - ۶۰ء میں یہ پھر تیز ہو گئی،
جب تعلقات ایک دفعہ پھر بگڑنے لگے۔

شروع شروع میں پاکستانی افسر ”پنجتوستان“ کی تحریک سے
انکار کرتے رہے اور اس کے محرکات کی مذمت کرتے رہے۔ جنوری
۱۹۵۰ء میں وزیراعظم لیاقت علی خان نے کہا کہ ”ایک نام ہنا و آزاد
پنجتوستان“ کا مطالبہ ”افغانستان میں چند افراد کے ذہنوں کا ایک
شوہ ہے“ بعد ازاں پاکستان نے اس پوری ایجنسی کو ایک برکات

ایم ڈی بیسٹ آف دی کانسلٹی ٹیوٹ اسمبلی آف پاکستان، کراچی ۹ جنوری ۱۹۵۰ء

افغان واہمہ کہہ کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی جو حسد، نفرت اور ہندوستانی اور شاید روسی بل بوتے کی بناء پر پیدا ہوا ہے۔ کراچی اس کے حل کے لئے جو تجاویز دیتا تھا وہ "نخوت اسلامی" اور "مسلمانوں کے استحکام" کی چیر زور اور دل خوش کن اپیلیں ہوتی تھیں۔ عام طور پر کراچی افغان افسروں کے ساتھ "پنجتوستان" پر بات کرنے سے انکار کرتا رہا ہے۔ گو اس مسئلے کے وجود کا ایک بالواسطہ اعتراف ایک کمیونیک میں شامل تھا جو وزیراعظم داؤد کے دورے کے بعد ۱۹۵۷ء میں کراچی میں جاری کیا گیا ۶۱-۱۹۶۰ء میں صدر ایوب نے ایک سخت پالیسی اختیار کی جس کے تحت افغانوں کو یہ باور کرانا مقصود تھا کہ انہیں اپنے اس مطالبہ کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑے گی۔ اگر وہ اسی پراڑے رہے۔ اب تک اس کا نتیجہ پراپیگنڈا اور قبائلی ہل چل کی شدت کی صورت میں ہی نکلا ہے۔

پنجتوستان کا کوئی بامعنی بیان آسان نہیں ہے۔ اس کا بیشتر حصہ صورت تو ہے لیکن ہیٹلر سے محروم اور صورت بھی وفاقاً بدلتی رہی ہے۔ اس کٹ کے اندر اتصال پذیر ہی کی مقدار کا صرف اندازہ ہی لگایا جاسکتا ہے۔ تاہم بعض اہم عوامل اس سے منسلک ہیں۔ کابل کے مطابق "پنجتوستان" کی حکمران جماعت ایک صدر جس کے تحت سٹی سربراہان محکمہ جات ہیں اور ایک نیشنل

اسمبلی پر مشتمل ہے۔ ۱۰ اسمبلی جنوبی، وسطی اور شمالی حصوں میں تقسیم ہے۔ ساہا سال تک فقیر اپنی اسکا صدر رہا۔ اس کے محکمہ سربراہ بھی اسی کے ساتھ گورونخت کے چٹانی غاروں میں رہتے تھے۔ یہیں خوراک اور اسلحہ کے ذخائر تھے اور ایک چھوٹا سا پشت پر بٹنگ پیرس تھا جو ایک ماہنامہ چھاپتا تھا، لیکن اصل میں اس کا حکم ۵۰۰ مربع میل سے بھی کم پر چلتا تھا۔

۱۹۵۴ء کے محکمہ سربراہوں میں قابل ذکر محمد ظاہر شاہ اور رمفانی تھے۔ ان میں سے اول الذکر داخلی امور کی سربراہی کی بے حوصلہ حیثیت پر فائز تھا، اور آخر الذکر نشر و اشاعت کا سربراہ اور کبھی کبھار قومی اسمبلی کے وسطی حصہ کا بھی صدر ہوتا تھا۔

قومی اسمبلی جسے قبائلی کبھی کبھار لوئے جرگہ کہتے تھے ہر بڑے پہاڑی قبیلہ سے ایک دو ممبران اور پاکستان کے زیر انتظام ضلعوں میں سے چند افراد پر مشتمل تھی۔ اس کا جنوبی حصہ گورونخت وسطی حصہ تیراہ اور شمالی حصہ دریائے کابل کے اوپر مہمند علاقے میں مرکوز ہے۔ اجلاس شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں اور کسی قسم کا کاروبار شاید ہی ہوتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ”پنجتوستان“ کی پوری حکومتی تنظیم ”عملی کی بجائے نظری طور پر ہی موجود ہے اور نظری طور پر بھی اثر یہ آئیں بائیں شائیں ہی ہے۔

”پنجتوستان“ کے لیڈر پاکستان کے جلاوطن کردہ ہیں۔ ان میں

سے اکثر اپنا بیشتر وقت کابل میں گزارتے ہیں جہاں وہ ”کبائیل“ یعنی افغان وزارت قبائلی امور کی ذمہ داری ہوتے ہیں۔ جب وہ اپنے علاقوں میں ہوتے ہیں تو مقامی افغان افسران کی حمایت و کفالت کرتے ہیں۔ اکثر ”پنجتوستانی“ لیڈر اپنے اپنے قبائل میں خاصی شہرت کے مالک ہیں لیکن ڈیورنڈ لائن کی پاکستانی طرف ان کے اثر و رسوخ کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

۱۹۵۴ء میں ”پنجتوستانی“ ملک میں کوئی خیل آفریدیوں کا سابقہ سرکردہ ملک ولی خان خیل آفریدیوں کا سعید احمد، ایک مہمند صاحب سیف و قلم میراجان سیال، ایک اور مہمند امین جان، ایک محسود اور تنگ زیب خان، بلوچستان کا ایک اچکزئی سردار ایوب خان، فقیر اپپی کا ایک پرانا محسود نائب ملا جنگوی شیر علی ضلع مردان کی تحصیل صوابی کا جلا وطن محمد ارباب خان اور آدم خیل آفریدی، عجب خان (جس نے کوہاٹ سے مولی ایلس کو اغوا کر کے نام کیا تھا۔ دیکھئے باب ہفتم) کا، بھائی شاہزادہ خان شامل تھے۔

انفرادی طور پر یہ مؤثر شخصیات ہیں اور اجتماعی طور پر ایک مؤثر اسمبلی۔ لیکن ان میں سے ہر ایک کی طاقت روایتی قبائلی

۱۔ دلی خان ۱۹۵۹ء میں واپس آگیا اور حکومت پاکستان سے صلح کر لی۔

رشتوں اور تقاضوں پر مبنی ہے نہ کہ ان کے پیروؤں کی "پنجتستان" سے وفاداری پر۔ آج تک ایسے کوئی آثار نہیں ہیں کہ کچھ زیادہ قبائلی اس جھنڈے تلے جمع ہونے پر تیار ہیں جس نے ان کے ملوک کو اکٹھا کیا ہے۔ تاہم تیراہ، مہند علاقے کے بعض حصوں اور گورویخت کے ارد گرد باغی ملوک اپنا کچھ نہ کچھ اثر ڈالنے کے لائق ہوئے ہیں۔

اپنے قومی علاقے کے ان چھوٹے چھوٹے حصوں میں پاکستان اپنا براہ راست اختیار قائم کرنے پر مائل اور شاید اس کا اہل ثابت نہیں ہوا۔ یہ کتنا بھی غیر اہم یہی لیکن ان نقطہ ہائے اختلاف کا مسلسل وجود راوپنڈی کے پہلو کا ایک کانٹا ہے اور "پنجتستان" کو حقیقت کا شاہد دے دیتا ہے۔ "پنجتستان" کے باقی مبینہ علاقوں میں کہیں بھی ایسی صورتحال موجود نہیں ہے کیونکہ وہاں پاکستانی نظم و نسق مکمل طور پر اور بلا مقابلہ کارگر ہے۔

"پنجتستان" کے متعلق قبائلی اکثریت کے احساسات کا اندازہ لگانا مشکل ہے لیکن ۱۹۴۸ء سے لے کر اب تک تحریک کے لئے عوامی حمایت کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔ سرحد پار سے کرائی جانے والی خفیہ ایچی ٹیشن جاری ہے لیکن مصنف ۱۹۵۱ء کے طویل دوروں کے دوران نئی ریاست کے لئے کوئی اہم مقامی حمایت نہ دیکھ سکا حتیٰ کہ وہاں بھی یہ نظر نہ آئی جہاں پاکستانی تحریف کا شہ نہ تھا۔

تحریک ”پنجتوستان“ بیرونی دنیا کو صرف افغان ذرائع ابلاغ کے واسطے سے پیش کی گئی ہے۔ ایک غیر ملکی کے لئے اس تحریک تک رسائی بھی افغان افسر شاہی کی ہی مرہون منت ہے۔ حالیہ سالوں میں تحریک کا ایک سرگرم افغان علمبردار سردار نجیب اللہ خان تھا (اب ریٹائر شدہ) جو یکے بعد دیگرے نئی دہلی لندن اور واشنگٹن میں سفیر رہا۔ نجیب اللہ نے پاکستان کے ساتھ ۱۹۷۴ء کے اواخر اور ۱۹۷۸ء کے اوائل میں ایک مشن کے سربراہ کی حیثیت سے کراچی میں اولین مذاکرات کئے تھے۔ ایک اور افغان افسر، عبدالرحمان پژواک نے مسئلہ ”پنجتوستان“ میں اہم کردار ادا کیا ہے اور وہ حال ہی میں اقوام متحدہ میں افغان وفد کا سربراہ رہا ہے۔ پژواک نے ایک قلم کار کی حیثیت سے اس مقصد کے لئے متعدد کتابچے تحریر کئے جب وہ لندن میں پریس اتاشی تھا۔^۱

افغانستان کے اندر ”پنجتوستان“ کے ساتھ رابطہ کبائیل کے توسط سے ہوتا ہے۔ جس کا قابل تاظم میر شمس الدین مجروح سرحد کے دو طرفہ قبائلی معاملات سے گہرا رابطہ رکھتا ہے۔ مذکورہ بالا اکثر

۱۔ مثلاً پژواک، عبدالرحمان، ”افغانستان“، لندن، افغانستان انفارمیشن بیورو

(۱۹۵۲ء) ”دی پنجتوستان کرسمس“ (سکس، دی کی پریس) ”پنجتوستان“

(لندن۔ افغانستان انفارمیشن بیورو، سال ہزارہ)

ملوک غیر ملکیوں سے انٹرویو کے لئے عموماً کابل میں موجود ہوتے ہیں
۱۹۵۴ء میں قریباً بیس سال میں پہلی دفعہ ایک غیر ملکی نامہ نگار
گورڈینٹ میں فقیر اپی سے مل سکا اور اس نے ”صدر پختونستان“
کو واقعی بہت سنجیدگی سے دیکھا: تھوڑے عرصہ بعد وروسی افسر
میسز زائیگز وویچ اور ڈومیر وویچ نے دہو کابل میں ایک ٹیکنیکل مشن
کے ممبر تھے، بھی فقیر سے اس کے صدر مقام میں ملاقات کی ت:

”پختونستان“ کے لئے سرمائے کا اہم ذریعہ افغان حکومت
ہے۔ قوی احتمال ہے کہ کچھ عرصے کے لئے ہندوستانی ذرائع سے
بھی امداد ملتی رہی بلکہ ایک وقت تو یہ اطلاع ملی تھی کہ نئی دہلی
کابل کے توسط کی بجائے ایپی کو براہ راست ادائیگی کے لئے گوشال
تھا ۵۳ - ۱۹۵۲ء میں ایپی کو روپیے کی فراہمی بہت کم ہو گئی
اور افواہیں پھیل گئیں کہ ایپی اور کابل کے ”پختونستان“ رہنماؤں کے
درمیان تعلقات منقطع ہو گئے تھے لیکن ۱۹۵۴ء میں جنوبی
صوبہ کے افغان گورنر، فیض محمد کے توسط سے وظائف بظاہر
بحال کر دیئے گئے۔ آج تک یہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں کہ تحریک

۱۔ کرسٹوفر اینڈ ”اور فار فلنگ کارپوریشن“ فرام دی سویٹ ٹو

دی ہٹ“ دی نیویارکر“ ۱۹ فروری ۱۹۵۵ء، ص ۱۰۰ تا ۱۱۵

۲۔ ملاقات کا ایک قدرے مبائعہ آمیز بیان نیویارک ٹائمز ۹ فروری ۱۹۵۵ء

میں چھپا۔

”پنجتوستان“ کو کسی اور بیرونی ذریعہ سے بھی مالی امداد ملی ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق کل رقم کتنی بھی ہو وہ بہر حال اس رقم سے کم ہے جو پاکستان اپنے وفادار قبائل پر وظائف کی صورت میں خرچ کرتا ہے۔

”پنجتوستان“ کی حمایت افغان افسر شاہی کے اعلیٰ ترین طبقے تک کی جاتی ہے۔ قبائلیوں کا کابل میں استقبال کیا جاتا ہے اور چھٹیوں میں ظاہر شاہ انہیں برسر عام اعزاز بخشتا ہے۔ وزیر اعظم داؤد محمد خان نے اپنی حیثیت اور ذاتی وقار کو نہایت گہرے طریقے سے اس تحریک سے منسلک کر دیا ہے اور اس کے سلسلے میں اس کی آزادی عمل قدرے محدود ہو کر رہ گئی ہے۔

علاؤ سرحد کے خلاف ”پنجتوستان“ کا دباؤ قریباً قبائلی علاقے تک ہی محدود رہا ہے۔ مختلف اوقات پر اس میں ایجنسیوں کے لئے نامزد پاکستانی افسروں کے قتل کے لئے معاونوں کی پیشکش بھی رکھی گئی ہے۔ لشکر م ۵۔۔ ۱۹۵ء کے عرصے میں کبھی کبھار پاکستانی علاقے پر حملے بھی کرتے رہے تاکہ ”پنجتون جھنڈا“ نصب کرنے کے لئے حمایت حاصل کی جاسکے۔ غالباً ان میں اہم ترین ۱۹۵۲ء کے ادائل میں قلعہ جمد کے قریب ۵ ہزار قبائلیوں کا اجتماع تھا جو زیادہ تر آفریدیوں اور ستواریوں پر مشتمل تھا اور اسی سال کے ماہ دسمبر میں ایک آنا ہی بڑا لشکر نمودار ہوا جس نے ایشاور

کوہاٹ روڈ کو کاٹنے کی کوشش کی۔ آخر الذکر کا علانیہ مقصد سندھ کے کناروں پر جھنڈا لگانا تھا۔ دونوں مہمات ملک ولی خان کی قیادت میں ہوئیں۔ ایک افغان مہندیڈر حسن خان کے تحت مہندی لشکروں نے ۱۹۵۴ء میں سرحد عبور کی اور دریائے کابل کے شمال کے پاکستانی علاقے میں جرگے منعقد کئے۔

سرحد کی مقبول روایت کے مطابق ”پنجتوستان“ کے خلاف سرگرمیوں کی کبھی کبھار سزا بھی دی جاتی ہے ۱۹۵۴ء کے موسم خزاں میں پاکستان ائیر فورس کے ٹرکوں کے ایک ڈرائیور ٹرنینگ کانسٹبل پر کوہاٹ اور بنوں کے درمیان گھات لگائی گئی، تین ہوائی مارے گئے اور ایک کو گروڈیزلے گئے۔ بعد میں اس کارروائی کو جو سال پہلے ولی خان کے لشکر پر بمباری اور تیراہ میں اس کے گھر کی بموں کے ذریعے تباہی کا انتقام قرار دیا گیا۔

سکاؤٹوں اور خاصہ داروں کی وفاداری کو ختم کرنے پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ خیبر راہنہ کے کوئی ایک درجن ارکان ۱۹۵۳ء میں ”پنجتوستان“ چلے گئے اور بعد میں انہیں سرکاری خرچ پر کابل اور جلال آباد رکھا گیا۔ پاکستانی قبائل کے نمایاں رہنماؤں کو ”پنجتوستان“ حکومت میں مناصب جلیلہ اور فیاضانہ الامونسوں کے وعدے کئے گئے، چترال کے دو شہزادے، عزیز الرحمن اور اور محمد عثمان خان، ۱۹۵۰ء میں تحریک سے جاملے لیکن واپس آگئے

اور ۱۹۵۳ء میں پاکستان سے وفاداری کا اعلان کیا۔ ایک سرکردہ
 مہمند ملک خان نورگئی نے موسم بہار ۱۹۵۳ء میں جلال آباد میں
 ایک اعزاز لینا قبول کیا لیکن ۱۹۵۴ء میں پشاور کے ایک دورے
 میں اس نے برسر عام پاکستان سے وفاداری کا اعلان کیا۔ ایک
 اور قابل ذکر نائب خلیفہ مہرول تھا جسے کسی وقت فقیرایپی نے
 اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ مہرول نے نومبر ۱۹۵۴ء میں بنوں میں
 اپنے ستر بیروڑوں کے ہمراہ پاکستانی افسروں کے سامنے ہتھیار ڈال
 دیئے۔ وہ ۱۹۳۶ء میں ٹوچی سکاوٹس سے مفروز ہو کر فقیرایپی
 سے جلا ملا تھا اور اس وقت سے ایپی کا ایک بڑا نائب رہا تھا۔
 مہرول کا ہتھیار ڈالنا اور اعلان وفاداری غالباً سراسر
 رضا کارانہ نہ تھا کیونکہ جب اس نے صلح کا فیصلہ کیا تو وہ پاکستانی
 فوج کے ترغے اور محاصرے میں آچکا تھا۔

جوڑ توڑ اور جوابی جوڑ توڑ جو دو طرفہ قبائلی لیڈروں
 اور افسروں کے درمیان جاری رہا ہے دپچپ پہلوؤں سے
 خالی نہیں ہے۔ مثلاً ۱۹۴۸ء میں کابل نے حضرت صاحب
 شور بازار کو قبائلی علاقے میں بھیجا تاکہ ان کی قابل احترام موجودگی
 سے "پنجتستان" کو تقویت ملے۔ حضرت صاحب نے دعاؤں
 کے ساتھ ساتھ روپیہ بھی فراوان تقسیم کیا لیکن صرف سرد مہری
 کا رد عمل ہوا۔ پاکستان کے خفیہ بیوروں نے جو حضرت صاحب کے

تقریری جرگوں میں موجود تھے۔ سابق مفتی اعظم یروشلم، الکاح محمد امین
حسینی کا ایک پیغام پہنچایا۔ مفتی اعظم نے حضرت صاحب کو حکم
دیا کہ وہ اسلامی اقوام کے درمیان منافرت نہ پھیلائیں۔ حضرت
صاحب نے فن کے مسئلہ استاد کے سامنے سر تسلیم خم کیا، اور واپس
کابل چلے گئے۔ یہاں افواہیں پھیل گئیں کہ انہوں نے قبائل کے لئے مسئلہ
وظائف اپنی جیبوں میں ڈال لئے ہیں۔

اس قسم کی لگائی بجھائی اور کبھی کبھی کی سرحدی معرکہ
آرائی اتنی ہی قدیم ہے جتنا خود سرحد۔ یہ بٹوارے کے بعد بڑھتی
گھٹتی رہی ہے اور یہ اپنے ایک نقطہ عروج پر ۵۴ - ۱۹۵۰ء کے
دوران پہنچی اور پھر اگلے پانچ چھ سال میں گھٹتی گئی یہ ۱۹۶۰ء
میں پھر اٹھی جب باجوڑ میں جم کر لڑائیاں ہوئیں اور پاکستان نے
لواب دیر کو معزول کر دیا، کافی حد تک کسی ایک وقت میں
پیدا کردہ دباؤ کا انحصار خود سرحد کی بجائے کراچی اور کابل
پر ہے۔ اس سے نہ صرف دلجوئی عملاً ناممکن ہو جاتی ہے بلکہ مدت
مدید تک انتشار و خلفشار خود افزا رہن جاتا ہے اور آسانی سے
قابو سے باہر بھی ہو سکتا ہے۔

اس سلسلے میں ”پنجتونستان“ کا ایک خطرناک ترین حربہ
کابل کا خوشحال خان سکول ہے۔ سکول مغل شہنشاہ بابر کے مزار
کے پاس مضافات میں ایک پہاڑی پر واقع ہے ۱۹۵۴ء میں اس

میں چھ ماہ ٹھارہ سالہ قریباً ۵۰ طلباء تھے۔ ایک سو مزید فارغ التحصیل طلباء خوشحال خان ہوشل میں رہتے تھے اور کابل کے مختلف افغان کالجوں میں پڑھتے تھے۔

قریباً یہ تمام لڑکے اپنی تعلیم انخوراک اور رہائش افغان حکومت کے وظائف سے حاصل کرتے ہیں۔ ان میں سے اکثر پاکستان کے قبائلی علاقہ سے ہیں۔ خوشحال خان سکول دیگر افغان تعلیمی اداروں کے برعکس جو وزارت تعلیم کے تحت ہیں، براہ راست کبائیل کے تحت ہے۔ سہولیات اور معیار تعلیم غالباً افغانستان میں بہترین ہیں ذریعہ تعلیم پشتو ہے اور زور پٹھان تاریخ، ادب اور روایت پر دیا جاتا ہے۔ عامانوی مضامین نیز انگریزی اور اسلامیات بھی پڑھائے جاتے ہیں۔

عام طلباء اکٹھے پٹھان ثقافت سے مملو فضا میں رہتے ہیں۔ تمام اہم قبائل کے لڑکے ایک دوستانہ مساوات کی بنیاد پر اکٹھے بیٹھتے ہیں جو ان کے آباؤ اجداد میں معدوم اور ناقابل تصور تھی۔ بختون ولی کے روایتی تصورات جو گھروں میں بنیادی طور پر بین القبائلی منافقات کے لئے سمجھے اور استعمال کئے جاتے ہیں یہاں ایک پٹھان قوم کے نقطہ نظر سے پڑھائے جاتے ہیں۔

کم از کم خوشحال خان سکول میں ایک حقیقی پٹھان قومیت اٹھ

پذیر ہوئی ہے۔ اسے نہایت احتیاط سے پروان چڑھایا جا رہا ہے اور ایک اہم اور توجہ طلب مشن کا احساس لڑکوں کے ذہنوں میں تاشہ پذیر عمر میں پیدا کر دیا جاتا ہے۔ بعض ”پختونستان“ کے مخالف پاکستانی ملوک تسلیم کرتے ہیں کہ وہ اپنے بیٹوں کو اپنی میراث کی مفت تعلیم کے حصول کے لئے بھیجتے ہیں جو لائن کی پاکستانی طرف کی تعلیم سے بدرجہا بہتر ہے۔ یہ لوگ اس خیال کو خاطر میں نہیں لاتے کہ ان کے بیٹے ان کے برعکس سیاسی خیالات افذ کر سکتے ہیں۔

اس یقین کا جواز مشکوک ہے۔ لڑکے لازماً اپنی گھریلو آبادیوں میں لیڈر بن کر ابھر سگے۔ جب گروہ یکے بعد دیگرے سکول سے نکلیں گے تو وہ بر بنائے استحقاق مسلسل اہمیت کی ایک طاقت ہوں گے، ان ملوک سے کہیں زیادہ جو اب تحریک ”پختونستان“ کے سربراہ ہیں اور جن کی شدید موقع پرستی انہیں اس قابل بنادیتی ہے کہ وہ کسی وقت بھی سرحدی مسئلے کا حل قبول کر لیں جو راولپنڈی یا کابل کے لئے تسلی بخش ہو۔ خوشحال خان سکول کی بنیادیں کتنی بھی مصنوعی ہوں لیکن اس کے نتائج خود قبائل سے باہر کسی کے بھی قابو میں نہ رہیں گے۔

خوشحال خان سکول سے کبھی کبھار لڑکے فرار بھی ہوئے ہیں جیسا کہ دنیا میں ہوتا ہے لڑکے یہاں سے بھی اپنے گھروں کو بھاگ جاتے ہیں ۱۹۵۴ء میں ایک گروہی فرار آنا اہم تھا کہ افغان وزیراعظم

خود سکول میں آیا اور طلباء کو ان کی ناشکری پر لیکچر دیا، لیکن گروہ کی اکثریت ”پنجتستان“ سے نہایت غلصانہ اور دیوانہ وار عقیدت رکھتی ہے۔ ان میں سے اکثر ایک وسیع سیاق و سباق میں اس کی عدم حقیقت کو نہیں سمجھتے۔

تحریک ”پنجتستان“ کے وسیع مضمرات کا واضح مظاہرہ ۱۹۵۵ء میں ہوا۔ اس سال کے شروع میں پاکستان میں مغربی پاکستان کے صوبوں کو ایک صوبہ و ن یونٹ میں مدغم کرنے کا عمل شروع ہوا، ان میں سے بعض تحتی یونٹ افغان دعوائے ”پنجتستان“ میں بھی شامل تھے اور کابل میں اس پر رد عمل بہت متشددانہ تھا یہ رد عمل ۲۸ مارچ کو افغان وزیراعظم داؤد خان کی ایک آتش ناک تقریر کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اگلے دن افغان ہجوم پولیس سے بے خوف، جلال آباد اور قندھار کے پاکستانی سیاسی اداروں اور کابل میں سفارت خانے پر حملہ آور ہوئے اور انہیں لوٹ لیا۔

پاکستان نے بھی اسی زور سے جواب دیا۔ پشاور میں افغان قونصل خانہ پر حملہ ہوا۔ جنوبی وزیرستان میں ایک محسود جرگہ اور شمالی وزیرستان کے ارہزار قبائلیوں کے نمائندہ ملوک کے ایک جلسہ نے قومی عزت کو بحال کرنے کے لئے کابل پر حملہ کی اجازت مانگی۔ پاکستانی پریس میں افغانی تخت پر موجودہ خاندان کے حق

کا سوال کھلم کھلا اٹھایا گیا۔ ۱۔ افغان درآمدات براستہ پاکستان پر غیر سرکاری پابندی لگادی گئی۔ ۱۔ افغان سیاست کاروں کو واپس بلا لیا گیا۔ جب کئی سالوں کے بعد سرحد کشمیر پر پاکستانی اور ہندوستانی فوجوں میں ایک بڑی سرحدی ٹکڑھوتی تو کہلاچی میں افغان ہندوستانی تینہنی چال کا دیرنہ خوف عود کر آیا۔ کئی ماہ کی مصاحبتی کوششوں کے بعد جو زیادہ تر سعودی عرب نے کیں ایک سمجھوتہ نہ ہو سکا لیکن ”پنجتوستان“ کی ایک بڑا بین الاقوامی بحران پیدا کرنے کی صلاحیت کا کھل کر مظاہرہ ہو چکا تھا۔

دوسرا مظاہرہ ۶۱ ۹۷ء کے موسم خزاں میں ہوا جب باجوڑ میں افغان حمایت سے ہونے والی قبائلی ایچی ٹیشن اور پاکستان کے جوانی اقدامات سے دونوں ممالک کے لئے بین الاقوامی سرحد بند کردی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افغانستان رسل و رسائی اور حمل و نقل کے لئے قریباً مکمل طور پر سویٹ یونین کا دست نگر ہو گیا اور امریکی امدادی پروگرام ، رسد اور ساز و سامان میں لانہی طور پر کمی ہو گئی جو عموماً پاکستان کے راستے فراہم ہوتا تھا لیکن افغانستان نے خواہ پیہی ہی زبردست روسی اثر و رسوخ میں مزید اضافہ کو پس نہ کیا ، وہ ”پنجتوستان“ پر سمجھوتہ کی بجائے اس اضافے کو قبول کرنے پر رضا مند ہو گئے۔

خلاصہ کلام یہ کہ ”پنجتوستان“ بحیثیت ایک قومی وجود

درحقیقت کوئی بنیاد نہیں رکھتا۔ یہ اقتصادی، سیاسی اور جغرافیائی
محاط سے ناقابلِ عمل ہے جہاں تک اس کے قومی تحریک ہونے کا
تعلق ہے یہ وقت سے پہلے ہے کیونکہ قبائلیوں کی بہت بڑی اکثریت
اس سے بے نیاز ہے، لیکن یہ ایک حساس سرحد پر ایک مسلسل ذریعہ
ہیجان ہونے کی وجہ سے ایک حقیقی اہمیت کا حامل ہے اور وسیع تر
اوپریش کا ایک خطرناک ہتھیار ہے۔ ”پنجونستان“ افغانستان کے
دواہم اور وزیر یا مسائل کو حل کرنے کی کوشش کا منظر ہے۔ مجتہد
علاقوں کی بازیابی کی تاریخی ٹرپ اور قومی تحفظ کا ایک زبردست
اور غیر ذمہ دارانہ خطرے سے بچاؤ۔ یہ تحریک پاکستانی افغان تناؤ
کی ایک وجہ بھی ہے اور اس کا ماسکہ اور کبتر بھی۔ اگر بنیادی مسائل
کا کوئی حل ممکن ہے تو وہ ابھی پر دہ مستقبل میں پوشیدہ ہے۔ سرحد
نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ ایک معلق انفجار کی ہوشیار کیفیت میں
بھی طویل عرصے تک ہوش و حواس بجا رکھ سکتا ہے اور ایسی صورت
حال اکثر اس کے باشندوں کے مزاج اور فائدہ طلبی کے عین مطابق
ہے۔

(۱۷) باب سیزدہم

”عظیم مقابلہ“ جاری ہے

تعارف:-

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ، ۱۹۰۷ء کے اینگلورشیمن معاہدہ پر دستخطوں کے بعد روس اور انگلستان کے درمیان ”عظیم مقابلہ“ میں کچھ وقفہ پیدا ہوا۔ ۱۹۱۱ء میں ایران میں مقابلے کا محقر سا احیاء ہوا لیکن سرحد اور اس کے ساتھ متعلقہ علاقے زار حکومت کے باقی ماندہ چند سالوں میں پیرا من رہے۔

لیکن بالشویک حکومت کے قیام کے قریباً فوراً ہی بعد وسط ایشیا پر گرفت کاروائی تجدید پھر شروع ہو گئی۔ بد قسمتی سے ”عظیم مقابلہ“ کے بیسویں صدی کے دور پر نئی روشنی ڈالنے والے بہت سے دستاویزات سویٹ اور برطانوی آثار خانوں میں دستیاب نہیں ہیں۔ لہذا واقعات کا جو خاکہ آگے دیا گیا ہے وہ کسی حد تک جزو دیا تی ہے۔ جہاں تک یہ خالصتاً سرحد پر اثر انداز ہونے والے

معاملات مرکوز ہے۔ یہ صرف ایک ہی حصہ پر عادی ہے جو لازماً
اہم ترین حصہ نہیں یعنی وہ حصہ جو پہلی جنگ عالمگیر کے بعد کے
عشرے میں سامراجی برطانیہ اور سوویت یونین کی آویزش سے متعلق ہے۔

ٹرانس کا کیشیا میں داخلہ:-

بالشویک انقلاب کے بعد اتحادیوں نے روس میں جتنی مددائیں
کیں برطانیہ کا ان تمام میں نمایاں ترین کردار تھا۔ لیکن نہیں یہاں جس
واحد مددائیت سے براہ راست سروکار ہے وہ ۱۹۱۸ء کے موسم گرما
میں ٹرانس کا کیشیا کے علاقے میں کی گئی۔

اس وقت وسط ایشیا پر برطانوی تردد و تفکر کی فوری
وجوہات دو تھیں، ہزاروں جرمن، آسٹروسی، ہنگری اور روسی
جنگی قیدی جو زار حکومت نے ترکستان میں قید کر رکھے تھے بالشویکوں
نے روس کو جنگ سے باہر نکالتے ہی رہا کر دیے۔ یہ لوگ ترکستان
میں آوارہ پھر رہے تھے، اور کوششیں کی جا رہی تھیں کہ انہیں نئے
لڑاکا یونٹوں میں منظم کر دیا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ ترک جو مشرق
وسطیٰ میں شکستوں سے دوچار ہونے کے باوجود ابھی تک برسرِ پیکار
تھے۔ بحرہ کیسپین تک پہنچنے کی تیاری کر رہے تھے۔ یہ واقعات نیز
نوابا دیاتی علاقوں کی آزادی کے متعلق بیانات جو بالشویکوں کی
طرف سے پہلے ہی دیے جا رہے تھے۔ لندن میں سلطنت ہند کے

لئے ایک معنی خیز اور امکانی خطہ قرار دیئے گئے۔

یہ خطہ افغانستان میں جرمن سرگرمیوں کی وجہ سے شدید ہو گیا جہاں غیر معمولی طور پر قابل دس ٹیس، فان نیڈر میئر اور فان ہرنگ قبائل کو یقین دلارہے تھے کہ اس حملے میں ترکستان کے جنگی قیدی ان کی حمایت کریں گے۔

انگریزوں نے بربان سراولف کیرو "ہندوستانی قلعہ کے پشتہ کے دور دراز ترین لیکن قابل رسائی مقام پر کم سے کم ممکنہ فوج کے استعمال سے اس خطے کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ حقیقت کہ پشتے پر جو مقام چنا گیا وہ کسی اور کے قبضے میں تھا کارروائی کے راستے میں حائل نہ ہونے دی گئی۔

دو چھوٹی چھوٹی برطانوی فوجیں عراق اور ایران سے وسط ایشیا کی اتر صورت حال میں داخل ہو گئیں جہاں سرخ، سفید اور ترک فوجیں ایک جنگ بوقت لڑ رہی تھیں۔ دونوں برطانوی فوجیں اپنی ساخت پر وخت میں اینگلوانڈین تھیں اور ان میں گاؤڈز جیسے مشہور و معروف بہ "نارنگ پرشین کارڈن" جنرل میلین کے تحت مشہد سے روانہ ہوئی۔ مرو پر قابض ہوئی لیکن تاشقند پر قبضہ

۱۔ سراولف کیرو "سویڈ ایپار دی ٹرس آف سنٹرل ایشیا اینڈ ٹالینز"

(لندن، میکسن ۱۹۵۱ء) ص ۱۱۵

کرنے میں ناکام رہی۔ لیکن اس نے منشویکوں کے تعاون سے کچھ وقت پر ٹرانس کیپٹین ریلوے پر قبضہ جالیا اور اس طرح تاشقند کی بالشویک حکومت اور اس کے یورپی روس میں جنم داتا گروہ کے درمیان مواصلات کو منقطع کر دیا۔ دوسری فوج المعروف ”ڈنٹروف“ میجر جنرل ڈنٹروف کے تحت بغداد سے ساحل کیپٹین پر واقع انیزلی (پہلوی) کوروانہ ہوئی اور ۶ اگست ۱۹۱۸ء کو پاکو چلی گئی جہاں ایک ڈانواں ڈول سویت حکومت قائم کی گئی تھی۔ ایک ماہ کے اندر اندر دونوں برطانوی اور سویت فوجیں انور پاشا کے ایک بھائی نوری پاشا کے ایک غیر متوقع ترک حملے میں باہر دھکیل دی گئیں۔ نوری پاشا نے بعد میں وسط ایشیا کے لئے جدوجہد میں اہم کردار ادا کیا۔

پاکو سے پسپائی پر متعدد سویت کومسار (داروغہ) رسد رسانی (مترجم) سفید جرنیل ڈینیکن نے گم فائر کر لئے جس کے ساتھ انگریز تعاون کر رہے تھے۔ چھبیس کومساروں کو ہندوستان میں جلا وطنی کی سزا دی گئی۔ انہیں سفر کے لئے کراسنودسک سے ایک گاڑی میں بٹھا دیا گیا اور پھر فوراً ہی انہیں قبضے کے باہر تارکہ گولی مار دی گئی۔ دریں اثناء برطانوی فوج نے جو انیزلی واپس آگئی تھی جنرل ڈینیکن کی مدد کی تاکہ وہ روسی کیپٹین بیڑے پر قبضہ کر سکے جو وہاں بندھا ہوا تھا اور اسے بالشویکوں کے خلاف استعمال کے لئے دوبارہ

ٹھیک ٹھاک کر لے۔ بیشتر اس کے کہ بیڑہ حرکت میں آتا اسے ایک
سرخ بحری افسر ایف ایف رائسکولنی کوف نے ایک دلیرانہ چال
سے سویٹ روس کے لئے قبضہ کیا جس کا ذکر آگے بھی آئے گا۔
ان دونوں واقعات میں برطانوی کردار مداحوں کے حاتمہ
کے مدتوں بعد تک باشندوں نے یاد رکھا اور اس پر تیز و تند
نقربت کا اظہار کرتے رہے۔ بعض سویٹ لیڈروں نے بعد میں اصرار
کیا کہ کومساوی کی موت کے ذمہ دار انگلینڈ تھے۔ سویٹ حکومت نے
خود اپنے ایک نوٹ مورخہ ۱۱ مئی ۱۹۲۳ء میں اس مسئلے کو اٹھایا
جس میں باشندوں کی انگلینڈ دشمن سرگرمیوں کے الزامات کی تردید
کی گئی تھی۔

۱۔ ایگزینیٹیو یوڈین اور ہیرلڈ ایچ فشر "سویٹ ریشیا اینڈ دی ویسٹ" ۱۹۲۰ء تا ۲۰۲۱ء
اے ڈاکومنٹری سرورے "ڈسٹریٹ فورڈ، یونیورسٹی، ۱۹۵۰ء) ص ۲۲۶ ڈیویو
کولس اور ڈیڈ کے کولس "آرڈنر ڈینشن ان ریشیا، ۱۹۱۸ء تا ۱۹۲۲ء لندن،
دی گلانٹر (۱۹۳۵ء) ص ۱۶ تا ۶۴ -

۲۔ یوڈین اور فشر، ایضاً ص ۲۲۶ نیز پارلیمنٹری پیپر ۱۹۲۳ء ص ۱۱۱
۱۸۷۴ء ریشیا نمبر ایک "ایپلانی آف دی سویڈش گورنمنٹ ہر جمیٹیز گورنمنٹ
ریکارڈنگ دی ریلیشن بین دی ٹو گورنمنٹس" ص ۷

کاشغریں برطانوی سرگرمی :-

دیں آثناء انگریز وسط ایشیا کے ایک اور کلیدی علاقے میں بھی
باشوکیوں کی مصمم مخالفت کر رہے تھے۔ ۱۹۱۸ء کے موسم بہار میں وسط
ایشیائی امور میں تجربہ کار ایک سرکنی مشن چینی ترکستان میں کاشغر
کے برطانوی قونصل خانہ کو بھیجا گیا۔ اس کے دو افسر، لیفٹننٹ کرنل
ایف۔ ایم۔ ہیلی اور میجر ایل۔ وی۔ ایس بلیکٹراگست میں تاشقند
چلے گئے تاکہ وہاں کی باشوکی حکومت سے رابطہ قائم کریں اور
اس کی طاقت اور عزائم کا پتہ چلائیں۔ ڈیپٹی سیرا افسر، لیفٹننٹ کرنل پرسی
ایتھرٹن سر جارج میکارٹنی کی جگہ کاشغریں قونصل جنرل بنا۔
تاشقند میں ہیلی کو جو سوک ملا وہ بعید از دوستی تھا۔ کیونکہ سویت
حکومت کمیونسٹ کے علاقے میں برطانوی فوج کے حملے سے خائف تھی
لہذا اسے فوراً ہی تحت الزمین جانا پڑا۔ کئی ماہ کے محیر العقول
تجربات کے بعد ہیلی اپنے آپ کو پکڑنے کے لئے باشوکی خفیہ سروس
میں بھرتی ہو کر براستہ بخارا ایران پنج کنٹرول کیا۔
تاشقند علاقے میں رہتے ہوئے اس نے جاسوسی کا ایک خاصا

نوٹ دیکھے۔ ہیلی کا اپنی مہمات کے متعلق اپنا بیان فریڈرک ایم۔ ہیلی مشن ان تاشقند

میں (لندن! جوناٹن کیمپ، ۱۹۶۶ء)

پھیلا ہوا ادارہ قائم کیا اور سفید جرنیل کارنی لوف کے ساتھ بھی رابطہ قائم رکھا اور خوفزدہ میں ارگاش کے تحت اٹھنے والی فوجا سترہ ہسماچی تحریک کے ساتھ بھی۔

دریں اثنا عکاشغری میں ایقمرٹن نے چینی حکام کو آمادہ کر لیا کہ وہ اس کے ساتھ مل کر باشوکیوں کی مخالفت کریں۔ اس نے بھی جلد ہی جاسوسی کا ایک جال پھیلا دیا جس نے بنجارا اور فرغانہ میں سوویٹ دشمن فوجوں کے ساتھ رابطہ قائم کیا اور نیز چینی ترکستان میں مثبتہ باشوکیک گاشتوں اور خیر خواہوں کی تلاشیاں لیں اور انہیں قیدیوں ڈالنے کے لئے چینیوں کے حوالے کر دیا۔ ایقمرٹن نے خود بھی کاشغری میں مبینہ باشوکیک ہاں خاتون پر چھاپے مارے اور عمومی طور پر شہر میں حکومت کی بہت سی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

روس کے خلاف ایک اخبار اور پراپیگنڈا سروس چلانے کے علاوہ ہادر کرنل باشوکیوں کو چینی سوتی پارچاٹ کی برآمد کرانے میں کامیاب ہو گیا اور اس نے کئی سووٹ مشن بے نیل و مرام واپس بھیجا دیئے جو کاشغری میں چینی حکام سے رابطہ قائم کرنے آئے تھے۔ اس مفروضے پر کہ یہ باشوکیک حمایت یا کم از کم منظوری سے ہوتی تھی اس نے یارقند اور سرحد کے درمیان افغانوں اور پٹھانوں کی اسلحہ کی

منافع بخش تجارت میں بھی روڑے اٹکائے جا

ایبھرتن ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء کے پورے دو سال کا سفر میں رہا۔ آخر اندک سال میں وہ خوفزدہ امیر بنارا کے ساتھ خط و کتابت کو مارا جس نے امیر کے ۲۵ ملین پونڈ کے ذاتی اثاثے بالشویکوں سے بچانے کے لئے برطانوی ذمہ داری کے بدلے بنارا سلطنت برطانیہ کے حوالے کرنے کی پیش کش کی۔ ستمبر ۱۹۲۰ء میں ایبھرتن نے بادل مانوا اس پیش کش کو اس بنا پر ٹھکرا دیا کہ کچھ عرصہ پہلے فیصلہ کر لیا گیا تھا کہ مختلف بالشویک مخالف تنظیموں کو دی جانے والی امداد بند کر دی جائے۔

امیر کی پیش کش کو ٹھکرانے کے باوجود ایبھرتن نے اپنی سرگرمیاں اس وقت کا ملا بند نہیں کیں۔ چند ماہ بعد جب ۱۶ مارچ ۱۹۲۱ء کو اینگلو سویت تجارتی معاہدہ پر دستخط ہو گئے تو اس نے تبصرہ کیا کہ اسے ایک ابھریں میں ڈال دیا گیا تھا کیونکہ اسے پتہ نہیں تھا تھا کہ معاہدہ (جو طرفین کو ایک دوسرے کے خلاف معاندانہ سرگرمیوں سے روکتا تھا) زیر غور تھا اور لہذا جوابی پراپیگنڈا کی بندش کے لئے راستہ ہموار کرنے کا کوئی موقع نہ تھا جس کے لئے اسے مامور کیا گیا تھا۔

یڈ۔ ایف۔ ص ۱۲۳، ۲۲۹ تا ۲۳۰، ۲۳۸ تا ۲۴۱

یڈ۔ ایف۔ ص ۱۶۹ تا ۱۷۱

یڈ۔ ایف۔ ص ۲۱۶ تا ۲۱۷

سویٹ سرگرمی:

بالشویک اگر اہل بھی ہوتے تو بھی انہیں مدد غلطوں سے براہ راست لڑنے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ یہ خود ہی جلد ہی اپنے ہی بوجھ تلے ٹوٹ پھوٹ گئیں، پھر بھی انہوں نے کوئی وقت ضائع کئے بغیر ایشیا میں انگریزوں سے دو دو ہاتھ کر لئے۔ جو آلات انہوں نے استعمال کئے وہ دورِ زاریت سے قدرے مختلف تھے اور عالمی رائے کی نئی آب و ہوا میں ان سے بھی خطرناک تر تھے۔

سابقہ زار سلطنت کے اندر اپنے آپ کو مضبوط کرنے کے لئے لڑتے ہوئے سویٹ نظریہ پرستوں نے باقی ایشیا بالخصوص ہندوستان کی اہمیت کے متعلق عالمی اشتراکی انقلاب کے سیاق و سباق میں بے تکلفی سے اظہار کیا۔ پہلی جنگ عالمگیر کو ختم ہوئے ابھی تین ہفتے بھی نہیں ہوئے تھے اور برطانوی فوجیں ابھی کیسپین کے علاقے میں تھیں کہ ٹالین نے مسلمان کمیونسٹوں کی ایک کانگریس ماسکو میں بلائی۔ اس نے انہیں کہا:

”آپ سے زیادہ آسانی اور تیزی سے کوئی اور مغرب اور مشرق کے درمیان پُل تعمیر نہیں کر سکتا۔ یہ اس لئے کہ آپ کے لئے ایک دروازہ ایران، ہندوستان، افغانستان اور چین میں کھلا ہے ان ممالک کے لوگوں کی سامراجیوں کے چنگل سے آزادی“

سامراج کی جڑوں کو اکھیڑ دے گی۔^۱

مئی ۱۹۱۹ء میں پبلیشز کمرسٹیٹ آف نیشنلٹیز کے سرکاری
مجلہ وژن نیشنلسٹ کے ایک مقالہ میں تجویز کیا گیا کہ ٹالین کے چیلنج
کو اس طرح نافذ کیا جائے کہ ترکستان میں سویت مسلمانوں کی خصوصی
پلیٹیں قائم کی جائیں تاکہ مشرق میں برطانوی سامراج پر حملہ ہو سکے
اور وہاں پراپیگنڈا کا ایک ایسا ادارہ کھڑا کیا جاسکے جو اس مقصد
کے لئے خصوصی طور پر تربیت یافتہ سفیروں کو استعمال کر سکے۔
مقالہ اس بیان پر ختم ہوا ”کہ وہ ہمالیہ کی چوٹیوں پر نمودار ہونے
والے قازق نیزے ماضی میں برطانیہ کے سینے کے کابلوس بنے رہے
تھے۔ اب روسی پروتا رہیہ مسلمانوں کے نیزے ہوں گے جو ایران
ہندوستان اور افغانستان میں ان کے بھائیوں کی امداد کے لئے
نمودار ہوں گے۔“^۲

۱۔ وژن نیشنلسٹ، شمارہ ۳، ۲۴ نومبر ۱۹۱۸ء، ص ۲ بحوالہ ایگزینیا
بھے یوڈین اور رابرٹ سی نارتھ ”سوویت ریشیا اینڈ دی ایٹ ۱۹۲۰ء تا
۱۹۲۴ء“ اے ڈاکومنٹری سروے ”دیسین فورڈ: یونیورسٹی پریس، ۱۹۵۷ء
ص ۷۷، ۷۸، وژن نیشنلسٹ پبلیشز کمرسٹیٹ آف نیشنلٹیز کا سرکاری
مجلہ تھا جس کا سربراہ اس وقت ٹالین تھا۔

۲۔ ایضاً نمبر ۲۷، مئی ۱۹۱۹ء مینیس از یوڈین اور نارتھ ایضاً، ص ۱۶۱

چند ماہ بعد لندن نے خود ترکی کی کمیونسٹوں کو ایک خط
 بطور جواب دیا کہ وہ وسط ایشیا میں کمیونسٹ پارٹی کو
 مضبوط کریں تاکہ ہم انگریزوں کی سربراہی میں قائم شدہ عالمی
 سامراج کے خلاف پوری ایمانداری اور تندہی سے لڑ سکیں۔ نومبر
 ۱۹۱۹ء میں مسلمان کمیونسٹوں کی دوسری کانگریس ماسکو میں بلائی گئی۔
 اس میں ایک قرارداد پاس کی گئی جس کے مطابق تیسری انٹرنیشنل
 آئندہ ”ہندوستان، مصر، ترکی اور دیگر ریاستوں کو جو سامراج
 کے جنگل میں ہیں آزاد اور خود مختار تصور کرے گی۔“ یہ اعلان اس
 امید پر ختم ہوا کہ اس سے متعلقہ ممالک میں ”انقلابی روح“ بیدار ہوگی۔
 ایشیا میں انقلابی مہم کے لئے باشتویکوں کی تیاری ستمبر ۱۹۲۰ء
 میں اپنے نقطہ عروج پر پہنچی جب باکو میں اقوام ایشیا کی مشہور
 معروف کانگریس بلائی گئی۔ یہاں باشتویک لیڈروں، زنیوفیف،
 راڈک اور پافوف نے ایک دوسرے سے بڑھ بڑھ کر قریباً دو ہزار
 ایشیائیوں کو انقلاب کی تلقین کی جن میں انور پاشا بھی شامل تھا۔

۱۔ پیٹر گراڈ پر ۱۱ نومبر ۱۹۲۰ء ۱۳ نومبر ۱۹۱۹ء بمطابق ازبکستان اور

نارتھ ایشیا، ص ۱۶۰

۲۔ ورنن ٹینسٹن، ۱۴ دسمبر ۱۹۱۹ء، ص ۲، بحوالہ یوڈین اور نارتھ

ایشیا، ص ۱۶۴ تا ۱۶۵۔

زینوفیف مشرق میں ایک سرخ فوج کی تخلیق کو سراہا جو انگریزوں کے عقب میں ایک بغاوت شروع کرے گی۔۔۔ اور ہراس گستاخ انگریز افسر کو کاٹ ڈالے گی جو ترکی، ایران، ہندوستان اور چین میں آقا بننے کا عادی رہا ہے۔^۱

اکلا اقدام اقوام ایشیا کے لئے پراپیگنڈا اور کارروائی کی غرض سے ایک مستقل کونسل کا قیام تھا۔ یہ جلد ہی تین کونسلوں میں بٹ گئی۔ ایک کا صدر مقام باکو میں تھا برائے مشرق قریب، دوسرے کا ارکٹسک برائے مشرق بعید اور تیسرے کا تاشقند برائے وسطی ایشیا مشمولہ بہ افغانستان اور ہندوستان، ہمیں یہاں باکو اور ارکٹسک (اول الذکر کبھی منظم نہ ہو سکا) سے کوئی واسطہ نہیں لیکن تاشقند مرکز آئندہ کئی سالوں تک ہندوستان میں وجہ نفرت و دہشت بنا رہا۔

۱۔ اقوام مشرق کی پہلی کانگریس باکو ستمبر تا اکتوبر ۱۹۲۰ء سٹینو گرافک رپورٹ

داسکو، بے صفحہ ۱۹۲۰ء بحوالہ یوڈین اور نارٹھ، ایضاً ص ۱۶۷۔

۲۔ وٹرن نیشنلسٹ، نمبر ۴، ۱۵، دسمبر ۱۹۲۰ء ص ۱ تا ۲۔ بحوالہ یوڈین

اور نارٹھ، ایضاً ص ۸۲۔

تاشقند کول :-

بالشویک حکومت کی ابتداء سے ہی تاشقند ہندوستان کے خلاف سرگرمیوں کا مرکز رہا تھا۔ ۱۹۱۰ء کے اوائل میں جب بلی بھی زیر زمین تھا۔ ہندوستانی انقلابیوں کے گروہ میں سے ایک، پروفیسر برکت اللہ نے جس نے پہلی جنگ عالمگیر کے دوران برلن میں ہندوستان کی عارضی حکومت قائم کی تھی تاشقند میں نمودار ہوا۔ برکت اللہ کا بل کے سرکردگان سے گہرا رابطہ تھا اور وہ ان کے اور بالشویکوں کے درمیان ایک قسم کا واسطہ بنا ہوا تھا تاکہ ہندوستان کے خلاف ایچی ٹیشن کو مربوط کیا جاسکے۔ یہ وسط ایشیا میں برکت اللہ کے ساتھ ہی مہندر اپر تاپ تھا جو برلن میں عارضی حکومت کا صدر رہا تھا۔ وہ بھی انگریزوں کے خلاف روسی اور افغان حمایت حاصل کرنے کے لئے سرگرم تھا۔^۲

۱۔ بلی، ایف، ص ۱۴۴۔ برکت اللہ نے ۱۹۱۹ء میں ازولستیا کو اپنے سیاسی غلط فہمی پر مختصر بیان دیا "میں کمیونسٹ یا سوشلسٹ نہیں ہوں لیکن میرا سیاسی پروگرام اب تک انگریزوں کو ایشیا سے نکالنا ہے" (ازولستیا، نمبر ۹، مئی ۱۹۱۹ء ص ۱۰) بحوالہ بوڈین مارٹھ، ایف، ص ۱۸۱

۲۔ بلی نے سویٹ چیچکا افسر کی حیثیت سے پرتاپ کے ساتھ بنجارا کے باہر کانان کے ایک ہوٹل میں طویل گفتگو کی۔ دیکھئے بلی، ایف، ص ۲۲۶ تا ۲۲۷

۱۹۲۰ء کے اوائل میں سرٹھ کمر سٹیٹ بیلے خارجہ امور کی
 ماسٹفڈ شاخ نے ماسٹفڈ میں ہندوستانی انقلابیوں کے لئے ایک
 خصوصی ٹریننگ سکول کھولا تھا۔ اس سکول کو جلد ہی ماسٹفڈ یورو
 آف دی کمیونسٹ انٹرنیشنل نے اپنے انتظام میں لے لیا جس کا
 سربراہ ایک کٹر کمیونسٹ اور پیشہ ور تحریک بان، ایم۔ این رائے
 تھا جو برکت اللہ یا پرتاپ سے کہیں زیادہ لائق و فائق تھا۔
 اکتوبر ۱۹۲۰ء میں چھتیس ہندوستانی جن میں اکثر تحریک
 ہجرت و مسلمانوں پر مشتمل جو پہلی جنگ عالمگیر کے بعد ترکی سے
 برطانیہ کے سلوک کے خلاف ہندوستان میں اپنی سکونت ترک کر
 رہے تھے، کے ارکان تھے ماسٹفڈ پہنچے جہاں رائے نے انہیں خوش
 آمدید کہا اور وہ سکول میں داخل کر لئے گئے۔ ماسٹفڈ میں نو مہینے کا
 ایک کورس مکمل کرنے کے بعد ان میں سے تین، شوکت عثمانی،
 عبدالمجید اور عبد القادر صحرائی قرید ٹریننگ کے لئے ماسکو بھیج دیے
 گئے۔ بعد میں یہ تینوں ماسکو کی کمیونسٹ یونیورسٹی آف ٹوٹنہم
 آف دی ایسٹ (محنت کاران مشرق - مترجم) میں داخل کر
 لئے گئے اور جب ۱۶ مارچ ۱۹۲۱ء کے اینگلو سویت تجارتی
 معاہدہ کے تحت مارچ ۱۹۲۱ء میں ماسٹفڈ سکول بند کر دیا گیا تو اور
 بھی کئی ان سے آئے انگریزوں کے مطابق ماسٹفڈ سکول کو اپنی

مہم سوندانا تھ ٹیگور، ہارینڈ ڈیر پیمنٹ آف دی کمیونسٹ مومنٹ ان انڈیا
 (باقی ماسٹفڈ اگلے صفحہ پر)

مختصر زندگی کے دوران دو ملین گولڈ روپے ملے :

جون ۱۹۲۱ء میں پندرہ تاشقندی طلباء ہندوستان واپس آتے ہوئے پشاور میں گرفتار کر لئے گئے، اور تاشقند مقدمہ سازش کے تحت قید کر دیئے گئے۔ نومبر ۱۹۲۲ء میں سات مزید دھڑلے گئے جو انگریزوں کے دعوے کے مطابق کوئی باسٹھ میں سے تھے جو ہندوستان بھیجے گئے تھے۔ تھوڑے عرصہ بعد ۱۰ پونڈ کے کئی بینک نوٹ جو لندن کے لائیڈز بینک نے ایک سوئٹ افسر تجارت کو جاری کئے تھے۔ ہندوستان کے ایک انقلابی نے ہندوستان میں نٹروا لئے جو تاشقند کے فارغ التحصیل طلباء اور کابل میں سوئٹ مشن کے ساتھ قریبی رابطہ رکھتا تھا۔ انگریزوں نے دعویٰ کیا کہ تھوڑے انٹر مشنل کی چوتھی کانگریس نے اپنی نومبر ۱۹۲۲ء کی میٹنگ میں ۱۶۲۰ لاکھ پونڈ ہندوستان میں تخریب کاری کے لئے مختص کئے

(بقیہ عاشرہ)

دکلتہ بکیمینٹ پارٹی آف انڈیا ۱۹۴۴ء ص ۳

پارلیمنٹری میسرز ۱۹۲۶ء سی ایم ڈی ۱۲۸۹۵ (۲) "ای سیلین آف میسرز دیلیگ و دی ریشیز بٹوین ہنر مجیز گورنمنٹ اینڈ دی سوئٹ گورنمنٹ

۱۹۲۱ء تا ۱۹۴۴ء ص ۸ -

تھے۔ ایم این رائے بھی ۱۹۳۱ء میں ہندوستان واپس آتے ہوئے
سابقہ الزامات پر گرنہ فارکھ لیا گیا۔

سوویت افغان تعاون۔

باشوکیل کو کابل میں اپنی انگریز دشمن سرگرمیوں کے لئے
مصدقہ دستاویز مل گئے۔

افغان امیر حبیب اللہ کو فروری ۱۹۱۹ء میں قتل کر دیا گیا
تین ماہ کے اندر اندر حبیب اللہ کے بیٹے بیٹے امان اللہ نے اپنے
ایک چچا اور دو بڑے بھائیوں کی بجائے تخت حاصل کر لیا تھا
اور برطانوی ہند کے خلاف لڑائی شروع کر لی تھی۔ اپریل ۱۹۱۹ء
میں امان اللہ نے جنرل محمد ولی خان کو ایک خط بنام لینن کے
ساتھ ماسکو بھیجا۔ خط میں سوویت حکومت کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔
اور انگریزوں کے خلاف جنگ میں اسلحہ کی امداد کی درخواست کی
گئی تھی۔ تاہم اس میں ایک افغان قونصل جنرل تعینات کیا گیا جس
کا اہم فرض پروفیسر برکت اللہ کو اس کی انگریز دشمن سرگرمیوں
میں مدد دینا تھا۔

پارلیمنٹری پیپر ۱۹۲۳ء سنی ایم ٹی ۱۹۶۹ء دریشیا نمبر ۲) "کارپاٹس
بٹون ہٹر مجسٹری گورنمنٹ اینڈ دی سویت گورنمنٹ ریپبلک دی ریشیہ بٹون
دی گورنمنٹس" ص ۸ تا ۹۔

لینن نے امان اللہ کے خط کا جواب دیا جس میں افغانستان کو ایک آزاد مملکت تسلیم کیا گیا اور بیرونی گدھوں کی کسی بھی کوشش کے خلاف باہمی امداد کی تجویز پیش کی گئی جو افغانستان یا سویت یونین کی نو حاصل کردہ آزادی کے خلاف کی جائے بلکہ یہ تبادلوں خطوط و خیالات ۸ اگست ۱۹۱۹ء کو معاہدہ رادلینڈی سے کئی مہینے پہلے ہوا جس میں انگریزوں نے سرکاری طور پر افغانوں کے اپنے امور خارجہ کو آزادانہ طور پر چلانے کا حق تسلیم کیا۔

افغان فوج کی کرم میں پیش قدمی کے ساتھ ہی پشاور میں ایک بناوت پشاور کے افغان پوسٹماسٹر نے ترتیب دی تھی جس میں شاید پیتاپ اور برکت اللہ کی امداد حاصل تھی لیکن یہ بناوت چیف کمشنر سر اس کیپل نے سر اٹھاتے ہی کچل دی جس نے پشاور کے پرانے شہر کی ناکہ بندی کر دی اور قراہی آب روک دی۔ جب مہلی اور دہاٹ ہال افغانستان پر عائد کی بانیوالی شرائط صلح پر حیسب ہیں کہ رہے تھے تو یہ اطلاع ملی کہ سویت روس نے امان اللہ کو ضلع پتحد واپس کرنے کی پیش کش کی تھی جس پر قبضہ چالیس سال پہلے برطانیہ اور روس کو جنگ کے دہانے تک لے آیا تھا۔

۱۹۱۹ء کے آخر میں براہوئی کے تحت ایک سویت مشن کابل

آیا اور ایک مستقل نمائندہ، آئی۔ اے۔ زیڈ سورٹز افغان دارالحکومت
میں تعینات کر دیا گیا۔ پینچدہ کی واپسی کی تیجا ویز تو بارورنہ ہوسکی
لیکن انجمن سویت مصاحت بڑھتی رہی۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۲۱ء کو کابل میں سویت معاہدے
کا دریافت تیار ہوا اور ۲۸ فروری ۱۹۲۱ء کو ماسکو میں ایک معاہدہ پر دستخط ہوئے۔ ۱۹۲۱ء کے
اس معاہدے کے تحت طرفین نے قونصل خانے قائم کئے (۵ سویت
قونصل خانے افغانستان میں اور سات افغان قونصل خانے سویت
یونین میں) سویت یونین کے راستے افغان اشیاء کی مفت نقل و
حمل کا فیصلہ ہوا اور بخارا اور خیوا کی خانہوں کی آزادی کو باہمی
طور پر تسلیم کیا گیا۔ دفعہ ۱۰ کے تحت سویت یونین نے عہد کیا کہ وہ
حکومت افغانستان کو مادی اور اقتصادی امداد فراہم کرے گا۔
بعد میں انگریزوں نے الزام لگایا کہ یہ امداد ایک ملین سو مایا پیانی
سالانہ کے وظیفہ پر مشتمل تھی۔

زخموں پر نمک چھڑکنے کے لئے فروری ۱۹۲۱ء کے اینگلو
سویت معاہدہ کی تکمیل کے فوراً ہی بعد ماسکو نے سورٹز کی بجائے
سرخ بحری افسر ایف راشکولنی کو ف کو مقرر کیا جس نے تین
سال پہلے انیزلی میں کیسپین بیڑے کو انگریزوں کے قبضے سے چھڑا لیا
تھا۔ سویت یونین نے اپنے اس عزم کا بھی اعلان کیا کہ وہ قندھار

۱۔ متن کے ۱۰ دیکھئے بیوزارڈ شاہیر "سوویت تریٹ سیریز" جلد اول واشنگٹن: جارج

ٹاؤن پریس، ۱۹۵۰ء) ص ۶۶ تا ۹۶ نیز بارہمینٹری بیسینڈ، ۱۹۲۴ء سی ایم ڈی ۲۸۹ ص ۹

اور غزنی میں اپنے قونصل خانے کھول لے گا۔ بھو ہندوستانی سرحد کے سرے پر واقع تھے۔

جون ۱۹۲۱ء میں سٹالن نے افغانستان کو ایک ایسا ملک بنایا جس کے ذریعے کمیونسٹ انٹرنیشنل براہ راست مزید جنوب میں برطانوی ہند کے ساتھ رسل و رسائل قائم رکھتا ہے، پراپیگنڈا جو شرعی سکرٹریٹ کا بنیادی مقصد ہے“ بلے

راشکولنی کوف نے فوراً ہی ان ذرائع کو پھیلانا اور مضبوط کرنا شروع کر دیا۔ پروفیسر برکت اللہ اور دیگر ہندوستانی انقلابی جو پہلی جنگ عالمگیر کے خاتمہ کے بعد باشندگیوں سے رابطہ رکھتے تھے کابل میں لائے گئے۔ ڈاکٹر حفیظ نامی ایک مشہور و معروف انارکسٹ جو ویانا میں بم سازی کا مطالبہ کرتا رہا تھا“ افغان دارالحکومت لایا گیا تاکہ ایک بم فیکٹری قائم کرے بلے

جمال اور انور

برکت اللہ کے ساتھ ہی جمال باشا بھی کابل آیا تھا جو انور پاشا اور انوری پاشا کا ایک رفیق تھا۔ پیشتر اس کے کہ ہم سویت یونین

۱۔ پارلیمنٹری پیپر ۱۹۲۷ء سیم ڈی ۲۸۹۵ (رشیانیر ۲) ص ۵

۲۔ ایضاً، ص ۷

اور سامراجی برطانیہ کے درمیان وسط ایشیائی سرحدی سرزمین کے متعلق جدوجہد میں جمال کے کردار پر بحث کریں ترکی پاشاؤں کا مختصر سا ذکر ضروری ہے۔

جمال، انور اور طلعت ہی وہ مثلث تھے جو ۱۹۱۴ء میں ترکی کو لڑائی میں جرمنی کی طرف لانے کے زیادہ تر ذمہ دار تھے۔ ترکی کی شکست اور کمال اتاترک کے عروج کے ساتھ ہی جمال اور انور باشوویک روس میں چلے گئے۔ دونوں ایک بین الاقوامی سلطنت کے مبہم سے خواب دیکھتے تھے جو ترکیستان میں مرکوز ہوتی اور بالآخر افغانستان اور مسلم ہند پر بھی محیط ہوتی۔ اُن کی انگلیں اس وقت سویٹ منصوبوں سے ہم آہنگ تھیں جو ہندوستان کے خلاف بنائے جا رہے تھے لہذا باشوویکوں نے ان دونوں کی حمایت اور حوصلہ افزائی کی۔ انور اقوام مشرق کی باکو کانفرنس کا ایک اہم مقرر تھا، لیکن تھوڑا عرصہ بنجارا میں ٹھہرنے کے بعد انور باشوویکوں سے مایوس ہو گیا اور باسماچیوں سے جاملو جو وسط ایشیائی قبائلی تھے اور سویٹ حکومت کے خلاف ایک جنگ چپا دل لڑ رہے تھے، انور نے اپنے ایک بین الاقوامی مملکت کے منصوبے کے لئے افغانستان سے اپنے حامی تلاش کئے اور ایک وقت ایسا آیا کہ اس کی فوج میں ایک ہزار افغان شامل بنائے گئے۔ لیکن بغاوت ناکام رہی اور انور ۸ اگست

۱۔ ڈبلیو پی اورزبڈ کے کونٹس 'دی سویٹس ان سنٹرل ایشیا' ص ۸۰

۱۹۲۲ء کو آخر دم تک لڑتا ہوا ایک جانباز کی موت سے ہمکنار ہوا۔^۱
 انور باسماچیوں سے مل گیا تو جمال کابل چلا گیا۔ اس کے یہاں
 اسلامی نشاۃ ثانیہ کے خوابوں پر انگریز دشمنی کو اولیت حاصل تھی۔
 اس کی کافی شہادت موجود ہے کہ افغانستان میں اس کی سرگرمیوں کی
 کفالت باشوئیک کرتے تھے بلکہ غالباً کافی حد تک ان کی رہنمائی بھی
 کرتے تھے۔ جمال نے ایک ”اسلامی انقلابی لیگ“ قائم کی جس کا مقصد
 مقصد ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس
 نے شاہ امان اللہ کے لئے افغان فوج کی ایک اعلیٰ کور بھی تیار
 کرنے کی ذمہ داری قبول کی۔ اس نے سرحدی قبائل کے ساتھ بھی
 رابطہ قائم کیا جو ابھی تک تیسری جنگ افغان کے بعد سلگ رہے
 تھے اور جنوری ۱۹۲۱ء میں وہ کابل میں وزیرہ ملوک کے ایک گروہ
 سے بھی ملا۔ اس نے بعد میں قبائلی علاقہ کا خفیہ دورہ کیا اور ممکن
 ہے کہ اس نے محدود تعداد میں اسلحہ بھی مہیا کیا ہو، جو ۲۲-۱۹۲۱ء
 میں وزیرستان میں لڑائی کے دوران استعمال ہوا۔ انگریزوں کے
 مطابق باشوئیکوں نے اسے اس مقصد کے لئے ایک ملین روپے دیئے تھے۔^۲
 لیکن جمال ایک دورے کے لئے سوئٹ یونین واپس گیا اور

۱۔ اتورا اور باسماچیوں کی تفصیلات کے لئے دیکھئے کیروا، ایفا، ص ۱۱ تا ۱۳۰

۲۔ پارلیمنٹری پیپر، ۱۹۲۴ء، سیم ڈی ۲۸۹۵ (ریشیا نمبر ۲) ص ۱۰ تا ۱۱

پیشتر اس کے کہ اس کے اسلامی انقلاب کے منصوبے خاص پیشرفت کر سکتے اسے ۲۱ جولائی ۱۹۲۲ء کو غالباً بالشویکوں نے فلس میں قتل کر دیا جو اس پر اب اعتبار نہیں کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ اب اپنی افادیت کھو چکا تھا۔^۱

دریں آئنا غریب کو لنی کوف اپنے کام میں متہمک رہا۔ اس کی سرگرمیوں کا اندازہ ان بحری ماروں کے سلسلوں سے ہو سکتا ہے جو کابل اور ماسکو اور تاشقند کے درمیان گھومتی رہیں اور پھر انگلیوں کے ہاتھ لگ گئیں جنہوں نے انہیں شائع کر دیا۔ ۸ نومبر ۱۹۲۲ء کو رات کو لنی کوف نے ماسکو کو تار بھیجا "اب پشاور کے شمالی خطہ، مہندوں پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے لیکن قلت سرتاء کی وجہ سے ہم کچھ زیادہ نہیں کر سکتے۔"^۲

۱۴ فروری ۱۹۲۳ء کو رات کو لنی کوف نے سوویت دفتر خارجہ کی تاشقند شاخ کو ایک تار میں ذکر کیا کہ "اسلحہ و سرمایہ کی قوری دستیابی ایک بے پناہ اہمیت رکھے گی تاکہ برطانوی ہند کے خلاف ایک نئی افغان نقل و حرکت کو ابھارا اور سنبھالا جاسکے۔ چار دن بعد اسے ماسکو کو بتایا "میں وزیرستان کی مدد کرنے کے انتظامات کر رہا ہوں جو قریباً ۳ ہزار روپے اور کارٹوسوں کے ۱۰۰ صندوقوں

۱ - کیرو، ایضاً، ص ۱۲۳

۲ - پارلیمنٹری پیپر ۱۹۲۳ء سٹی ایم جی ۱۸۶۹ء (درشیا نمبر ۲) ص ۸

برطانوی اندازوں کے مطابق اس نے برطانوی ہند پر حملہ کرانے کی کوششوں پر اکتوبر ۱۹۲۲ء اور اکتوبر ۱۹۲۳ء کے درمیان ۸ لاکھ کابلی روپے خرچ کئے۔ اس کا اہم کارنامہ بس ہی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے قبائلی کوتاہ روپیہ مزید دے دیا۔

ہندوستان میں ردِ عمل :-

وسط ایشیا اور افغانستان سویت سرگرمیوں پر ہندوستان میں ردِ عمل ہر اس سے کم نہ تھا۔ حکومت ہند کے سینئر افسران جنہوں نے اپنے ایامِ شباب میں زارِ روس کے ساتھ عظیم مقابلہ میں اپنا کردار ادا کیا تھا، بالشویکوں کو زاریت پرستوں سے زیادہ بڑا اور فوری خطرہ سمجھتے تھے۔ ۱۹۲۰ء کے لئے سالانہ بیان بابت اخلاقی و مادی ترقی اور حالات در ہند کے ابتدائی الفاظ یہ تھے :-

حالیہ سالوں میں شاید ہی سیاست کے مطالعہ کاروں پر یہ بات اتنی اثر انداز ہوئی ہو کہ ہندوستان ایشیا کا ایک جزو لاینفک ہے جتنی زیرِ تبصرہ وقت میں ہوئی ہے۔ ایک طرف ہندوستان اور افغانستان کے درمیان تعلقات اور دوسری طرف ہندوستان اور سرحدی قبائل کے درمیان روابط کو سمجھنا ناممکن ہے جب تک

باشوئیک سرگرمی کے طوفانی پس منظر سے کچھ واقفیت نہ ہو جس پر یہ تعلقات کم یا زیادہ درجے تک منحصر تھے۔

ہندوستان کے حکمرانوں کے لئے خاص طور پر پریشان کن اور انور اور جمال کا پان تو ران ازم اور پان اسلام ازم تھا۔ ان کے ہندوستان پر براہ راست اثرات ہوئے۔ مولانا محمد علی نے تحریک خلافت کی حمایت میں برصغیر کے مسلمانوں کو کانگریس پارٹی کے ساتھ ایک بے نظیر رشتہ تعاون میں پرو دیا۔ ہجرت کے تحت ہزاروں ہندی مسلمان برطانوی ہند کو خیر باد کہہ کر افغانستان چلے گئے جن میں کافی بعد میں تاشقند میں انجام پذیر ہوئے۔ اس سال کی حکومت ہند کی سرکاری رپورٹ ان الفاظ پر ختم ہوتی ہے: ”۱۹۲۰ء کے وسط سے باشوئیت اور اسلام کے گھٹ جوڑ کا بیانگ دہل اعلان کیا گیا“۔

ہمارے پرانے دوستوں، سید احمد کے پیروؤں نے اس گٹھ جوڑ کو ہندوستانی سرحدات کے اندر پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ چمرقند میں سید کی کالونی کو ”دیر اور ہزارہ سرحد کے قبائل میں کمیونسٹ پراپیگنڈا پھیلانے کا اڈا“ قرار دیا گیا۔ ضلع ہزارہ میں ٹل کے

۱۔ مورل اینڈ میٹریٹل پرائسز آف انڈیا، ۱۹۲۰ء، صفحہ ۱

۲۔ ایضاً، ص ۶۸

ایک سابقہ جاگیردار محمد ایوب خان کو جس نے چند سال پہلے افغانستان میں پناہ لے لی تھی "پان اسلامک بھیس میں باشوئیک نظریات" کو پھیلانے کے الزام میں مورد تعزیر پھرایا گیا۔^۱

لیکن ساتھ ہی ساتھ انگریز اس گٹھ جوڑ کے باشوئیک اور پان اسلامک پہلوؤں میں مفادات کا تصادم بھی دیکھ رہے تھے ۱۹۲۲ء کی سالانہ پیراگرس رپورٹ بابت اخلاقی و مادی ترقی میں رائے زنی کی گئی تھی کہ شاہ امان اللہ اپنی سرکردگی میں ایک عظیم وسط ایشیائی و فلیق کی تخلیق کے لئے کام کر رہا تھا۔ رپورٹ کے مطابق ظاہر ہے کہ یہ سکیم باشوئیکوں کو گوارا نہیں جو ایک مضبوط اسلامی ہلاک کو ہندوستان کے راستے میں اپنے لئے سدا رہ سمجھتے ہیں،^۲

امان اللہ کا دفاق نمودار نہ ہو سکا ۲۲-۱۹۲۱ء کی وزیرستانی بغاوت دبا دی گئی۔ باشوئیکوں نے وسط ایشیاء میں زار کی فتوحات کو مستحکم تو کیا لیکن وہ کم از کم جغرافیائی لحاظ سے ہندوستان کے راستے پر ایک اپنچ بھی آگے نہ بڑھے۔ لیکن اس کی وجہ وسط ایشیاء میں "عظیم مقابلہ" کی نئی چالوں کی بجائے یورپ میں کی جانے والی سیاسی ریشہ دوانیوں میں مضمر تھی۔

^۱ این ڈیمیدایف، بارڈر ایڈمنسٹریشن رپورٹ ۲۳-۱۹۲۲ء ص ۳

^۲ مورل اینڈ میٹریئل پیراگرس آف انڈیا ۱۹۲۲ء ص ۸

سفارتی لڑائی

پُرکار قدیم برطانیہ اور جلد بازی سویت مملکت کے درمیان
 سفارتی معرکے آرائی کا مفصل بیان اتنی جگہ گھیر لے گا جتنی یہاں ممکن
 نہیں۔ لیکن بالاختصار کہا جا سکتا ہے کہ سویت یونین کو اپنے سامراجی
 اور انقلابی عزائم کے باوجود تیسرے عشرے میں امن اور خارجی دنیا
 کے ساتھ رابطہ نو کی اشد ضرورت تھی۔ سویت معیشت جنگ
 اور انقلاب کے چھ سالوں میں تباہ ہو چکی تھی اور اسے بری طرح
 درآمدات کی ضرورت تھی۔ خام مال کی صورت میں بھی اور اشیاء
 پیداوار کی صورت میں بھی۔ برطانیہ کو اپنی برآمدات کے لئے
 منڈیاں درکار تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان انقلاب کے
 لئے آنا تیار نہیں تھا جتنا کہ کمیونسٹ نظریہ پرستوں نے پہلے سمجھا تھا۔
 کمیونسٹ انٹرنیشنل نے اپنے زور کار رخ مشرق کی طرف موڑ دیا جہاں
 چین سرگرمیوں کے لئے زیادہ زرخیز میدان مہیا کرتا تھا۔

ان عوامل کا نتیجہ ایک سال کے مذاکرات کے بعد ۱۶ مارچ
 ۱۹۲۱ء کے اینگلو سویت تجارتی معاہدہ کی صورت میں نکلا اس
 دستاویز نے سویت یونین کو بالکل تسلیم کر لیا اور باشبیک مملکت کے

خلاف اتحادیوں کی جنگ بے اعلان کو ختم کر دیا۔ معاہدے کا بنیادی تعلق تجارت سے تھا لیکن دونوں مملکتوں کے درمیان حساس ترین نکات اختلاف میں سے ایک کا احاطہ اس کے دیباچہ میں کر لیا گیا۔

اس میں سویت حکومت نے ”فرجی یا سیاسی یا کسی بھی دوسری قسم کے عمل یا پراپیگنڈا سے اقوام ایشیا میں برطانوی مفادات یا برطانوی سلطنت یا مخصوص ہندوستان اور افغانستان کی آزاد مملکت کے سلسلے میں کسی قسم کی مخالفت کا رروائی کی حوصلہ افزائی کرنے کی کسی بھی کوشش“ سے اجتناب کرنے کا عہد کیا۔ برطانیہ نے بھی سویت حکومت کو ”ایسا ہی مخصوص قول“ دیا جو ”ان ہالک“ سے متعلق تھا جو سابقہ روسی حکومت کے حصے کے تھے اور جواب آزاد ہو گئے ہیں۔“

یہ عبارت برطانیہ کی طرف سے خاصی رعایت کی منظر تھی کیونکہ وزیر خارجہ لارڈ کرزن نے ابتداء میں اصرار کیا تھا کہ سویت کی برطانیہ دشمن سرگرمیوں پر پابندی میں ککیشن ایران اور ایشیائے کوچک کو بھی شامل ہونا چاہیئے۔ علاوہ ازیں سویت حکومت کا عہد کو منظر پر لاگو نہیں کیا گیا حالانکہ فریقین اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ اکثر سرگرمیوں کا منبع تھا جن پر برطانیہ کو اعتراض تھا۔

افغانستان میں راشکوئی کوف اور ۱۹۲۱ء، ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۳ء میں بے شمار دیگر کمیونسٹ سرگرمیوں نے نیم حیران برطانوی دفتر خارجہ کے سامنے جلد ہی بکثرت ایسے شواہد پیش کر دیے کہ تجارتی معاہدے میں سویت عہد بے کار تھے۔ چنانچہ واٹس ہاٹ لہل نے مسئلہ سے نمٹنے کے لئے ایسے اقدامات کئے جو اس کے بس میں تھے۔ مثلاً ۲۲ نومبر ۱۹۲۱ء کے اینگلو افغان معاہدہ کے ساتھ مراسلات کا جو تبادلہ ہوا اس میں افغان وزیر خارجہ کو مجبور کیا گیا کہ وہ برطانیہ کو یقین دلائے کہ معاہدہ کی دفعہ ۷ کے تحت دی جانے والی کسٹم معافی کے بدلے میں افغانستان ”روسی حکومت کو قونصل جنرل یا قونصل یا نمائندے مقرر کرنے کا موقعہ ان مقامات اور علاقوں یعنی جلال آباد، غزنی اور قندھار میں نہ دے گا کیونکہ یہ سرحدات ہند سے متصل ہیں“۔ یہ نو ماہ پہلے کے سویت افغان معاہدہ کی دفعہ ۵ کے واضح طور پر خلاف تھا۔ جس کے تحت قندھار اور غزنی میں سویت قونصل خانوں کے قیام کی خصوصی طور پر منظوری دی گئی تھی۔

برطانیہ نے براہ راست سویت یونین سے بھی احتجاج کیا۔ پتھر

۱۔ پارلیمنٹری پیپر ۱۹۲۲ء، سی ایم ڈی ۷۸۶، ’ٹریڈیٹریں دی برٹس اینڈ افغان

گورنمنٹس ۲۲ نومبر ۱۹۲۱ء (ٹریڈیٹریں ۱۹۲۲ء، نمبر ۱۹) ’شاپیرو‘ ایضاً

۱۹۲۱ء کو لارڈ کرزن نے سویت وزیر خارجہ، پیچیرین کو ایک سخت نوٹ ارسال کیا۔ نوٹ میں ہندوستانی انقلابیوں کی سویت حمایت کا ذکر تھا جن میں برکت اللہ اور بم سائر، ڈاکٹر حفیظ شامل تھے اور تاشقند سکول کے خلاف بھی شکایت کی گئی تھی اس میں افغانستان میں سویت سرگرمیوں کے خلاف بھی احتجاج کیا گیا جس میں جمال کی حمایت بھی شامل تھی اور ۲۸ فروری ۱۹۲۱ء کے سویت افغان معاہدے کو بھی نشانہ تنقید بنایا گیا۔ ۲۷ ستمبر ۱۹۲۱ء کو بٹوی نوٹ نے جواباً ان الزامات سے انکار کیا جو غلط معلومات اور جعلیوں پر مبنی تھے۔ ڈاکٹر حفیظ اور تاشقند سکول سے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا اور افغانستان میں جمال اور ہر جگہ مقرڈ انٹرنیشنل کی سرگرمیوں سے سویت حکومت کی لا تعلقی کا اعلان کیا۔

وائٹ ہال نے سویت انکار کی تیز و تند تردید رواۃ کر دی لیکن اگلے ڈیڑھ سال تک مزید کوئی کارروائی نہیں کی جس کے دوران راشکوئی کوف کابل میں اپنی سرگرمیوں میں ہمہ تن مشغول رہا اور تاشقند سکول کے فارغ التحصیل طلباء روز افزوں تعداد میں ہندوستان آنے لگے۔ پھر لارڈ کرزن نے بلا پیشگی سیاسی تنبیہ اپنے ۲ مئی ۱۹۲۲ء

۱۔ کرزن کے نوٹ کا متن پارلیمنٹری پیپر نمبر ۱۹۲ اے سی ایم ڈی ۲۸۹۵ درج شدہ ہے جس میں ۱۲ ستمبر

۲۔ متن کے لئے دیکھیے، ایضاً، ص ۱۲ تا ۱۶

کے نوٹ میں اپنا مشہور ”الٹی میٹم“ بذریعہ ہوائی جہاز بھیج دیا۔ کمرن کے لئے نوٹ میں اینگلو سوویت تجارتی معاہدہ کی بہت سی خلاف ورزیاں گنوائی گئیں اور آخر میں نتیجہ نکالا گیا کہ اگر سوویت افسروں کو (مشمولہ بہ راسکولنی کوف) جو شدید خلاف ورزیوں کے مرتکب ہوئے تھے، ”معزول“ نہ کیا گیا اور انہیں ”ان کے ناپسندیدہ جوڑ توڑ کے مناظر سے واپس“ نہ بلایا گیا تو معاہدہ ختم کر دیا جائے گا۔ کمرن کے الٹی میٹم نے انگلستان اور سوویت یونین دونوں ممالک میں تہلکہ برپا کر دیا۔ ٹراٹسکی بخاریہ اور راڈک نے اسے ایک اور مداخلت یا سوویت یونین کو جنگ کی اشتعال دہی کا ایک نقطہ آغاز قرار دیا۔ بہت سے انگلیز لیبرل حضرات نے بھی اسے اسی ردِ شنی میں دیکھا۔ بہت سے عام طور پر باشوکیک مخالف قدامت پسند بھی ان تجارتی انتظامات کو درہم برہم کرنے کے خلاف تھے جن کے تحت وہ فائدہ اٹھا رہے تھے۔

لیکن رسمی سویت جواب نہم تھا۔ ۴ جون ۱۹۲۳ء کے نوٹ میں سویت دفتر خارجہ نے الزامات کی تردید کی باخصوص

- ۱۔ پارلیمنٹری پیپر ۱۹۲۳ء، سی ایم ڈی ۱۸۶۹ء، دریا بلیز، ص ۹
- ۲۔ دیکھئے یوڈین اور فشر، ایضاً ص ۱۸۷ تا ۱۸۹ نیز ڈبلیو پی اوزریڈ کے کوس اے
- ہسٹری آف اینگلو سوویت ریلیشنز، لندن! لارنس اینڈ وشارٹ، ۱۹۴۴ء، ص ۱۰۲ تا ۱۲۹

رائسکولنی کوف سے منسوب سرگرمیوں سے انکار کیا۔ نوٹ کے مطابق
یہ سرگرمیاں سویت وزیر کی نہ تھیں بلکہ کسی اور شخص کی تھیں جس
کا روسی حکومت سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن جس کا نام مسلمین لاوا
کے آداب کے مطابق روسی حکومت منظر عام پر نہیں لاسکتی یہ
غالباً جمال کی طرف اشارہ تھا۔ یہ واضح نہ ہو سکا کہ ماسکو آتا ہے
دست و پا کیوں تھا۔

ماسکو کی مغرب سے اقتصادی تعلق کی اشد ضرورت کا
مظاہرہ چند ماہ بعد ہوا جب رائسکولنی کوف اور اس کے ساتھی
مفسد واپس بلائے گئے۔ غالباً دیدہ و دانستہ کدورت کے ساتھ
شاہ امان اللہ نے جفاکش رائسکولنی کوف کو ”سردار“ کا خطاب
دیا اور اس بوڑھے بالشویک کو کابل سے رخصت ہونے سے پہلے
مناسب اعزاز بھی بخشا۔

اس کے بعد ہندوستان کے خلاف سویت سرگرمی بتدریج
کم ہوتی گئی اور کرزن کے الٹی میٹم پر عمل کرنے کی نوبت نہیں آئی
گو لندن اور ماسکو کے درمیان الزام تراشی جاری رہی حالانکہ فروری

۱۔ سویت نوٹ کا متن پارلیمنٹری پیپر ۱۹۲۳ عر سی ایم ڈی ۷۷۸ میں ہے اور
ریپبلک آف دی سویت گورنمنٹ ٹو ہر مجسٹریٹ گورنمنٹ ریپبلک آف دی
ٹو گورنمنٹس ”درشیا نمبر ۲، ۱۹۲۳“ ص ۴

۱۹۲۲ء میں نئی برطانوی لیبر پارٹی حکومت نے سویٹ یونین کو قانوناً بھی تسلیم کر لیا تھا۔

مئی ۱۹۲۴ء میں ۱۹۲۱ء کا تجارتی معاہدہ منسوخ کر دیا گیا اور دونوں ملکوں کے درمیان سفارتی تعلقات بھی موقوف کر دیئے گئے، جب بدنام آرکوس کیس کے سلسلے میں لندن میں ایک سویٹ جاسوسی حلقہ دریافت کیا گیا لیکن یہ انقطاع توقع کے خلاف مکمل نہ تھا کیونکہ طرفین کے اب تک نہایت مٹھوس اقتصادی روابط قائم ہو چکے تھے، اور تجارت غیر رسمی طور پر جاری رہی۔ اکتوبر ۱۹۲۹ء میں تعلقات بحال کر دیئے گئے اور برطانیہ اور روس کے درمیان ”عظیم مقابلہ“ کا آخری مرحلہ ختم ہو گیا۔ جہاں تک سرحد اور وسط ایشیا کے تعلق تھا ”مقابلہ“ ۱۹۲۳ء میں ہی ختم ہو چکا تھا جب راشکوینی کوف کو کابل سے واپس بلا لیا گیا تھا اور بین الاقوامی کمیونزم نے اپنا اولین ہدف ہندوستان کی بجائے چین کو بنا لیا تھا۔

بعد میں بھی کچھ تدابیر آزمائی ہوئی جیسے ۲۱ اگست ۱۹۲۶ء کو کابل کے قریب پنگان میں ایک سبڈ افغان معاہدہ غیر جانبدار^{می} و عدم جارحیت پر دستخط ہونے۔ اس دستانہ میں ہر فریق نے

۱۔ آرکوس کیس پریسبرین کے نوٹ کا متن پارلیمنٹری میگزین ۱۹۲۴ء، سیمپل ۱

ہمد کیا کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں غیر متعلقہ لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف کارروائی کرنے سے روکیں گے اور ایک دوسرے کے خلاف کسی سیاسی یا فوجی اتحاد یا مقاطعہ یا ناکہ بندی میں شرکت سے اجتناب کریں گے بھارتستان میں بھی کچھ تو ترقی جاری رہی جہاں برطانیہ اور سویت یونین نے اپنا اثر و رسوخ مسلط کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اسے کافی حد تک ترکو ایرانی پیکٹ مورخہ ۱۲۶ اپریل ۱۹۲۶ء نے روک دیا جس کے تحت ایشیاء کے دونوں سردان آہن اتاترک اور رضا شاہ نے اپنے اپنے علاقوں میں مشترکہ اقدامات کا فیصلہ کیا۔

چوتھے عشرے میں ہندوستان کی کانگریس پارٹی کی رور افروزد طاقت اور ۱۹۳۰ء اور ۳۷-۱۹۳۶ء کی عظیم قبائلی بغاوتوں نے توجہ ”سرخ خطرہ“ سے ہٹا دی اور فی الحقیقت سویت سرگرمی جنوبی ایشیا میں برائے نام ہی رہ گئی سوائے اس کے کہ ہندوستان کی نسبتاً غیر اہم کمیونسٹ پارٹی کی تھوڑی بہت حمایت کی گئی۔

دوسری جنگ عالمگیر اور مابعد!

دوسری جنگ عالمگیر کی آمد آمد پر وسیع تر مفادات پھر سراٹھانے لگے۔ امان اللہ اور اس کے بعد نادر شاہ کے بنا کردہ خاندان کے تحت کابل کے برہن کے ساتھ گہرے ذاتی اور اقتصادی تعلقات پیدا ہو گئے اور کابل میں جرمن اور اطالوی سفرائے ایک دفعہ پھر سرحدی قبائل کو برطانوی ہند کے خلاف ابھارنا شروع کیا یہ سرگرمیاں انگریزوں کے لئے پریشان کن ہو گئیں کیونکہ ایران بھی زیادہ سے زیادہ محوری طاقتوں کی طرف مائل ہوتا گیا۔ جنگ میں جاپان کے داخلے اور ہندوستان کی مشرقی سرحدات پر براہ راست دباؤ کے آغاز نے صورتحال کو نازک بنا دیا۔ لیکن طاہر شاہ نے وہی پالیسی اختیار کی جو حبیب اللہ نے پہلی جنگ عالمگیر میں کی تھی، اور افغان حکومت نے مخالفانہ اقدامات سے اجتناب کیا اور ہندوستان کے خلاف ایسی کارروائی کی حوصلہ افزائی سے دور رہی۔ ایران پر اتحادیوں کے قبضہ اور برما میں جاپانی پیش قدمی کو روکنے سے صورت حال کچھ بہتر ہوئی اور سرحد جنگ کے آخری سالوں میں آنا پڑا میں رہا جتنا سابقہ جنگ کے بعد کبھی نہ رہا تھا۔

ان حالات کا پہلے ہی مختصر ذکر کیا جا چکا ہے جنہوں نے

برطانیہ کو ۱۹۴۷ء کے نصف اول میں ہندوستان چھوڑ دینے کے فیصلے پر مجبور کیا۔ جب انگریز رخصت ہو گئے تو بہت اہم تغیرات رونما ہوئے خود جونی ایشیا میں بھی اور ”عظیم مقابلہ“ کے گرد و پیش میں بھی۔

پاکستان میں تغیرات !

ہندوستان سے انگریزوں کے چلے جانے کے بعد ایشیا میں طاقت کا جو خلا پیدا ہوا اس پر مبصرین بہت کچھ لکھا ہے۔ یہ سب زیادہ سرحد میں ہی ظاہر ہوا۔ بٹوارے سے پہلے سالوں میں سرحد میں عام طور پر فوج کی تعداد (بہ استثنائے جنگ عالمگیر دوم جب یہ گھٹا دی گئی تھی) قریباً تیس ہٹالین ہوتی تھی اور اس کی پشت پناہی غیر منقسم ہندوستان کی پوری مختلف النوع عسکری قوت کرتی تھی جس میں بحری اور ہوائی عناصر بھی شامل تھے ہندوستانی افواج کی پشت پناہی اپنی جگہ برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کی عالمگیر قوت کرتی تھی۔

انگریزوں کے چلے جانے کے بعد یہ سب کچھ ختم ہو گیا سوائے برطانوی ہندوستانی فوجی لاؤشکر کے چھوٹے سے حصہ کے جو پاکستان کو ملا۔ یہ مل ملا کر دو لاکھ سے بھی کم آدمی بنتے تھے ایک ماہ کے اندر اندر یہ سب کی سب سرحد کشمیر پر متوجہ تھی

جہاں یہ برصغیر کے باقی ماترہ لاؤ لشکر کو منسوخ کرنے کے لئے استعمال کی جا رہی تھی۔ ۱۹۴۸ء کے موسم بہار تک دونوں پاکستانی اور ہندوستانی فوجوں کے بہترین یونٹ متنازعہ ریاست میں جھونک دیئے گئے تھے۔ قبائلی علاقے سے تمام باقاعدہ فوجی یونٹ واپس بلا لئے گئے اور سرحد کی حفاظت کوئی نصف درجن سکاؤٹ یونٹوں، فرنٹیر کانسٹیبلز اور چند ہزار غیر تربیت یافتہ خاصہ داروں پر چھوڑ دی گئی جن میں سے بہت سے کشمیر جاچکے تھے۔ علاوہ ازیں پنچتوتان پر افغان دباؤ پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔

اپنی نئی قومی اور مذہبی آزادی کے جوش میں پاکستان نے خارجی ممالک سے اتحاد حاصل کرنے کی کوششیں صرف مشرق وسطیٰ کے دیگر مسلمان ممالک تک ہی محدود کر دیں جن سے حقیقی حمایت ممکن نہ تھی اور نہ ہی واقعی مل رہی تھی۔ ہندو کش کے نیچے وسط ایشیائی سطوح مرتفع پر فوجی غلبہ اور جنوبی ایشیائی اڈے سے بحر ہند اور بحیرہ عرب پر بحری کنٹرول کا کوئی امکان ہی نہ رہا تھا جو عصر دراز تک ایک مسلمہ حقیقت بنا رہا تھا۔ عین اسی وقت قدیم وسط ایشیائی تجارتی راستے جو صدیوں سے عالمی معیشت کے لئے تو اپنی اہمیت کھو چکے تھے لیکن سرحد کے طرز حیات کا ایک جزو لاینفک تھے "آہنی پردہ" کی وجہ سے کاٹے جا چکے تھے۔ ۱۹۵۰ء میں چین بھی اسی پردے کے پیچھے چلا گیا اور انگریزوں سے ورثے میں ملنے

والی کاشغرا و تربت کی سیاسی شنید کی چوکیاں بھی جلد ہی نئے ممالک کے لئے بند ہو گئیں۔

”پنجتوستان“ کی پیچیدگی کے علاوہ سرحدی قبائلی کے ساتھ پاکستان کے تعلقات بھی اتنے ہموار نہ چل سکے جتنا کہ فتح مند اسلامی آزادی کی نئی نئی زرق برق میں متصور تھے۔ پاکستان کو قبائلی نظم و نسق کا برطانوی نظام قریباً جوں کا توں ملا لیکن اسے نظام کو چلانے کے لئے اکثر و بیشتر نو جوان اور نسبتاً نا تجربہ کار پولیٹیکل افسر رکھنے پڑے۔ جن کی قبائلیوں سے مذہبی یگانگت ان کو قابو میں رکھنے کے سلسلہ میں نسبتاً محدود تجربے کا پوری طرح مداوانہ کر سکی۔ متعدد ملوک ”پنجتوستان“ چلے گئے کیونکہ پولیٹیکل افسروں کے ہاتھوں ان کے عزت و وقار کو حقیقی یا متصورہ زک پہنچی تھی۔ حکومت پاکستان نے اسلامی مملکت پر زور دیکر جوند سی جوش و خروش پیدا کیا اس نے قبائلیوں کو جہاد جوئی کے لئے مشتاق اور بے چین کر دیا تاکہ ان کی دبی ہوئی قوتیں اپنا نکاس حاصل کر سکیں۔

پاکستان کی اقتصادی مشکلات جنگ کوریا کے خاتمہ پر بڑھ گئیں اور قبائلی علاقے پر اخراجات میں تخفیف کرنا پڑی، وظائف اور ترقیاتی منصوبے وقتاً فوقتاً کم کئے گئے اور کچھ خاصہ داریوں میں توڑ دی گئیں۔ بڑی فوجی چھاؤنیوں جیسے رزمک کے خالی کرنے کا تجربہ یہ تھا کہ ہمسایہ قبائل کو اقتصادی مشکل پیش آئی جو چھاؤنیوں

پر چاپوں کے درمیانی وقفوں میں انہیں اشیا اور خدمات مہیا کر کے اپنی قلیل آمدنیاں بڑھاتے تھے۔

خود پاکستان کے اندر سیاسی غلبے کی جدوجہد نے جو بنگالی مشرقی پاکستان اور پنجابی غلبہ کے مغربی پاکستان کے درمیان رونما ہوئی پٹھان صوبہ سرحد کو ایک ایسی حیثیت دے دی کہ وہ مشرقی پاکستان سے مل کر ایک خودوش توازن کو درہم برہم کر سکے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے مغربی پاکستان کے تمام صوبوں اور سب ڈویژنوں کو ون یونٹ میں مدغم کیا گیا۔ لیکن مسئلہ حل نہ ہو سکا اور عبدالغفار خان بلکہ انٹر پٹھان ون یونٹ کے خلاف سرگرمیوں کا قراول بنے رہے اور مملکت کا استحکام رتی بھر بھی بہتر نہ ہو سکا۔

پاکستان کی ابتدائی خارجہ پالیسی کا مقصد سرد جنگ سے دامن بچانا تھا لیکن فروری ۱۹۵۱ء میں مسلم لیگ حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے ایک مبینہ کمیونسٹ وابستہ سازش کا پتہ چلا۔ اس میں مسلح افواج کے افسر شامل تھے جو سب کے سب قید کر دیئے گئے بعد میں ایک قطعی کمیونسٹ مخالف داخلہ اور خارجہ پالیسی رونما ہونے لگی۔ غیر جانبدار ہندوستان کے مسلسل خوف نے مشرقی پاکستان میں ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کی مداخلت اور ہندوستانی مقبوضہ کشمیر کی نیشنل کانفرنس کی حکومت میں روز افزوں کمیونسٹ اثر سے مل کر ایک قطعی مغرب نواز میدان پیدا کر دیا۔

سرحد پر روس کی حمایت اور پشت پناہی کی بنا پر افغان
دباؤ اور مسئلہ کشمیر پر ہندوستان کی سوٹ طرف داری نے مغرب
سے استمداد کی خواہش کو دو چند کر دیا۔ ۱۹۵۳ء کے موسم بہار میں
بیکرٹری آف سٹیٹ ڈس نے اپنا ”شمالی ٹائیپا صف بندی“ کا تصور
پیش کیا جس میں اس نے روس کی سرحدوں پر واقع مشرق وسطیٰ کے
ممالک کے ”بہم مربوط“ وقایع کے لئے امریکی حمایت تجویز کی۔ موسم خزاں
میں پاکستان نے جواباً فوجی امداد کی درخواست کی۔ اگلے سال سینیٹ
میں شامل ہو گیا اور ۱۹۵۵ء میں برطانیہ، ترکی، عراق اور ایران
کے ساتھ بغداد پیکٹ (اب سنڈ) کا ممبر بن گیا۔ وسیع پیمانے
پر امریکی تکنیکی، اقتصادی اور فوجی امداد کا ایک پروگرام ظہور میں
آیا اور پاکستان ایشیا کی سب سے زیادہ مغرب پسند اقوام میں
شامل ہو گیا جس کے امریکہ کے ساتھ بالخصوص گہرے تعلقات پیدا
ہو گئے۔

افغانستان میں تغیرات:

انگریزوں کے ہندوستان سے چلے جانے کے پانچ سال بعد
تک افغانستان اپنی الگ تعلق پن اور غیر جانبداری کی روایتی
پالیسی پر چلتا رہا۔ اس کی زیادہ تر دلچسپی ”پنجتوستان“ میں تھی اور
اسی مقصد کے پیش نظر یہ سرحدی قبائل کو پاکستان کے خلاف بڑھ کرانے

کی کوششوں میں لگا رہا اور موقع ملنے پر اقوام متحدہ میں اس کی
تشریف کرنا رہا تھا اور اسی محدود سی حمایت پر قانع رہا جو ہندوستان کے پیش کر رہا تھا۔

اندرونی صورتحال بھی نسبتاً جوں کی توں رہی۔ تیز اور

ہنگامہ خیز اصلاحات نافذ کرنے کی امان اللہ کی کوششوں کے

نتائج کو ذہن میں رکھتے ہوئے حکومت نے جدیدیت کے لئے نہایت

کم اور محتاط اقدامات ہی کئے۔ ۱۹۵۱ء میں ایک مختصر سی ڈھیل

دی گئی جس نے ایک آزاد پریس اور سیاسی پارٹیوں کی تشکیل کی

اجازت دی لیکن جو نہی سیاسی شعور اور بے چینی کے آثار بڑھنے

لگے حکومت نے اسے فوراً واپس لے لیا۔ اختیار و اقتدار شاہی خاندان

کی اجارہ داری رہے جس میں ظاہر شاہ کا کردار شانوی تھا اور

حکومت کی باگ ڈور اس کے چچاؤں ہاشم خان اور شاہ محمود کے

ہاتھوں میں تھی جو وزیراعظم تھے ۱۹۵۳ء میں شاہ محمود کی بجائے

اس کا بھتیجا اور ظاہر شاہ کا غزاؤ، داؤد محمد خان وزیراعظم

بنا، داؤد کے برسر اقتدار آتے ہی جو نتیجہ فوری طور پر منظر عام

پر آیا ”پنجوستان“ ایچی ٹیشن کی شدت تھی۔

پاکستان کی طرح ۱۹۵۳ء افغانستان کے لئے فیصلے کا سال

تھا۔ وزیراعظم داؤد نے جلد ہی اپنے ملک کی تیز رفتاریت جدیدیت میں دلچسپی

اور ایک وسیع پیمانے پر اقتصادی ترقی کے پروگرام کی طرف میلان

کا پتہ دیا۔ اس نے اس خواہش کا بھی اظہار کیا کہ وہ افغانستان

کی طاقت کو مستحکم کرے گا اور اسے ایک زیادہ فعال بین الاقوامی کردار کا اہل بنائے گا۔ جب ۱۹۵۳ء کے اواخر میں ”مشرق وسطیٰ کی دفاعی تنظیم“ یا ایک ”شمالی صف بندی اتحاد“ کا تذکرہ بڑھنے لگا تو افغانستان نے بھی دیکھی کے محتاط اشارے دیئے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ افغانستان اور پاکستان کے درمیان ”پختونستان“ تنازعہ کے ممکنہ حل کے امکانات بھی کابل اور کراچی دونوں جگہ سنے گئے، لیکن اس کے باوجود سرحد پر افغان دباؤ گھٹنے کی بجائے بڑھ گیا۔

اس مرحلے پر سویت یونین افغان ڈرامے میں شیج کے وسط کی طرف حرکت کرنے لگا، جس کی وجہ شاید پاکستان میں بڑھتا ہوا مغربی اثر و رسوخ اور نئے شمالی صف بندی اتحاد کی تیاریوں کی گہما گہمی تھی۔

دوسری جنگ عالمگیر کے خاتمہ کے کئی سال بعد تک افغانستان کے ساتھ سویت تعلقات بہت ہی کم رہے۔ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۶ء کے افغان سویت معاہدے زیر عمل رہے اور جولائی ۱۹۵۰ء میں ایک چار سالہ تجارتی معاہدے کا اضافہ ہوا جس کے نتیجے کے طور پر کابل میں سویت ٹریڈ ایجنسی کو از سر نو زندہ کیا گیا۔ سویت ایئر لائن ابروفلوٹ ملک کے اندر اور باہر واحد ہوائی سروس تھی جو ہفتے میں ایک بار دوشنبہ تا شنبہ تارکابل تا تاشقند آتی جاتی تھی۔ ۱۹۵۲ء میں مزار شریف میں فرانسیسی محلے نے تیل کی تلاش کے

افغان منصوبے پر جو کام شروع کرنا تھا وہ ختم کر دیا گیا کیونکہ روس کو اعتراض تھا کہ اہل مغرب روسی سرحد کے اتنے قریب رہ کر کام کریں۔

وسط ۱۹۵۲ء میں روس نے افغانستان کو متعدد چھوٹے چھوٹے قرضے پیش کئے تاکہ اناج، گودام، بیکری، تیل گودام کے حوض اور پختہ سڑکیں، کابل میں بنائی جاسکیں۔ کچھ تاخیر کے بعد یہ قبول کر لئے گئے اور ۱۹۵۴ء میں روسی دیپچی کے آثار بڑھ گئے رچیکو سلوکی نے ایک ٹیکسٹائل مل اور ایک سیمنٹ پلانٹ کی تعمیر کے لئے مدد کی پیش کش کی۔ ایک سویٹ ثقافتی مشن افغانستان آیا، ۱۹۵۰ء کے تجارتی معاہدہ کی تجدید کی گئی اور اسے مزید وسعت دی گئی اور روس نے بیخون کی روسی طرف سے مزار شریف تک پٹرولیم پائپ لائن بنانے کی بھی پیش کش کی (پائپ لائن بچھائی نہیں گئی) برسیل تذکرہ یہ دیپچی سے خالی نہیں ہے کہ کمیونسٹ اقتصادی جارحیت جس نے مشرق وسطیٰ اور دنیا پر عموماً اتنا زبردست اثر ڈالا، افغانستان میں ان چھوٹی چھوٹی کوششوں سے شروع ہوئی۔

اول ۱۹۵۵ء تک متعدد منصوبے سویٹ کفالت کے تحت زیر تکمیل تھے اور الگ تھلگ افغانستان نے چند سو روسی اور ان کے طفیلی ٹیکنیشنوں کے لئے اپنے دروازے کھول دیئے تھے لیکن ان کی تعداد پھر بھی امریکیوں کی اچھی خاصی محنت کا رطقت کے مقابلے

پر زیادہ تھی۔ جسے افغان حکومت کے لئے وادی ہند کو ترقی دینے والی تعمیراتی کمپنی نے ملازم رکھا ہوا تھا اور کابل میں متعینہ امریکی سیکورٹی امدادی مشن کے پھیلنے ہرے عملے سے بھی بڑھ چکی تھی۔

عین اس وقت جب افغانستان دونوں دنیاؤں کے مزے کھٹ رہا تھا ایک ایک اٹھنے والے مقامی بحران نے کابل کو اپنی خارجہ پالیسی میں ایک بڑے فیصلے پر مجبور کر دیا ۲۷ مارچ ۱۹۵۵ء کو حکومت پاکستان نے مغربی پاکستان میں ون یونٹ قائم کرنے کا آرڈی نانس نافذ کیا۔ ۱۰ فغانوں نے اسے پاکستان کے پٹھانوں کی کسی نہ کسی شکل میں خود مختاری کی آرزوؤں پر ایک چوٹ سمجھا ۲۸ مارچ کو وزیر اعظم داؤد نے کابل ریڈیو پر ایک آتش بار تقریر کی اور اس عمل کی مذمت کی اور اگلے دن کابل میں پاکستانی سفارت خانہ ٹوٹا گیا اور پاکستانی پیرچم کی توہین کی۔ یہ سب کچھ ابومہ کیش نے کیا جو حکومت افغانستان کی مرضی سے ابساکمہ رہا تھا۔

چند دن بعد پشاور میں افغان قونصل خانے پر جوابی حملہ کیا گیا اور پاکستان نے افغان درآمدات و برآمدات پر بھی پابندی لگا دی۔ اوائل مئی میں افغان وزیر اعظم داؤد نے افغان فوج کو تیاری کا حکم دیا۔ یہ لڑائی بالآخر ختم کر دی گئی، پابندی اٹھالی گئی اور افغان فوج واپس بارکوں میں چلی گئی۔ مسئلہ ”پنجتستان“ اور پاکستان افغان تعلقات پر اس سلسلہ واقعات کا اثر ساقی

باب میں زیر بحث آچکا ہے۔

لیکن اس نام نہاد "واقعہ پیچم" کا اہم ترین اثر افغان سویت تعلقات پر ہوا۔

پاکستان نے باقی دنیا کے ساتھ آمد و رفت کا روتی راستہ کاٹا تو افغانستان نے فوراً ہی روس کے ساتھ انتظامات کئے کہ اس کی درآمدات و برآمدات سویت ذرائع سے مہیا ہوں یا حمل و نقل سویت روس کے راستے ہو۔ اس تبدیلی سے شروع شروع میں خاصی مشکلات پیش آئیں لیکن روس نے بھرپور تعاون کیا اور ناکہ بندی اٹھنے تک افغان تجارت کا کافی حصہ سویت یونین کو یا اس کے راستے آ جا رہا تھا۔ اس میں سے کچھ حصہ بعد کے سالوں میں پاکستانی راستے پر واپس آ گیا لیکن ناکہ بندی سے پہلے کے دور سے کہیں زیادہ حصہ سویت راستوں کا عادی ہو گیا۔

فوجی تیاری کے دوران اپنی غیر تربیت یافتہ فوج اور دقیانوسی ساز و سامان کے افسوسناک مظاہرے سے ڈر کر اور پاکستانی فوج کا مقابلہ نہ کر سکنے کی اہلیت سے آگاہ ہو کر جسے امریکی امداد کے ذریعے بہت تیزی سے بہتر و برتر بنایا جا رہا تھا، وزیر اعظم داؤد نے نومبر ۱۹۵۵ء میں لوئے جرگہ بلایا اور اعلان کیا کہ وہ "پنجتوستان" کے لئے حمایت جاری رکھنے کا عزم رکھتا تھا اور وہ اس مقصد کی خاطر اپنے ملک کو مضبوط بنانے کے لئے اسلحہ حاصل

کرنا چاہتا تھا جہاں سے بھی ملے۔ اس نے اس موقع پر یہ بھی اظہار کیا کہ اس مقصد کے لئے مغرب سے ہمدردی اور حمایت حاصل کرنے کی کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔

چند ہفتے بعد بنگان اور خرد شجیف اپنے عظیم ایشیائی دورے کے دوران کابل میں پہنچے جس میں ہندوستان اور برما بھی شامل تھے۔ انہوں نے ۱۰۰ ملین ڈالر کا ایک طویل المیعاد اور معمولی سود پر قرض اقتصادی ترقی کے لئے پیش کیا جسے داؤد حکومت نے فوراً قبول کر لیا ۱۹۵۶ء میں برتانی کا رخانوں، بنڈات آبپاشی، موٹروں کی مرمت کی دکانوں، درہ سالنگ کے راستے ہندو کش کے آریا ریلوے کی تعمیر اور ایک فوجی اور کئی سول ایئر فیلڈوں کی تعمیر کے منصوبہ جاتی معاہدوں پر دستخط کئے گئے اور سال کے وسط تک اندازاً ۱۰۰ سو سو ملین شلین ملک میں برسر کار ہو گئے۔ اپریل ۱۹۵۶ء میں ایک افغان فوجی مشن خرید اسلحہ کے لئے پراگ گیا اور اگست میں ایک بڑا مشن اسی مقصد کے لئے ماسکو روانہ ہوا۔ ستمبر میں اسلحہ کی پہلی کھیپ افغانستان میں پہنچ گئی جو ۲۵ ملین ڈالر کے ایک سودا کا حصہ تھی۔ اگلے ماہ

یہ سوئیٹ ایکسٹریز ان افغانستان "سٹرل الیٹین ریویو، جلد ششم، نمبر ایک

(لندن، ۱۹۵۸ء)

۲ - ٹائمز (لندن) ۲۸ ستمبر ۱۹۵۶ء

جیٹ فوجی ائیر کرافٹ کی کھیپ بھی حوالے کر دی گئی۔ بعد میں بھاری بھرکم ہتھیار مشمولہ یہ ٹینک اور توپخانہ بھی پہنچا دئے گئے اور افغانوں کو ان کے استعمال کی تربیت بھی دی گئی۔

تفافتی اور سیاسی میدانوں میں بھی سویت تعلقات بہت گہرے ہو گئے ہیں ۱۹۵۶ء اور ۱۹۵۷ء میں کابل کے سالانہ جشن کے میلوں میں کمیونسٹ بلاک کے ممالک کی مانڈگی بہت نمایاں تھی۔ جنوری ۱۹۵۷ء میں ریڈیو ماسکونے پشتو نشریات کا آغاز کیا جن میں کابل حکومت کے مہیا کردہ افغان ملازم رکھے گئے۔ داؤد نے ۱۹۵۶ء اور ۱۹۵۷ء میں روس اور کمیونسٹ چین کے دورے کئے اور چواین لائی نے جنوری ۱۹۵۷ء میں کابل کا سفر کیا۔ ظاہر شاہ جولائی ۱۹۵۷ء میں روس کے شاہی دورے پر گیا لیکن ساتھ ہی ساتھ ایسے آثار و شواہد بھی موجود ہیں کہ افغان روسیوں کے متعلق اپنے روایتی شک و شبہ کو خیر باد نہیں کہہ سکتے ایک بات تو یہ ہے کہ حکومت نے شعبہ تعلیم میں نہایت احتیاط سے سویت امداد کو خارج کر دیا ہے اور اس کلیدی میدان میں نہ صرف مغربی امداد کی اجازت دی ہے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی بھی کی ہے۔ عمومی طور پر داؤد حکومت کمیونسٹ بلاک سے جتنی اقتصادی، فوجی اور تکنیکی امداد مل سکتی ہے لینے کے لئے تیار معلوم ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ مغرب کے ساتھ موجودہ تعلقات کو

نہ صرف قائم رکھنے بلکہ انہیں بڑھانے کی ہر ممکنہ کوشش کر رہی ہے۔
اس طرح وادی ہلمند کا منصوبہ بلا شرکت غیرے ایک امریکی کارروائی
ہے، افغان ایئر لائن جسے ۱۹۵۵ء میں شروع کیا گیا تھا، کا
انتظام ساز و سامان اور تربیت بھی ایک امریکی کمپنی کا مرہون منت
ہے اور ۱۹۵۸ء کے موسم بہار میں تندخو اور کم گو پرنس واؤد نے
امریکہ کے دورے میں بے حد مودت و جاذبیت کا مظاہرہ کیا
پاکستان کے ساتھ تعلقات کی بہتری کے سلسلے میں امریکی تعاون کو
خوش آمد کہا گیا ہے اور پختونستان ایچی ٹیشن، ۱۹۵۷ء اور ۱۹۵۸ء
میں کم رہی گو یہ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۱ء میں بھرٹک اٹھی۔ آخر الذکر
سال میں تلخی یہاں تک پہنچ گئی کہ کابل اور راولپنڈی نے واقعی
اپنے سفارتی تعلقات توڑ لئے۔ یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ آیا
بڑی طاقتوں کے درمیان توازن قائم رکھنے اور اپنے ہمسایوں کے
ساتھ تعلقات کے پل صراط پر چلنے کی روایتی اہلیت برقرار رکھنے
کی افغانستان کی کوششیں بالآخر سویت غلبے کو روک سکیں گی یا نہیں؟

ہندوستان کا کردار

جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے تحریک پختونستان کو بھروسے
بھی پہلے انڈین کانگریس پارٹی کی حمایت حاصل رہی۔ یہ حمایت پاکستان
اور ہندوستان کی آزادی کے بعد بھی جاری رہی جب پٹان خود مختاری

کی تحریک قریباً مکمل طور پر افغان ہاتھوں میں چلی گئی۔ ابتدائی سالوں میں جب پاکستان اور ہندوستان دونوں ایک دوسرے کے خوف و دہشت میں بڑی طرح مبتلا رہے ہندوستانی محرک نسبتاً سادہ تھا یعنی میرے دشمن کا دشمن میرا دوست ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہندوستان پاکستان کے قائم رہنے کی صلاحیت کے متعلق کابل کے شکوک میں حصہ دار تھا اور اس امکان سے غیر متعلق نہیں تھا کہ وہ کسی دن افغانستان کے ساتھ مغربی پاکستان کے علاقوں میں شریک ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں افغانستان ہندوستان کی تھوڑی سی برآمدی مصنوعات کے لئے جو زیادہ تر پست معیار کی پارچات پر مشتمل تھیں ایک مفید منڈی تھا۔

جیسے جیسے ایشیائی قیادت کے لئے ہندوستان کی آرزوئیں بڑھنے لگیں ویسے ویسے روایتی طور پر غیر جانبدار افغانستان ایک قدرتی رنگروٹ معلوم ہونے لگا اور ۱۹۴۹ء تا ۱۹۵۴ء کے دور میں کابل میں ہندوستان کی سفارتی سرگرمیاں غیر معمولی طور پر تیز رہیں۔ ۱۹۵۴ء کے بعد پاکستان کو ملتے والی بھاری امریکی اقتصادی اور فوجی امداد نے اس تصویر میں ایک ایسی تبدیلی پیدا کر دی جو نئی دہلی کے لئے انتہائی ناخوشگوار تھی۔ امریکہ کے ساتھ پاکستان کے اتحاد کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان کے مقابلے پر پاکستان کی طاقت ناگزیر طور پر بڑھ گئی لہذا فطری طور پر ہندوستان کو اپنی منصوبہ دار اقتصادی ترقی کو

قرآن کریم کے اپنے دساکے کا بڑا حصہ دفاع کے لئے وقف کرنا پڑا۔
 پاکستان کے قائم رہنے کے امکانات بہت حد تک، بڑھ گئے۔ مسئلہ ”نچوستان“
 کے آخری حل کے امکانات بھی امریکی کوششوں کی بدولت روشن ہو گئے۔
 ہندوستان کی نگاہوں میں خطرناک ترین امر یہ تھا کہ پاکستان کی سیٹھ
 اور بغداد (سینٹ) پیکٹ کی رکینیت ”نرو جنگ“ کو اس کی مدد
 تک لے آئی اور جنوبی ایشیا کی غیر جانبداریت کو زک پہنچی۔

ہندوستانی پرائیگنڈ اس موضوع کو اچھالتا رہا اور جب
 افغانستان حمایت کے لئے روس کی طرف زیادہ مائل ہوا تو نئی دہلی نے
 اس عمل کو امریکہ کی غلط اسلحہ بندی پاکستان کا ناگزیر نتیجہ قرار دیا۔
 گو یہ خود بھی ایشیا میں روسی عزائم کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتا
 تھا اور اپنی شمال مشرقی سرحد پر مسلسل چینی کمیونسٹوں کے زرخ میں
 تھا۔ تاہم نئی دہلی کو کشمیر میں اپنے مقام و موقف کو بچانے کے لئے
 اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں سوٹ حمایت پر تکیہ کرنا پڑا لیکن
 ساتھ ہی ساتھ اپنے ترقیاتی پروگرام کو جاری رکھنے کے لئے مطلوبہ
 بیماری اقتصادی امداد اور بالآخر چینی دباؤ کی مزاحمت کا موقع
 حاصل کرنے کے لئے ہندوستان مغربی امداد سے بے نیاز نہیں ہو سکتا
 تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی پالیسی بعض اوقات ایسے خطوط
 پر چلی جو غیر جانبدارانہ کی بجائے دو دلائل تھے۔ مجموعی طور پر اس
 سے بخوبی یہ ثابت ہو گیا کہ آزاد ہندوستان خود کمیونسٹ ہوئے بغیر

بڑی طاقتوں کے درمیان ”عظیم مقابلہ“ کے آخری مرحلے میں نسبتاً برائے نام ہی اثر ڈال سکتا تھا۔

روس کا کردار۔

ایک معقول قیاس کیا جاسکتا ہے کہ جنوبی ایشیا میں روس کا آخری مقصد اس علاقے کو کمیونسٹ بنانا ہے لیکن مانوی اور زیادہ فوری مقصد مغربی فوجی اتحادات جیسے سیٹو اور بغداد یا سینٹو بیٹ اور مغربی حمایت پر مبنی مقامی فوجی تنظیمات کو ختم کرنا یا ناکارہ بنانا ہے جنہیں ماسکوا اپنی جنوبی سرحدات کے لئے خطرہ گردانتا ہے۔ اولین مقصد واضح طور پر طویل المیعاد ہے اور ایک بڑی جنگ کے بغیر یہ عالمی رائے کی موجودہ آب و ہوا میں خارج از امکان معلوم ہوتا ہے کہ اسے فوجی قبضہ کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی جب بن البرا عظمیٰ میراٹلی اور دیگر ترقیاتی ہتھیار ایشیا کی سرزمین پر کمیونسٹ مخالف فوجی تنظیمات و تنظیمات کی قدر و قیمت کو گھٹا دیں گے۔

روس کو ”عظیم مقابلہ“ کے تازہ ترین مرحلے میں کئی آٹا شے حاصل ہوئے ہیں جو ماضی میں اسے نصیب نہ تھے۔ ان میں سوویت فوجی اور اقتصادی امداد پر روز افزوں افغان انحصار، ہندوستان کی علانیہ غیر جانبداری جیسی، پاکستان کا عدم استحکام جو کم از کم ماضی میں

خوفناک حد تک ظاہر ہوتا رہا ہے اور پاکستان کی بیشتر آبادی کے مغرب
 بیزار دلی جذبات اور ایک طاقتور اور متحرک چین کا تعاون شامل ہیں۔
 پورے علاقے میں اقتصادی فلاح و بہبود کے لئے عوامی امنگیں موجزن
 ہیں اور روس نے ہمایت ہونٹاری سے انہیں مہیا کیا ہے۔ آخر اچھوتوں
 اور کشمیر کے جھگڑوں میں روس کو عرب اسرائیلی آدینہش کی طرح
 دائمی ناسور مل گئے ہیں جو حسب موقعہ ایک مسلح کش مکش میں بدلے
 جاسکتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی روسی مقاصد کے راستے میں خوفناک
 رکاوٹیں بھی حائل ہیں۔ پاکستان بہت گہرے طریقے سے مغرب سے
 مربوط ہے۔ افغانستان روسی عزائم کو شک و شبہ سے دیکھتا ہے اور
 اپنی آزادی کا سختی سے متوالا ہے۔ علاوہ انہی ایک اقتصادی اور
 سیاسی نظام کی حیثیت سے ایشیا میں کیمونزم کی دور دور تک پھیلی
 ہوئی کشش اکھڑا اور خود پسند افغانوں کے لئے برائے نام ہی ہے۔
 افغانستان پر زیادہ دباؤ ایشیا کے اہم تر حصوں میں روس کے بے
 غرضانہ دوستی کے موقف کو تباہ کر دے گا۔ ہندوستان کے لئے
 اقتصادی امداد بھی ایک ایسے جمہوری سیاسی اور سماجی نظام کو تقویت
 دے رہی ہے جو شعوری طور پر کیمونسٹ چین کا مقابلہ کر رہا ہے۔
 ایک لمحے کے لئے انحراف کرتے ہیں تو عین قرین قیاس معلوم ہوتا
 ہے کہ شاید جنوبی ایشیا ہی روس اور کیمونسٹ چین کے درمیان
 مقابلہ و مجادلہ کا وہ میدان ثابت ہو جو یک مشت کیمونسٹ

امریکہ کا کردار

امریکہ ”عظیم مقابلہ“ میں برطانیہ کے بدلے کے طور پر شامل ہوا لیکن واضح مخالف پہلوؤں کے سلسلے میں اولاً ایشیا کے براعظم میں اس کی اپنی بجائے ایسا دگی کوئی نہ تھی اور یہ زیادہ سے زیادہ اپنے واحد مضبوط اتحادی پاکستان کی پالیسی پر اثر ہی ڈال سکتا تھا لیکن اسے اپنی مرضی کے مطابق نہ ڈال سکتا تھا۔ عمومی طور پر روس کی مزاحمت کے لئے ایشیائی دساک کو منظم کرنے کی امریکی کوششوں کی ہندوستان نے مخالفت کی۔ امریکی توجہ اکثر اس علاقے سے ہٹانا پڑی، پہلے یورپ کی بحالی کی وجہ سے، پھر جنگ کوریا اور اس کے مابعد مشرق بعید میں تناؤ کی بناء پر، پھر عرب مشرق قریب میں خلفشار کی وجہ سے اور ابھی حال ہی میں برلن بحران کی بناء پر۔ یہ بات قابل فہم ہے کہ امریکہ افغانستان کو روس کے خلاف اپنی حاکمیت کی مطلوبہ ضمانت دینے کے لئے ناراضا مند بلکہ ناقابل تھا۔ جنوبی ایشیا میں استحکام پیدا کرنے کی غرض سے امریکہ ”پنجوستان“ اور کشمیر کے جھگڑوں میں مضبوط موقف اختیار کرنے یا ہندوستان کے خلاف پاکستان کی حمایت کرنے پر بھی لازماً غیر رضامند تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ دوسری جنگ عالمگیر کے بعد ”عظیم مقابلہ“ کی جنگی صفیں پیچھے دھکیل دی گئیں، اور کسی حد تک تاریکی میں چلی گئیں۔

افغانستان کو اب کوئی بھی صرف برطانوی حلقہ اثر نہیں سمجھتا جیسا کہ
۱۹۱۹ء سے پہلے تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جب سروس اس میں واحد
غالب ترین خارجی اثر بنا ہے افغانستان دو عالمی جنگوں کے درمیانی
وقفہ کے مقابلے پر بہت کم حد تک ملک بے مالک رہ گیا ہے۔
پاکستان کی فوجی تنظیم امریکی فوجی امداد کے بعد کافی حد تک
مضبوط ہو گئی ہے، لیکن اس کی اضافی صلاحیتیں اس کے اپنے مقاصد
اور امریکی مقاصد کے نقطہ نظر سے برائے نام ہی تبدیل ہوئی
ہیں۔ اس طرح جیسا کہ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں ثابت ہوا جب سپہ سالار
جنرل ایوب نے زمام حکومت سنبھالی پاکستانی فوج اندرونی تحفظ قائم
قائم رکھ سکتی ہے۔ (بٹوارے سے کسی وقت بھی کسی نے اس کی اہلیت
پر شک نہیں کیا) یہ اب بھی افغان فوج کو قابو میں رکھ سکتی ہے گو کابل
کو سویت فوجی امداد کے بعد دونوں افواج کی صلاحیتیں اندازاً اب یا
جلد ہی ایسی ہی ہوں گی جیسی کہ وہ ہمیشہ رہی ہیں۔ یہ ہندوستانی فوج
شکست نہیں دے سکتی گو یہ اب بھی ہمیشہ کی طرح ہندوستانی حملے کے
خلاف ایک موثر دفاعی کارروائی کر سکتی ہے۔ ایرانی فوج کے ساتھ
مل کر بھی جو امریکی فوجی امداد کی وصول کنندہ ہے یہ جنوب کی طرف
سویت پیش قدمی کا شاید ہی سامنا کر سکے گی۔

اس صورتحال میں روز بروز واضح ہوتا جا رہا ہے کہ "عظیم مقابلہ"
کے آخری مرحلے کا آخری فیصلہ بنیادی طور پر ان ہی اقوام کی اپنی

خواہش اور اہلیت پر منحصر ہوگا جن کی وہ اپنی آزادی برقرار رکھنے کے لئے حامل ہوں۔ یہ تو شک و شبہ سے بالا ہے کہ وہ تمام اس خواہش کی حامل ہیں۔ ان کی اہلیت کو بھی درخور اعتناء نہ سمجھنا غلط ہوگا۔ افغانستان کی آبادی اور فی الحقیقت اس کے رہنما اتنے ہی روس نواز ہیں جتنے ان کے مد مقابل پاکستانی امریکہ نواز ہیں۔ موجودہ حکومت پاکستان کی ملک پر گرفت افغانستان پر داؤد حکومت کی گرفت سے زیادہ مزدوش نہیں ہے۔ دونوں فریقوں نے اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی غایاں اہلیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ افغان ڈیڑھ صدی کی برطانوی روسی کشاکش کے باوجود زندہ رہے ہیں۔ پاکستانی اپنی آزادی کے حصول اور اس کے تحفظ کی وجہ سے زندہ ہیں جب بین الاقوامی دباؤ کم سے کم رہ جاتے ہیں تو دونوں اپنی مذہبی و نسلی وحدت کی بنا و پر اکٹھے رہنے کے رجحان کا بھی مظاہرہ کرتے ہیں۔

”عظیم مقابلہ“ کے قواعد و ضوابط بھی بدل رہے ہیں کیونکہ جو اقوام اور علاقے پہلے بساط شرنج پر بڑی طاقتوں کے محض مہرے تھے۔ اپنے آزادانہ اختیارات اور مقاصد حاصل کرتے جا رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اسی میں مغرب کا آخری فائدہ مضمر ہے کیونکہ امریکہ اور ۱۹۴۴ء سے برطانیہ ایسا ہوئے پر رضا مند ہیں البتہ روس ناباب اب بھی ان پر کنٹرول کو اپنا آخری مقصد بنائے ہوئے ہے۔

سرحد پر اثرات

ان بین الاقوامی رجحانات و واقعات کا اثر لازماً سرحد پر بھی ہوا ہے۔ قبائلی نئے امریکہ ساختہ جیٹ لڑاکا طیارے دیکھ سکتے ہیں جو پٹا ورکے ایئر فیلڈ سے اڑتے ہیں جسے امریکہ نے بہتر بنایا ہے اپنی پہاڑیوں کی ڈھلانوں کے ساتھ ساتھ چند میل مغرب کی طرف پہل کردہ میدان جلال آباد کے آغاز پر نظر ڈال سکتے ہیں جہاں سویت ٹینیشن آبپاشی کے منصوبوں پر کام کر رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ عبدالغفار خان ۱۹۵۸ء کے موسم بہار میں حکومت پاکستان کی اجازت سے کابل گیا اور وہاں ایک محترم مہمان بنا، لیکن بعد میں اسے پھرون یونٹ کے خلاف ایچی ٹینیشن جاری رکھنے پر پاکستان میں جیل ڈال دیا گیا۔ وہ اپنے عمراد بھائیوں سے ہم کلام ہوئے ہیں جو افغان فوج کی ملازمت سے واپس آئے ہیں اور جنہوں نے نئے سویت آلات استعمال کئے ہیں۔

ساتھ ہی ساتھ سرحدیں زندگی کی روایتی پنج غایاں طور پر برقرار ہے۔ نئی ایشیائی قومیت کی اہم لہریں جو کابل، کراچی اور راولپنڈی میں محسوس کی گئی ہیں سرحدی پہاڑیوں سے بلاتاثر گزر گئی ہیں۔ خوشحال خان خٹک کے قد و قامت کا کوئی عظیم پٹھان لیڈر پیدا نہیں ہوا۔ ڈیونڈ لائن کی دونوں اطراف کے قبائلی اپنی نگاہوں میں ہنوز، آفریدی وزیر اور مہمند ہیں نہ کہ افغان یا پاکستانی، حکومت اب بھی پاکستانی ہے۔

یا افغان پولیٹیکل افسر جو قبیلے کو بر بنائے استحقاق و ظائف ادا کرتا ہے بس پولیٹیکل افسر ہی ہے۔ سرحد کی افغان طرف کا سوٹ سیاح اور پاکستانی طرف کا امریکی سیاح آج بھی ایک معروضی و یکپسٹی اور تجسس کی چیز ہے جسے پختون دل کے تقاضوں کے مطابق سلوک ملتا ہے جو ہاں کا واحد مسلمہ قانون ہے۔

جہاں تک پٹانوں کا تعلق ہے ”عظیم مقابلہ“ ابھی تک ختم نہیں ہوا۔ سویت تربیت یافتہ اور مسلح افغان فوج کی تشکیل نے صدیوں پرانے خطرے کو کم کر دیا ہے جو قبائل حکومت کابل کو پیش کرتے رہے ہیں لیکن اس نے اسے ختم نہیں کیا، ۱۰ اگست ۱۹۷۰ء میں پٹانوں نے ثابت کر دیا کہ وہ اب بھی کابل کے لئے گھمبیر اضطراب کا ایک سرچشمہ ہو سکتے ہیں۔ جو پورے مشرقی افغانستان میں افغان عورتوں کی بے پردگی کی حوصلہ افزائی کرنے کے لئے حکومتی کوششوں کے خلاف شدید رد عمل کا اظہار کیا گیا۔

اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ قبائل بلکہ کسی حد تک پوزی پٹھان جمہیت اب بھی پاکستان اور افغانستان کے درمیان توازن اقتدار قائم رکھے ہوئے ہے۔ سرحد کے زیر انتظام اضلاع پاکستان میں خوب مدغم ہو چکے ہیں۔ قبائلی ایجنسیاں ایسی نہیں ہو سکیں لیکن ان کی وقار داری سالہا سال سے مغرب کی بجائے اپنے مشرق سے ہے۔ افغانستان میں سویت پرورد، ترقیاتی پروگراموں کے باوجود ایجنسیاں اور اضلاع دونوں

جانتے ہیں کہ ان کی اقتصادی فلاح و بہبود پاکستان سے منسلک ہے۔
لیکن یہ اقتصادیات کا ایک سادہ سا مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس سال
سے افغان حکومت پٹھان طرز حیات کو اپنی سرحدات کے اندر زیادہ
سے زیادہ آگے بڑھا رہی ہے اور نافذ کر رہی ہے اور یہ سب کچھ ایرانی
ثقافت کو دبا کر کیا جا رہا ہے، جو پہلے کابل میں بالادست ہوتی تھی۔ یہ
افغانستان کے غیر پٹھان آبادی کے لئے کتنا بھی غیر منصفانہ کیوں نہ ہو
لیکن یہ پاکستان اور افغانستان کے پٹھانوں کے لئے بہت خوش آئند
ہے۔

پاکستان میں رجحان مخالف سمت میں رہا ہے ۱۹۵۵ء سے پٹھانوں
کو قومی زندگی میں بدمذہب سرن کی مسلسل کوشش رہی ہے جس کی جڑیں
مسلمان ہندوستانی روایات میں پیوست ہیں۔ صوبہ سرحد کا خاتمہ
ون یونٹ کا قیام، سخت مرکز پسند ایوبی دور کی آمد اور دارالحکومت
کی کراچی سے سارا لینڈی تبدیلی سب اسی کے مدد و معاون ہیں۔ اس میں
کوئی شک نہیں کہ ایسی چیزیں ایک جدید قومی ملکیت کے لئے ضروری اور
مستحسن ہیں لیکن بہت سے پٹھان اس طرح نہیں سوچتے۔ ون یونٹ
کے خلاف نفرت اگر ۱۹۵۹ء میں زیادہ نہیں تو اتنی ضرور قائم تھی
جتنی ۱۹۵۵ء میں تھی۔

پٹھانوں کو کابل مسلسل یاد دہانی کراتا رہتا ہے کہ وہ ہندو
پاکستان کے دیگر لوگوں سے علیحدہ اور افضل ہیں۔ انہیں بتایا جاتا ہے

کہ اصلی پٹھان وطن پختون ولی کی بناء پر افغانستان میں دوبارہ بنایا جا رہا ہے۔ افغانستان میں غیر پٹھان پٹھانوں سے افضل ہونے کی بجائے افضل ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ پاکستان پٹھانوں کو مسلسل دعوت دے رہا ہے کہ وہ ”پٹھانیت“ کی بجائے مسلمانوں اور پاکستانیوں کی حیثیت سے سوچیں۔ ہمیشہ کی طرح اس مقابلے میں بہم متخالف موڑ بھی ہیں۔ ۱۹۶۰ء کے مذکورہ بالا ہنگاموں میں افغانستان نے چوپٹان روایت پرستی کا عملبردار ہے اپنے آپ کو پردے کی محترم رسم کا مخالف پایا جیکہ جدیدیت پسند پاکستان اس کا دفاع کر رہا تھا۔

اگرچہ سرحد کے سیاسی خاتوں میں تبدیلیاں غیر اغلب معلوم ہوتی ہیں پھر بھی پٹھانوں کی وفاداری کے لئے جدوجہد کا نتیجہ ابھی تک یقینی نہیں ہے۔ لیکن سرحد کے مسئلہ کو دور سے دیکھا جائے تو یقین کرنا پڑتا ہے کہ پٹھان سرحدی سرزمین میں ایک ایسا تغیر آ رہا ہے جو اب تک کے تغیرات سے کہیں زیادہ تیز اور وسیع ہے۔ اس کی طویل اور رومانوی تاریخ سے آگاہی کی بدولت آئندہ ایسے منظر پر تھوڑا سا غمناک ہونا بھی لازم ہے۔ لیکن یہ ناگزیر غمناکی قدر سے کم ہو سکتی ہے بشرطیکہ نیا نظام جیسا کہ قوی امید ہے، پاکستانی افغان تعاون کے یاق و سیاہ میں تشکیل پائے۔ اس طرح پٹھانوں کی حیرت انگیز توانائیاں اور صلاحیتیں تعلیم اور اقتصادی ترقی سے جلا اور وسعت پائیں لیکن آزاد اور برابر رہتے ہوئے دونوں ممالک کو لگن اور قیادت

مہیا کر کیس گی، اور شاید بالآخر ان دونوں کے درمیان ایک رشتہ دائمی
بن جائیں گی۔

کچھ بھی ہو پٹانوں کی تاریخ کو ختم کرتے ہوئے لارڈ کرزن کے
الفاظ کو دہرانا بہتر ہو گا جو اس نے اپنے دور حکومت کے خاتمے کے
قریب ۲۰ جولائی ۱۹۰۴ء کو کہے تھے: ”کوئی آدمی بھی جس نے تاریخ
ہندوستان کا ایک صفحہ بھی پڑھا ہے سرحد کے متعلق کوئی پیش گوئی نہیں
کر سکا۔“

(۱۸) کتابیاتی نوٹ

پڑھانوں کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے اور اکثر و بیشتر ممتاز مصنفین کے قلم سے جو مغل شہنشاہ بابر سے لے کر الیائے نور و وزیر علیٹ تک ہیں۔ لیکن یہ تمام کتب زبان، مکان یا مصنفین کے ذاتی نقطہ نظر کی بدولت محدود ہیں جہاں تک رافضی الحروف تبیین کر سکا ہے محدود ہے۔ کوئی ایسی واحد جامع اور موجودہ دور تک محیط کتاب نہیں ہے جو علاقے کے مطالعہ کار کے لئے ایک عمومی حوالے کا کام دے سکے۔ عجیب بات ہے کہ ایسی مطلوبہ تصنیف کے قریب ترین جو کتاب موجود ہے وہ غالباً اس موضوع پر مغرب میں چھپنے والی پہلی کتاب ہے یہ ہے آئرلینڈ مائونٹ سٹوارٹ ایلفینسٹن کی معرکہ الآرا تصنیف "آرین اکاؤنٹ آف دی کنکٹڈم آف کابل اینڈ اسٹریٹس ڈی پینڈنسیز ان ریشیا ٹارٹاری اینڈ انڈیا" جو ۱۸۵۵ء میں لندن میں شائع ہوئی۔ ایلفینسٹن کا زیادہ تر مواد اس کے مقرر کابل کے دوران اکٹھا کیا گیا جب وہ ۱۸۰۹ء میں پہلا برطانوی سفیر بنایا گیا جیسا کہ اس دور کے ایک تعلیم یافتہ شخص سے توقع کی جاسکتی تھی۔ ایلفینسٹن نے پٹان رواجات قوانین، جغرافیہ، تاریخ اور سیاسی و سماجی تنظیم کے متعلق نہایت آزاد دی اور صحت کے ساتھ لکھا ہے۔ وہ فاتح یا انتظام کار کی بجائے

Account of the Kingdom of
Caul, and its
Dependencies in Persia,
Tartary, and India
By: Mountstuart
Elphinstone
ISBN-10: 1108036716

Click on Yellow space
to Download the
specified Book

ایک محقق کی حیثیت سے آیا تھا لہذا اس کا بیان ہمدردانہ لیکن معروضی ہے اور مرتبہ لہجے سے مکمل طور پر پاک ہے جو بعد کے برطانوی قلم کاروں کے ہاں اکثر و بیشتر پایا جاتا ہے۔

ایلفنٹن کی تصنیف کے ساتھ انداز و رویہ میں ملتا جلتا چارلس مسن

کا چار جلدوں میں "ٹریپو آف ویریس جزیران بلوچستان، افغانستان

اینڈ دی پنجاب" ہے۔ جو ۱۸۴۲ء میں شائع ہوا۔ مبین کا مواد انیسویں

صدی کے تیسرے اور چوتھے عشروں میں اس علاقے میں طویل سیرو سیاحت کے دوران جمع ہوا۔ مبین ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج کا ایک بھگوار تھا جس نے جدوجہد کر کے تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ ایک مقامی باشندے کے بھیس میں سفر کرتا رہا۔ اس کی تصنیف ایلفنٹن کا مکمل ہے جو طبقہ شرنا کا ایک انتہائی شائستہ رکن تھا اور اٹھارہویں صدی کے سیفر کی شان و شوکت کے ساتھ ادھر ادھر پھرتا تھا۔ یہ دونوں تصنیفات انیسویں صدی کے ربع اول میں سرحد میں زندگی کے قریب تمام شعبوں کی ایک نہایت گراں بہا تصویر پیش کرتی ہیں جب یہ علاقہ قریباً مکمل طور پر مغرب کی لمس سے نا آشنا تھا۔

لیکن یہ دونوں کتابیں ایک سو سال سے بھی زیادہ پرانی ہیں

اور سرحد جیسے علاقے میں بھی بہت سی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔

ایلفنٹن اور مبین کی تصنیفات کی بیشتر معلومات آج بھی مفید بلکہ بعض اوقات بے نظیر ہیں لیکن موجودہ دور میں انہیں مشکل

Narrative of Various Journeys in Balochistan, Afghanistan, & the Punjab, 1826 to 1838, Kalat: During a Residence in Those Countries to Which Is Added ... at Kalat, and a Memoir on Eastern Balochistan
By: Charles Masson
ISBN-10: 8121510333

ہی حوالہ و استناد کا معیار سمجھا جاسکتا ہے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں کے ربع اول میں انگریز مصنفین نے سرحد کے مختلف پہلوؤں پر کتب کا ایک انبار لگا دیا۔ ان میں یادداشتیں، سوانح عمریاں، پسندیدہ موضوعات پر قلمکاروں کے رسائل، کسی پالیسی یا افسر وغیرہ پر تنقیدیں و تقریظات، ملکی پھلکی کتابیں اور درجنوں دیگر مخصوص موضوعات شامل ہیں۔ ان میں

سے بہترین "ایڈمیٹی بیٹی سیفورد کی" "دی سٹری آف لارڈ سٹرنز لڈین

"ایڈمنسٹریشن" (لندن، ۱۸۹۹ء) "سر رابرٹ داربرٹن کی "ایٹین" ریز

ان دی خیبر، (لندن، ۱۹۰۰ء) اور "سرتھامس ہولڈیچ کی" "دی انڈین

بارڈر لینڈ" اور "دی ٹیس آف انڈیا" (لندن، ۱۹۰۱ء) میں

جو نہ صرف قیمتی حقائق مہیا کرتی ہیں بلکہ اس دور کے مسائل میں بھی مفید بصیرت پیدا کرتی ہیں۔ اگر انہیں اس دور میں لکھی گئی بے شمار سرکاری رپورٹوں کے ساتھ پڑھا جائے تو یہ اس زمانے کے واقعات کی کافی حد تک مکمل تصویر سازی کو ممکن بنا دیتی ہیں۔

لیکن قریباً یہ تمام انتہائی طور پر ذاتی ہیں اور پٹھانوں پر اپنے تبصرہ میں "وہ" اور "ہم" کا نظریہ رکھتی ہیں جس سے علاقے کی مربوط تصویر سامنے نہیں آتی اور موجودہ قاری کو سرحد جیسا کہ تھا، کی بجائے زیادہ علم اس کا حاصل ہوتا ہے کہ انگریز سرحد میں کیسے رہتے تھے اور وہ اسے کس طرح دیکھتے تھے۔

The History Of Lord Lytton's Indian Administration, 1876 To 1880
By: Lady Betty Balfour
ISBN-10: 1173035974

Eighteen Years in the Khyber 1879-1898
By: Sir Robert Warburton
ISBN-10: 9693519132

The Indian Borderland, 1880-1900
By: Thomas Hungerford Holdich
ISBN-10: 0548302057

The gates of India, being an historical narrative
By: Thomas Hungerford Holdich
ISBN-10: 1171751494

The problem of the North-west frontier, 1890-1908, with a survey of policy since 1849
By: Cuthbert Collin Davies
ISBN-10: 0064916138

Afghanistan : a Study of Political Development in Central Asia
By: Sir William Kerr Fraser-Tytler
ASIN: B0026Q2446

India's north-west frontier
By: Sir William Barton
ASIN: B0006AOLV8

بعد کے برطانوی حکمرانوں کی تعینات میں بھی یہی خامیاں

ملتی گو کافی حد تک کم۔ ان میں سے بہترین کولن ڈیویس کی "دی

پرائیم آف دی نارٹھ ویسٹ فرنٹیئر" (۱۸۹۰ء تا ۱۹۰۸ء) ڈیکمبر

(۱۹۳۲ء) "سروہیم بارٹن کی" "انڈیا نارٹھ ویسٹ فرنٹیئر" (لندن

۱۹۳۹ء) اور ڈیویس کے "فریئر ریٹلر کی" "افغانستان: اے سٹڈی

آف پولیٹیکل ڈیولپمنٹس ان سنٹرل ایشیا" (آکسفورڈ! ۱۹۵۳ء) ہیں۔

ڈیویس کی کتاب اصل میں کیمبرج یونیورسٹی میں ایک مقالہ

دکوری تھا اور صرف ایک محدود دور پر محیط ہے لیکن قبائل کے

متعلق مفید ترین اعداد و شمار پر مشتمل ہیں جو اب بھی اہمیت رکھتے

ہیں بارٹن کی کتاب مصنف کے ذاتی تجربات پر محیط ہے لیکن برطانوی

حکومت کے بعد کے ایام پر نہایت مفید حقائق اور تیسرہ پیش کرتی

ہے۔ فریئر ریٹلر بنیادی طور پر افغانستان کا ارتقاء بخشیت ایک

مملکت سے متعلق ہے لیکن وہ اپنے لیے نظر ذاتی تجربے کی روشنی میں

قبائل کے مسائل کو نہایت مفید طور پر پیش منظر میں لاتا ہے جو

کابل کے نقطہ نظر کا منظر ہے۔

جو نہی یہ کتاب مکمل ہوئی "سراولف کیرو کی کتاب "دی

پٹھانز" ۵۵۰ ق م تا ۱۹۵۷ء" (لندن! ۱۹۵۸ء) بھی منظر عام

پر آئی۔ سراولف کی کتاب اب تک بہترین ہے۔ سرحد میں بیس

سالہ تجربہ اور وسیع تحقیق پر مبنی یہ کتاب جدید حوالہ جاتی کتب

The Pathans: 550 B.C.- A.D. 1957
By: Olaf Caroe
ISBN-10: 0195772210

کے مذکورہ بالا فقدان کا بہت مدت تک مداوا کرتی ہے لیکن اس کی بھی اپنی تحدیدات ہیں۔ یہ قریباًًً سراسر تاریخی نوعیت کی ہے اور اس کے صرف آخری سو کے قریب صفحات ہی برطانوی دور سے متعلق ہیں۔ پاکستان کے تحت واقعات و ترقیات قریب قریب نظر انداز کر دیئے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں انیسویں اور بیسویں صدیوں کے ضخیم برطانوی سرکاری دستاویزات سے نسبتاًًً برائے نام ہی استفادہ کیا گیا ہے جو لندن کی انڈیا آفس لائبریری اور پبلک ریکارڈ آفس میں دستیاب ہیں۔ آخراًًً گوسرا و لف کیر و سرولیم یارٹن کی طرح غیر معمولی حد تک بیٹھان کردار و احساسات کا ہمدرد ہے تاہم وہ ایک انگریز ہے اور ایک قدیم سرحدی انتظام کار لہذا اس کے ہاں بھی اکثر سابقہ تصنیفات کی مانند ”ہم“ اور ”وہ“ کا رویہ موجود ہے۔

ہلکے پھلکے ادب کے میدان میں ابھی حال ہی کے دواچھے سفر نامے ہیں۔ آئین سیٹفنز کا ”ہارڈمون“ (لندن ۱۹۵۲ء) اور پیٹر مائن کا ”دی نیرو سائیل“ (لندن ! ۱۹۵۵ء) جن میں سے موخر الذکر امریکہ میں بھی ”جرنی ٹودی پنٹھانز“ (گارڈن سٹی، نیویارک ۱۹۵۵ء) کے نام سے چھپا۔ دونوں سیٹفنز اور مائن انگریز ہیں جو برطانوی ہند میں پنٹھانوں کو جانتے تھے اور ان کے مداح تھے اور بٹوار سے کے بعد انہوں نے ان علاقوں کے جذباتی

Journey to the Pathans
By: Peter Mayne
ASIN: B0007DT59C

The Narrow Smile
By: Peter Mayne
ASIN: B0028A5P1M

واپسی سفر کئے۔ ان کی کتابیں آج کے سرحد کے رنگ و آہنگ کی تصویر پیش کرتی ہیں لیکن پس منظر یا تعبیر و تفسیر کے لحاظ سے بے معنی ہیں۔

مذکورہ بالا تمام قلم کاروں میں ایک چیز جو مشترک ہے وہ یہ ہے کہ وہ سب کے سب انگریز تھے لہذا انہیں سرحد کے ساتھ ایک مخصوص دیکھ بھال تھی اور ان کا زاویہ نظر خواہ کتنا بھی عالمانہ یا ہمدردانہ کیوں نہ ہو لیکن یہ لازماً ایک صدی سے زیادہ پر پھیلی ہوئی تاریخ اور رسالت سے مشروط تھا۔ غیر انگریزوں کی تصنیفات بہت کم ہوئیں اور سوائے چند مستحضرانہ کتابوں کے غیر اہم بھی تھیں سکندڑ سے نیویکے فریڈرک بارٹھ اور امریکی ہربرٹ وری لینڈ نے بہت اچھے بشریاتی مطالعات پیش کئے ہیں لیکن ان کے مکمل نتائج ابھی شرمندہ اشاعت نہیں ہو سکے جسٹس ولیم اوڈگلکس نے اپنی ”بی اوڈ دی بائی ہمالیاز“ ”دکارڈن سٹی“

نیویارک، ۱۹۵۲ء میں اپنے سفر سرحد کو کافی جگہ دی ہے۔ میرا اپنا سفر نامہ بھی ہے ”دی میس آف دی پٹھانز“ (زندہ رابرٹ ہیل، ۱۹۶۲ء)۔ انگلینڈ اور امریکہ کی بڑی بڑی لائبریریوں کے کئی لاگ اندراجات سے ظاہر ہوتا ہے کہ افغان پرسیوں کا قلم کار بہت کام کر رہے ہیں۔ بد قسمتی سے مصنف روسی زبان سے نا بلند ہے لہذا اس کی تحقیق نہیں کر سکا۔

Beyond the High
Himalayas
By: William O. Douglas
ISBN-10: 1446544664

The Way of the Pathans
By: James W. Spain
ISBN-10: 0196360994

This Book is Scan & PDF By:



Kitaboona.BlogSpot.Com

Visit Us For Books

بلوچ اور پشتون تاریخ پر کتابیں

انور رومان (تراجم) بلوچستان گزیٹیر . بلوچ تاریخ . پٹھان رسم و رواج اور تاریخ
افغانستان تاریخ کے آئینے میں . بلوچ . پاوندے . قدیم بلوچستان . تاریخ سیستان
سفر نامہ بلوچستان اور سندھ، پٹھان اور بلوچ، افغانستان دارا سے امان اللہ تک، فارورڈ پالیسی
میر گل خان نصیر . کوچ و بلوچ . تاریخ بلوچستان . تاریخ خوانین قلات . رزمیہ شاعری
بلوچستان قدیم و جدید تاریخ کی روشنی میں، بلوچستان کے سرحدی چھاپہ مار، عشقیہ شاعری،
کامل القادری . مہمات بلوچستان، براہوی رسم و رواج، بلوچ قبائل.

برگیدٹر عثمان
بلوچستان رپورٹاژ

طاہر بزنجو
بابائے بلوچستان

لالہ ہتورام
تاریخ بلوچستان

منیر مری
مری بلوچ سیاسی کشمکش

مسعود بخاری
بلوچستان کی سیاسی تحریکیں

Afghanistan from Darius to Amanullah. Pashtoon.
Gazetteers of Balochistan(2vol). The Notes on Baluch
National Struggle. Jirga Laws. Tigers of Balochistan.
Unexplored Balochistan. The Frontiers of Balochistan.
Notes on Afghanistan and Balochistan. Ahmed Shah Durrani.
Afghanistan.

چند اہم کتابیں

بہشتی زیور، تحفہ خواتین، فلسفہ افلاطون، ساحر سارے سخن، کلیات اقبال، احمد شاہ درانی
بلونت سنگھ کے افسانے، فلسفہ جبران، کلیات ذیل کار نیگی، تین جنگجو سپہ سالار، تین مصنف
عظیم افسانہ نگاروں کے لافانی افسانے، تین عظیم فاتح، تین ڈکٹیٹر.